اردو شعر و ادب کے سفیر

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

اُردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

❖

اپنے گھر میں بھی اجنبی ہوں میں
جرم یہ ہے کہ روشنی ہوں میں

(سیّد شبیہ الحسن)

❖

اُردو شعر و ادب کے سفیر

(تحقیق و تنقید)

○

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

○

اظہار سنز

۱۹۔ اُردو بازار، لاہور (پاکستان)

حقوق اشاعت محفوظ

ستمبر ۲۰۱۰ء

اردو شعر و ادب کے سفیر

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ناشر
سیّد محمد علی انجم رضوی
طابع
سیّد اظہار الحسن رضوی
مطبع
اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور
مرورق
کوہ نور پرنٹنگ پریس، ۱۳۰۔ اردو بازار، لاہور
کمپوزنگ
تصور کمپوزنگ سنٹر سید پلازہ، فیروز پور روڈ لاہور
قیمت ۵۰۰ روپے
ملنے کا پتہ
اظہار سنز ۱۹۔ اُردو بازار، لاہور (پاکستان) فون: ۰۹۲۔۰۴۲۔۳۷۲۳۰۱۵۰

انتساب

اُردو شعروادب کے دو معتبر سفیر

جناب عاشور کاظمی اور ڈاکٹر تقی عابدی صاحب

کے نام

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی دیگر کتب

- مفاہیم (تحقیق و تنقیدی مقالات)
- ترجیحات (تحقیق و تنقیدی مقالات) (انعام یافتہ)
- اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (تحقیق و تنقیدی مقالات)
- تصریحات (تحقیق و تنقیدی مقالات) (انعام یافتہ)
- ترغیبات (تحقیق و تنقیدی مقالات)
- جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق و تنقید)
- مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (تحقیق و تنقید)
- سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (تحقیق و تنقید)
- طاہرین (سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، مناقب اور سلام۔ تجزیہ و تدوین) (انعام یافتہ)
- العطش (سید وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ و تدوین)
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق و تنقید)
- باقیاتِ آلِ رضا (سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
- آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت و فن)
- کلیاتِ حبیب (حبیب جونپوری کے کلام کی تدوین)
- شام و سحر کی باتیں (ماہنامہ "شام و سحر" لاہور کے اداریے)
- قیصرِ اقلیمِ مرثیہ (تحقیق و تنقید)
- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت و فن)
- سیف زلفی کے مرثیے (تجزیہ و تدوین)
- قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کی تدوین)
- حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تحقیق و تنقید) (انعام یافتہ)
- ادبی بیٹھک (ادبی کالم)
- ادبی چوپال (ادبی کالم)
- مضافاتی شعر و ادب (تحقیق و تنقید)
- اُردو شعر و ادب کی معمار خواتین (تحقیق و تنقید)

منذرجات

❖ **اقرار** — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن — ۱۱

❖ **اظہار**

- ع۔س۔ مسلم کے تنقیدی سفر کے ثمرات — ۱۵
- ایک مانوس اجنبی ۔ اشفاق حسین — ۳۱
- نسیم سید کی مکمل گواہی — ۳۹
- صحرائے قطر کا آہو۔ محمد ممتاز راشد — ۴۹
- عرفانہ عزیز کی شعری کائنات — ۶۴
- سید وصی الحسن نقاش کی شاعری — ۸۸
- تسنیم عابدی کی شاعری میں حزنیہ عناصر — ۱۱۶
- اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری۔ چند معروضات — ۱۳۴
- نذیر۔ اے۔ قمر کے ماہیوں کا مجموعہ 'چاند اکیلا ہے' — ۱۴۶
- عرفی ہاشمی کے جدید مختصر مرثیے — ۱۵۱
- 'شامِ شہرِ وصال' کا شاعر۔ احمد شہزاد — ۱۷۹
- صادق جذبوں کی شاعرہ۔ سائرہ بتول — ۱۸۵

❖ افکار

اردو شعر و ادب کے سفیروں کے بارے میں پاکستانی دانشوروں کی آرا ۱۹۴

◆◆

ڈاکٹر محمد علی صدیقی	ڈاکٹر انور سدید	ڈاکٹر سلیم اختر
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	سید وحید الحسن ہاشمی	ڈاکٹر تبسم کاشمیری
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	مرتضیٰ برلاس	ڈاکٹر طاہر تونسوی
ڈاکٹر لیاقت علی نیازی	پروفیسر احمد عقیل روبی	ناصر زیدی
ڈاکٹر اجمل نیازی	ڈاکٹر علی شیر طور	پروفیسر رب نواز مائل
ڈاکٹر عقیلہ	خالد اقبال یاسر	پروفیسر حسن عسکری کاظمی
خورشید بیگ میلسوی	ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی	ڈاکٹر نفیس اقبال
عذرا اصغر	ڈاکٹر علی محمد خان	ڈاکٹر اختر میرٹھی
پروفیسر آغا حیدر	ڈاکٹر کنول فیروز	اعزاز احمد آذر
پروفیسر غلام حسین ساجد	کرامت بخاری	افتخار مجاز
ڈاکٹر شفیق انجم	پروفیسر حسین سحر	آغا گل
ناصر ملک	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال	ڈاکٹر مختار ظفر
عارف شفیق	ڈاکٹر عذرا شوذب	ڈاکٹر محسن مگھیانہ
ڈاکٹر طارق عزیز	ڈاکٹر افتخار بیگ	ڈاکٹر عبدالکریم خالد
پروفیسر طارق زیدی	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	ڈاکٹر ریاض قدیر
ڈاکٹر نواز زیدی	ڈاکٹر ضیاء الحسن	ڈاکٹر جواز جعفری

ڈاکٹر شبیر احمد قادری	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	ڈاکٹر محمد ہارون قادر
پروفیسر جمیل احمد عدیل	ڈاکٹر مزمل حسین	ڈاکٹر شفیق عجمی
ڈاکٹر یار محمد گوندل	پروفیسر شہباز نقوی	حسین مجروح
ڈاکٹر غلام یٰسین	محمد ضیاءاللہ قریشی	ڈاکٹر خالد ندیم
پروفیسر صدف چنگیزی	صوفیہ بیدار	ڈاکٹر اختر ہاشمی
شاکر کنڈان	ڈاکٹر صغریٰ صدف	اشرف شریف
پروفیسر اشتیاق احمد	محمد اعجاز خاور	سلمان سعید
عمر گل عسکر	ڈاکٹر عباس رضا	ڈاکٹر یونس حسنی
ڈاکٹر عطاءالرحمٰن	شاعر علی شاعر	آفتاب احمد ملک
علی بابا تاج	جمشید اقبال	پروفیسر فرقان احمد قریشی
شبہ طراز	پروفیسر طاہر مسعود	پروفیسر آغا مزمل
ارشد خالد	پروفیسر باقر علی	شہزاد احمد خان
پروفیسر نصرت بخاری	پروفیسر شازیہ نصیب سومرو	پروفیسر محمد شہزاد رانا
سید تحسین گیلانی	پروفیسر پریا تابیتا	پروفیسر شفیق الرحمٰن الہ آبادی
جاوید صدیق بھٹی	پروفیسر سید محمد علی رضا	پروفیسر وحید عزیز
پروفیسر نزہت عباسی	محمد اقبال شاہ	پروفیسر قدرت اللہ شہزاد
نعیم فاطمہ علوی	پروفیسر عظمت رباب	سفیان شاکر
انجینئر مجید غنی	ارشد محمود ارشد	پروفیسر انیقہ سلیم
پروفیسر عظمیٰ حسن	جنید امجد	ندیم عباس بخاری
ڈاکٹر کومل عروج	اعجاز دانش	ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد
پروفیسر آنسہ سلیم		

◆◆

حیدر قریشی	(جرمنی)	ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم	(دبئی)
تسلیم الٰہی زلفی	(کینیڈا)	محمد صابر	(سری لنکا)
ناصر نظامی	(ہالینڈ)	پروین شیر	(کینیڈا)
ذکریا ورک	(جرمنی)	عرفانہ عزیز	(کینیڈا)
وصی الحسن نقاش ہاشمی	(امریکہ)	ساجد گل	(آئرلینڈ)
ڈاکٹر ابوالحسن نقوی	(آئرلینڈ)	ڈاکٹر عامر عباس	(ایران)
سیّد عرفی ہاشمی	(آسٹریلیا)	آصف نشاط	(امریکہ)

◆◆◆

.... اقرار ....

ادب و شعر کی تخلیق ایک معجزاتی عمل ہے۔ جب کوئی تخلیق کار اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کوئی شہ پارہ خلق کرتا ہے تو اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کی تخلیق دنیائے ادب پر کیا اثرات مرتب کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا سائنسی ایجادات کی بدولت گلوبل ویلیج سے گلوبل ہٹ میں تبدیل ہو گئی ہے اور ذہنی اور فکری فاصلے اب یکسر معدوم ہو گئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ادب و شعر سے تعلق رکھنے والے احباب کو علم ہو چکا ہے کہ ان کا ہر لفظ دنیا میں بسنے والے کسی بھی فرد پر اپنے منفی و مثبت اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ اس طرزِ احساس نے جہاں تخلیق کار کی ذمہ داری میں اضافہ کر دیا ہے وہاں اس کے باذوق قارئین میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہر تخلیق کار اپنے وطن کے شعر و ادب کا سفیر کہلا سکتا ہے۔

''اردو شعر و ادب کے سفیر'' بنیادی طور پر ان احباب کرم کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے تسوید کی گئی ہے جو پاکستان سے دور رہ کر بھی پاکستان کی محبت میں اسیر ہیں۔ وہ اپنے وطن کی سیاست، معیشت، معاشرت، مذہب اور تہذیب و ثقافت سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی پیش کش کے لیے شعر و ادب کو وسیلہ بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان احباب گرامی کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو زبان سے اپنے تعلق خاطر کو جوڑا ہوا ہے اور وہ اپنی نوزائیدہ نسل کو یہ زبان منتقل کرنے کی شعوری کاوش کر رہے ہیں۔ اپنی کلاسیکی ادبی و شعری روایت سے انسلاک اور اُردو زبان کے تحفظ و فروغ کے لیے حتی المقدور کوشش کرنا یہ دو ایسے گراں قدر اضافے ہیں جن کی بدولت یہ تمام تخلیق کار حقیقی معنوں میں ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' کہلانے کے مستحق ہیں۔

"اردو شعروادب کے سفیر" محض ایک کتاب ہی نہیں بلکہ یہ خوابیدہ ذہنوں پر دستک اور جاگنے والوں کے لیے تحریک ہے۔ اس میں ایک جانب تو بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کی صناعانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہنر ہے اور دوسری جانب انہیں صراطِ مستقیم کی جانب گامزن کرنا بھی مقصود ہے۔ میں نے حتی الوسع کاوش کی ہے کہ اردو زبان اور شعروادب سے تعلق رکھنے والے زیادہ سے زیادہ احباب سے رابطہ کروں اور اس سلسلے میں مَیں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔ میں ان تمام ملکی اور بین الاقوامی دانشوروں کا صمیم قلب سے شکرگزار ہوں جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے میرے لیے وقت نکالا، اپنی گراں قدر آرا عطا کیں اور مفید مشوروں سے نوازا۔

میرے والد سید وحید الحسن ہاشمی صاحب نے کبر سنی کے باوجود مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا، جناب ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر فرقان قریشی صاحب، پروفیسر انیقہ سلیم صاحبہ، پروفیسر آنسہ سلیم صاحبہ اور جناب تصور حسین نے ہر گام پر میری مدد کی۔ جناب اظہار الحسن رضوی اور ان کے صاحبزادوں نے اس کتاب کی اشاعت میں گہری دلچسپی لے کر اسے صوری طور پر خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔ میرے تمام اہلِ خانہ اور عزیز شاگردوں نے اس کتاب کی ترتیب و تسوید میں میرے ساتھ بے پناہ تعاون کیا ہے، میں تمام احباب کا صمیم قلب سے شکرگزار ہوں اور **اقرار** کرتا ہوں کہ اگر میرے احباب میرے ساتھ تعاون نہ کرتے تو یہ دقیق کام کبھی بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔

میں یہ کتاب بیرون پاکستان مقیم دو معتبر احباب جناب عاشور کاظمی اور ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی نذر کر رہا ہوں جو واقعتاً اردو شعروادب کے سفیر کہلانے کے حقدار ہیں۔

ع گر قبول افتد زہے عزّوشرف

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

گیارہ ستمبر ۲۰۱۰ء

Email: drshabihulhasan@gmail.com

رابطہ

۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ

اچھرہ، لاہور۔ پاکستان

موبائل ۰۳۳۳۔۴۲۵۵۱۵۳

اظہار

اردو شعروادب کے سفیروں کے بارے میں

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے مقالات

اظہار

- ع۔س۔ مسلم کے تنقیدی سفر کے ثمرات (دبئی)
- ایک مانوس اجنبی -اشفاق حسین (کینیڈا)
- تسیم سید کی مکمل گواہی (کینیڈا)
- صحرائے قطر کا آہو—محمد ممتاز راشد (قطر)
- عرفانہ عزیز کی شعری کائنات (کینیڈا)
- سید وصی الحسن نقاش کی شاعری (امریکہ)
- تسنیم عابدی کی شاعری میں حزنیہ عناصر (دبئی)
- اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری۔ چند معروضات (جرمنی)
- نذیر۔اے۔قمر کے ماہیوں کا مجموعہ 'چاند اکیلا ہے' (فرانس)
- عرفی ہاشمی کے جدید مختصر مرثیے (آسٹریلیا)
- 'شامِ شہرِ وصال' کا شاعر۔احمد شہزاد (قطر)
- صادق جذبوں کی شاعرہ۔ سائرہ بتول (انگلستان)

◆◆◆

◆◆◆

ع۔س۔ مسلم کے تنقیدی سفر کے ثمرات

◆◆

عصرِ حاضر کی خراب اخلاقی صورتِ حال نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج کل ہر معمولی تخلیق کار خود کو ''علامہ'' اور اپنی ''بے مثال تحریر'' کو ''حرفِ آخر'' سمجھنے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگر کوئی غیر جانبدار نقاد ایسے تخلیق کار کی کسی کوتاہی پر گرفت کرے تو وہ خود ساختہ علامہ اخلاقیات کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مرنے مارنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اس ملال انگیز صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟؟ وہ نقاد جو ستائش باہمی کے نظریے کے تحت ہر اُلٹے سیدھے لکھنے والے کو زمانے کا مجدّد ثابت کر دیتا ہے' یا وہ قاری جس کا ذہنی اُفق انتہائی پست ہو چکا ہے یا وہ معاشرہ جو غیر اہم چیزوں کو معتبر ثابت کرنے پر تُلا بیٹھا ہے۔ بہرحال اس ناگفتہ بہ صورت حال کا نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ دیوانہ اپنی بڑ کو اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی وساطت سے پھیلانے میں ایک حد تک کامیاب ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اچھے نقاد بھی بری تخلیق کو بُرا کہنے سے اجتناب کرنے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب میں یہی وقت زوال کا ہوگا۔ اگر ہم اپنے معاشرے میں ادبی اقدار کا زوال نہیں چاہتے تو ہمیں مثبت تنقید سننے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا اور **ع۔س۔ مسلم**

جیسے ناقدین کی پذیرائی کرنا ہوگی جو زہر ہلاہل کو قند کہنے سے کل بھی گریزاں تھے اور آج بھی ہیں۔

شعروادب کی ترقی کے لیے ایک علمی، تہذیبی اور تخلیقی فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فضا اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب تخلیق کار ادب کے ساتھ ایک ''کومٹ منٹ'' کے ذریعہ رشتہ استوار کرے اور لکھنے پڑھنے کو زندگی کا اہم تقاضا سمجھے۔ اگر ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے ادبا ادب کو مال تجارت سمجھنے لگیں اور اپنی تحریروں کے لیے وہی طریقہ استعمال کریں جو مال کی فروخت کے لیے اشتہارات کرتے ہیں تو یہ فضا علمی، ادبی اور تخلیقی نہیں بلکہ ''بازاری'' بن جائے گی۔ ادب میں دھڑے بندی، خودنمائی اور سطحی سیاست کے کوئی معانی نہیں ہوتے۔ اشتہار، دھڑے بندی، سیاست یا دولت کسی بھی معمولی تحریر کو اعلیٰ اور ارفع سطح تک نہیں پہنچا سکتی۔ اہم بات محض اتنی ہے کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں اس کے حوالے سے آپ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں یا نہیں......؟ کسی تقاضے سے عہدہ برا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنا کام پورا کردیا ہے۔ اگر آپ کے کام میں قوت اور تاثیر ہے تو وہ باقی رہے گا ورنہ گھاس پوس کی طرح ہوا میں اڑ جائے گا......ع۔س۔ مسلم اس اعتبار سے ایک منفرد نقاد ہیں کہ انہوں نے پوری زندگی شعروادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ آپ ان کی ''**لمحہ بہ لمحہ زندگی**'' کا مطالعہ فرمالیجیے آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے شعروادب کو نہ تو جلب منفعت کا ذریعہ بنایا اور نہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات کے مطابق اپنے نظریات تبدیل کیے۔ آپ کو ان کے افکار و نظریات سے صدفی صد اختلاف ہوسکتا ہے لیکن آپ ان کی ''کمٹ منٹ'' پر اُنگلی نہیں اُٹھا سکتے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی ایک ایسے باوقار اور مہذب ماحول میں بسر ہوئی

ہے جہاں لفظوں کی توقیر اور حرمت کے معنی ہوا کرتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ آج ان کی کذب و ریا سے بھرپور تحریر کل ان کے لیے شرمندگی کا باعث بنے گی۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اعمال کی جزا و سزا تو روزِ آخرت میں ہوگی لیکن لفظوں کا حساب کتاب اسی دنیا میں ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے عصرِ حاضر کی کم وقعت ''شہرت'' سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ اب وہ تو خاموش ہیں لیکن پورا معاشرہ اُن کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد انہیں ''جہت ساز تخلیقی شخصیت'' قرار دے رہا ہے۔

عبدالستار مسلم ایک بالغ نظر نقاد ہیں۔ ان کے کئی تنقیدی مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اپنے مضامین و مقالات میں ع۔ س۔ مسلم نے ہمیشہ اپنے عہد کے مسائل کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو تخلیق کار اپنے عہد کے مسائل سے آنکھیں چراتا ہے وہ جلد یا بدیر زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا تو شاید انتہا پسندی ہو کہ عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کا دستور ہو گیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مسائل کی پیش کش سے پہلوتہی کرتے ہیں مگر اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نئے ادبی رجحانات قارئین کا وسیع حلقہ پیدا نہیں کر سکے۔ اس طرزِ عمل کا منفی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ سنجیدہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اور مخرب اخلاق رسائل خوب پھل پھول رہے ہیں لہٰذا زمانہ حال کے تمام تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ ع۔ س۔ مسلم کی طرح اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے مسائل کا بغور تجزیہ کریں اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے نیک نیتی سے تخلیقی سطح پر مشورے دیں۔ اگر تخلیق کاروں نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور نہ کیا تو وہ وقت دور نہیں جب ہمارے پیشِ نظر محض مسائل ہی مسائل ہوں گے اور ان مسائل کا حل ہم اپنے ہاتھ سے کھو چکے ہوں گے۔

ع۔ س۔ مسلم ایک ہمہ جہت تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے نثر و شعر دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بڑے سلیقے سے اظہار کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ع۔ س۔ مسلم کا سوانحی خاکہ مختصراً پیش کر دیا جائے تا کہ قارئین ان کی جملہ صلاحیتوں سے کماحقہٗ آگاہ ہو سکیں۔

❖ ذاتی کوائف

- اصل نام: عبدالستار
- قلمی نام: ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم
- کنیت: ابوالامتیاز
- ولادت: ۸۔ اپریل ۱۹۲۲ء مطابق ہفتہ ۲۷ رجب
- مقام ولادت: تحصیل نکودر ضلع جالندھر
- والد: چودھری نبی بخش
- والدہ: رحمت بی بی
- زوجہ: ناظرہ مسلم
- اولاد

ا) بیٹے

ممتاز مسلم (کاروبار مقیم دوبئی)

نیاز مسلم (ذہنی طور پر پسماندہ)

ب) بیٹیاں

فرحت شوکت (زوجہ شوکت یوسف)

راحت زاہد (زوجہ زاہد حسین خان)

❖ تعلیم

- ابتدائی تعلیم

تحصیل نکودر کے دیہاتی اسکول

- ثانوی تعلیم

ڈی بی ہائی سکول نکودر ۱۹۴۲ء

- بی۔اے

کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۰ء

❖ ملازمت

- یومیہ مزدوری سے آغاز ۱۹۴۲ء
- رائل ایئر فورس
- آر۔اے۔ایف سویلینز ایسوسی ایشن
- ذاتی کاروبار کی طرف رغبت

❖ اعزازات

- فروغ نعت کے لئے منفرد خدمات: پاکستان نعت اکیڈمی' کراچی' سلور جوبلی ایوارڈ ۱۹۹۲ء
- شیلڈ بہترین نعت گو شاعر ۱۹۹۴ء' ادبی پرواز' اسلام آباد
- خصوصی ایوارڈ برائے بیرون ملک ادبی خدمات ۱۹۹۴ء' ایشین آرٹس سوسائٹی' برطانیہ
- لٹریری کلچر اینڈ سوشل کنٹری بیوشنز دی انٹیلیکٹ ایوارڈ' اسلام آباد
- انٹرنیشنل والنٹیئرز ڈے ایوارڈ ۲۰۰۱ء' کراچی (سائنوسا)

- لوحِ اعزاز' ۴۲ سالہ خدمات برائے ذہنی پسماندگان' ۲۰۰۲ء' بلخی فاؤنڈیشن' کراچی
- ''نشانِ سپاس'' منجانب حلقۂ آہنگِ نو' ۲۰۰۲ء
- ''نشانِ اعتراف'' منجانب اُردو سندھی فاؤنڈیشن' ۲۰۰۲ء
- In the name of Allah (بسم اللہ) اعزاز' منجانب وقارِ ادب' کراچی' ۲۰۰۳ء

❖ سیاحت

- مشرقی وجنوبی ایشیا

  بنگلا دیش' تھائی لینڈ' سری لنکا اور ہندوستان

- مشرقِ وسطیٰ

  اُردن' ایران' بحرین' سعودی عرب' شام' عراق' قطر' کویت' لبنان' متحدہ عرب امارات اور مصر وغیرہ

- دیارِ مغرب

  آسٹریا' اٹلی' برطانیہ' بلجیئم' ترکی' جرمنی' ڈنمارک' روس' سویڈن' سوئٹزرلینڈ' فرانس' فن لینڈ' لکسمبرگ' ناروے' ہالینڈ اور یونان وغیرہ

❖ مصروفیات

- قومی کارکن (تعلیم وتربیت بالغان' تحریکِ پاکستان' تبلیغ' تقاریر' مباحث) نکودر' ضلع جالندھر' ڈرگ کالونی کراچی ۱۹۴۲۔۱۹۴۸ء
- اعزازی جنرل سیکرٹری' ایئرفورس سویلینز ایسوسی ایشن' ڈرگ روڈ

کراچی' ۱۹۴۳ء۔۱۹۴۸ء

- رکن' تحریک پاکستان و بانی پاکستان مسلم لیگ ڈرگ کالونی' کراچی۔ ۱۹۴۳ء۔۱۹۴۷ء
- بانی' ادارہ تعلیم و ترقی (برائے تعلیم بالغاں) ڈرگ کالونی' کراچی ۱۹۴۶ء۔۱۹۴۷ء
- رکن' مجلس عاملہ تھیوسوفیکل سوسائٹی آف پاکستان' کراچی ۱۹۴۸ء
- سیکرٹری جنرل' سوسائٹی برائے فلاح عائلاتِ مساکین' Poor Families' Welfare Society کراچی ۱۹۴۹ء
- صدر' آر۔ڈی۔یوتھ لاج' کراچی ۱۹۴۹ء
- رکن مجلس عاملہ حلقۂ اربابِ ذوق' کراچی ۱۹۵۰ء۔۱۹۵۱ء
- بانی' سیکرٹری پاکستان ناروے انجمنِ دوستی ۱۹۵۲ء
- بانی مدیر' ماہنامہ ''نیاراہی'' کراچی' ۱۹۵۶ء۔۱۹۶۲ء
- مالک و مہتمم' مکتبہ نیاراہی' کراچی ۱۹۵۷ء۔۱۹۶۲ء
- رکن' پاکستان انسٹیٹیوٹ برائے امورِ خارجہ' کراچی ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۶۲ء
- رکن' انجمن ادبی جرائد' پاکستان ۱۹۵۷ء
- رکن' کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز (سی پی این ای)' کراچی' ۱۹۵۹ء
- بنیادی رکن' انجمن مصنفین پاکستان' ۱۹۵۹ء
- بانی صدر' سوسائٹی برائے ذہنی پسماندگان' کراچی' ۱۹۶۰ء۔ ۲۰۰۲ء
- بانی' سرپرست' سائنو سا مرکز تربیت برائے ذہنی پسماندگان'

کراچی، ۱۹۶۲ء تا ۲۰۰۲ء

- بانی مدیر جریدہ "سانئوسا" ترجمان ذہنی پسماندگان، ۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۲ء
- مندوب پاکستان، تیرہویں ایشیائی کانفرنس برائے ذہنی پسماندگان، ڈھاکا، نومبر ۱۹۹۷ء
- بانی، سرپرست، رحمت وقف، کراچی، ۱۹۸۵ء تا حال
- بانی، سرپرست، رحمت (رفاہی) ہسپتال و میٹرنٹی ہوم، کراچی ۱۹۹۷ء تا حال

❖ تصنیفات

- حمد و نعت

حمد و نعت	۱۹۸۴ء
اللہ و رسولؐ	۱۹۹۳ء
کعبہ و طیبہ	۱۹۹۳ء
زمزمۂ سلام	۱۹۹۳ء
زمزمۂ درود	۱۹۹۳ء

- پنجابی نعت

واگاں میں دل موڑ	۲۰۰۰ء

(شامل نصاب پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج)

- شعر و ادب

ایک ٹہنی کے پھول	افسانے	۱۹۵۷ء

اردو مرثیہ کے پانچ سو سال

(معاون عبدالرؤف عروج) ۱۹۶۱ء

اوس اور کرنیں (غزلیں، نظمیں، گیت) ۱۹۶۲ء

برگِ تر (نظمیں، گیت، دوہے) ۱۹۹۵ء

نیشِ گل (غزلیں) ۱۹۹۷ء

سرودِ نعت (مقالات) ۲۰۰۰ء

- سفرنامے

کاروانِ حرم (منظوم) ۱۹۸۷ء

کشورِ کسریٰ تا سوناردیس ۲۰۰۰ء

سفر اندر سفر ۲۰۰۳ء

سفرنامۂ مجوبیہ ۲۰۰۴ء

- تحقیق، تنقید، مضامین، مباحث

اہانتِ رسولؐ اور آزادیٔ اظہار ۲۰۰۰ء

صریرِ خیال ۲۰۰۱ء

دریچۂ نگاہ ۲۰۰۲ء

خدنگِ تحریر ۲۰۰۲ء

نبضِ ضمیر ۲۰۰۳ء

خالد الحق۔ احباب کی نظر میں ۲۰۰۴ء

- سماجیات

پاکستان میں ذہنی پسماندگی (انگریزی) ۱۹۹۳ء

پاکستان میں ذہنی پسماندگی (اُردو) ۲۰۰۰ء

- آپ بیتی

لمحہ بہ لمحہ زندگی (خودنوشت) ۲۰۰۵ء

❖ پذیرائی

(شخصیت وفن کے حوالے سے)

- شاعرِ لوحِ شیشۂ دل (ع۔س۔مسلم)

ڈاکٹر طاہر تونسوی ۱۹۹۹ء

- کوزہ گرِ جہانِ فن (ع۔س۔مسلم)

پروفیسر آفاق صدیقی' رؤف نیازی ۲۰۰۳ء

- جہت ساز تخلیقی شخصیت۔ع۔س۔مسلم

ڈاکٹر طاہر تونسوی ۲۰۰۳ء

- حُسنِ گفتگو (ع س مسلم کے انٹرویوز)

ڈاکٹر ستار نیازی ۲۰۰۳ء

- ''ابوالامتیاز ع س مسلم۔شخصیت وفن''

شازیہ نورین خان ۱۹۹۸ء

(مقالہ برائے ایم۔اے) اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

❖ رابطہ

- رہائش

"مسلم ولا" ۳۳۔ بنگلور ٹاؤن۔ شارع فیصل، کراچی۔

فون : ۴۵۲۰۴۱۸۔ ۴۵۲۸۴۹۲۔ ۰۲۱

email:asmuslim@hotmail.com

- دفتر

۸۔ بنگلور ٹاؤن، شارع فیصل، کراچی۔ ۷۵۳۵۰

فون: ۴۵۲۹۲۰۱۔۰۴۔ فیکس: ۴۵۴۶۸۷۰۔۰۲۱

- حال مقیم دبئی

درج بالا پیش کردہ کوائف کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ع۔س۔ مسلم نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت کرتے گزاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک متنوع الجہات تخلیق کار ہیں اور ان کا یہ علمی، ادبی اور فلاحی سفر آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

"میرا تنقیدی سفر" ع۔س۔ مسلم کا نیا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں نظری اور عملی دونوں طرح کے مقالات موجود ہیں۔ نظری مقالات کی درج ذیل فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ ع۔س۔ مسلم کے نظری مضامین متنوع بھی ہیں اور منفرد بھی۔ ملاحظہ فرمایئے:

۱) ادب، سیاست اور احتساب

۲) پاسداری عہد وفا

۳) پنجابی ادب میں زبان کا مسئلہ

اسی طرح ان کے درج ذیل عملی مضامین کی فہرست کا مطالعہ بھی فرما لیجئے جو کسی تقریب میں پڑھے گئے یا دیباچوں کی شکل میں مختلف شعراء اور ادبا کی تخلیقات کی زینت بنے۔

۱) ڈاکٹر سلیم اختر' جہت ساز قلم کار

(ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب پر فاضلانہ تبصرہ)

۲) ہاتھ بیچنے والے

(نجم الحسن رضوی کے افسانوی مجموعہ کا تجزیہ)

۳) قاضی فراز کا فکری سفر

(قاضی فراز کے شعری مجموعہ زخمہ کا محاکمہ)

۴) تری یادوں کی خوشبوئیں

(نظام الدین کی شاعری پر تبصرہ)

۵) قمر نقوی کے ساتھ ایک شام

(قمر نقوی کی شاعری کا جائزہ)

۶) کھوج اور پرکھ کا سفر

(ڈاکٹر قاسم جلال کے مضامین کا جائزہ)

۷) درس وفا

(ریاض پرواز کی نعتیہ شاعری کا جائزہ)

۸) ایک قافلۂ سعادت کی ہم سفری

(تنویر پھول کی شاعری)

۹) چاند چہرے

(کبیر خان کے شعری مجموعہ پر تبصرہ)

۱۰) گل نوشگفتہ پر ایک طائرانہ نظر

(ادریس ناز کے شعری مجموعہ کا جائزہ)

درج بالا نظری و عملی تنقید کے حامل مضامین کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ع۔س۔ مسلم ایک تخلیقی ذہن کے حامل نقاد ہیں اور انہوں نے اپنے افکار و نظریات کو کسی خاص سانچے میں بند نہیں ہونے دیا۔ ان کے مضامین کا یہ پھیلاؤ انہیں ایک ایسا سمندر بنا دیتا ہے جو بے کنار ہے۔ اس سمندر میں طغیانی کم اور گیرائی زیادہ ہے۔ ع س مسلم کا یہی تنقیدی تنوع انہیں دوسرے ناقدین سے منفرد اور ممتاز بنانے کا سبب ہے۔

ع۔ س۔ مسلم ناقدین کے اس گروہ میں شامل ہیں جو غور و فکر کے بعد اپنے نظریات وضع کرتے ہیں۔ آپ اس کتاب میں سے ان کے درج ذیل تین اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے ایک ناقد کی حیثیت سے علمی، ادبی اور تہذیبی صورتِ حال سے کس طرح استفادہ کیا ہے:

"——

> زندگی کی آئینہ داری میں ایک انسان دوست ادیب کسی کلام، تحریر یا فن پارے کے بارے میں ایک سنگی مجسمے کی طرح مثالی طور پر غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ وہ خود بھی ایک معاشرے اور ایک ملت کا فرد، اپنے تاریخی شعور کا حامل اور اپنے تہذیبی و تمدنی ورثے کا امین ہے۔ وہ اپنی فکری اور روحانی میراث سے منقطع نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ذہن میں اپنی قومی، ملی اور جمہوری اُمنگوں اور ان کی ترقی و تکمیل کا خاکہ بلکہ منشور بھی رکھتا ہے اور یہ اس کی طویل تاریخ، فکر و نظر اور علم و دانش کا سرمایہ ہے

——"

"ـــــ

اشجار کی پیوند کاری سے لے کر مختلف اور بعض اوقات متضاد اور متناقض عقائد و خیالات' روایات و رسوم اور تہذیبوں اور تمدنوں کے تصادم و اختلاط تک یہی عمل کارفرما ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اسی کا عکس ہے۔ شکست و ریخت نئی تعمیر کا سبب ثابت ہوتی ہے۔ ہر شے' ہر خیال اور ہر عمل اسی کٹھالی کی آتش میں پک کر کندن ہوتا ہے۔

ـــــ"

"ـــــ

ایک اچھا فن کار اپنے فن پارے میں تاثر اور دلکشی کو جلا دینے کے لیے اس پر بار بار نظرثانی کرتا ہے' اس کے رنگوں کا جائزہ لیتا ہے' الفاظ کی تراکیب اور مصرعوں یا فقروں کی تراش خراش کرتا ہے۔ کسی اُستاد سے اصلاح یا ماہر سے رائے کی درخواست بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ اصلاح و تنقید کا یہ عمل بعد میں ایک نقاد کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔

ـــــ"

(اقتباسات "میرا تنقیدی سفر")

ان اقتباسات کے مطالعہ کے بعد آپ کو احساس ہو گیا ہوگا کہ ع۔س۔ مسلم ایک باشعور نقاد ہیں اور وہ مواد اور اسلوب دونوں اعتبارات سے چیزوں کو منفرد انداز سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

''میرا تنقیدی سفر'' کے مطالعہ کے بعد واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ ع س مسلم کے تنقیدی نظریات درج ذیل دو ستونوں پر استوار ہیں:

ا) مابعد الطبعیاتی دینی و فکری عناصر

ب) عصرِ حاضر کے آلام و مسائل کا تجزیہ و محاکمہ

ع۔ س۔ مسلم ایک ایسے نقاد ہیں جو روشن خیال ہونے کے باوجود مابعد الطبعیاتی دینی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے مضامین میں دین کے بنیادی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث سے استفادے کی کئی صورتیں نکلتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مضامین میں دینی حسیت کے مختلف مظاہر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے مضامین میں وطن سے محبت کے بھی کئی جلوے نظر افروز ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر تو وہ وطن کی محبت کے حضور ''سب کچھ'' قربان کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا یہ والہانہ پن بھی دینی اور اسلامی روایات سے ان کی محبت کا ثمر ہے۔ ع س مسلم کے مضامین میں حالاتِ حاضرہ کے مسائل پر بحث بھی ملتی ہے اور بے لاگ تبصرے بھی۔ وہ حق سچ کے عادی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی باتوں میں نہ تصنع ہے اور نہ بناوٹ۔ وہ دردمند دل کے ساتھ معاشرے کے درد و غم کو محسوس کرتے ہیں اور ان مسائل سے نکلنے کے لیے اپنی صلاحیت اور استطاعت کے مطابق حل بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پاک باطن اور نیک سیرت انسان کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس کی بات دلوں پر دستک دیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ع س مسلم کے مضامین ایک جانب تو ہمارے خوابیدہ ذہنوں کو جھنجھوڑتے ہیں اور ہماری گمشدہ مابعد الطبعیاتی روایت کا رشتہ ہمارے قلب و اذہان سے جوڑتے ہیں اور دوسری جانب وہ ہمارے زنگ آلود دل پر دستک دے کر یہ پیغام دے رہے ہیں کہ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے لہٰذا اس ادبی محشرستان میں وہی تنقیدی فکر زندہ رہے گی جس کی بنیاد سچ

پر رکھی جائے گی۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اگر ہم ادبی اقدار کا زوال نہیں چاہتے تو ہمیں مثبت رویوں کو فروغ دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ع س مسلم کی کتاب ''میرا تنقیدی سفر'' محض ایک تنقیدی کتاب ہی نہیں بلکہ یہ کبھی ختم نہ ہونے والا وہ تنقیدی سفر ہے جو نسل در نسل جاری رہے گا اور آنے والی نسلیں بھی اس سے استفادہ کرتی رہیں گی۔

◆◆◆

◆◆◆

ایک مانوس اجنبی — اشفاق حسین

◆◆

اُردو میں ایسے شعراء کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو وطن سے دُور رہ کر بھی وطن کی محبت سے سرشار ہیں اور اُن کی تخلیقات سے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے۔ ان کی شعری تخلیقات کی فنی حیثیت کچھ بھی ہو لیکن یہ بات طے ہے کہ وطن سے دُور رہ کر بھی وطن کو یاد کرنا ایک تخلیقی رویہ ضرور ہے۔

اشفاق حسین شعروادب کے میدان میں ایک طویل عرصے سے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ان کی نثری و شعری کتب معتبر صاحبان دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ خاص طور پر فیض احمد فیضؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھی گئی کتب اشفاق حسین کی ہنرمندیوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیض احمد فیضؔ کے مطالعہ کا فیض ہے کہ اشفاق حسین نثر و شعر میں اپنا معتبر مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اشفاق حسین ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعر و شاعری سے ان کا رابطہ بہت پرانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''اعتبار'' کی شاعری نے انہیں ادبی حلقوں میں محض متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ بااعتبار بھی بنایا۔ انگریزی نظموں کی تخلیق اور

تراجم سے والہانہ رغبت نے ان کے ذہنی اُفق کو وسیع کیا۔ اشفاق حسین نے اپنی بکھری ہوئی صلاحیتوں کو مجتمع کر کے ''ہم اجنبی ہیں'' تخلیق کی۔ اسی بنا پر یہ تخلیق ایک پختہ کار شاعر کی ہنر مندیوں کا بھرپور مظہر بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

''ہم اجنبی ہیں'' وطن سے دُور ایک وطن دوست شاعر کا اہلِ وطن کے لئے خوشبودار ارمغان ہے۔ یہ کتاب اپنے نام کے حوالے سے تو ایک انفرادی شان رکھتی ہی ہے' مگر اس کے ذیلی عنوانات مثلاً: ''ہجرت کا ثمر'' نثار میں تیری گلیوں پہ'' ''مجھے کہنا ہے کچھ'' ''بازیچۂ اطفال'' ''آ جاؤ افریقا'' ''موضوعِ سخن'' اور ''ظرف تنگنائے غزل'' بھی اسے انفرادیت عطا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اشفاق حسین نے اس شعری مجموعہ ''ہم اجنبی ہیں'' کے تخلیقی اظہار کا سبب کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ''صرف میں اجنبی نہیں ہوں۔ اپنے اپنے دائروں میں ہم سب اجنبی ہیں۔ میرے اندر اجنبیت کا یہ احساس چیزوں کو اپنے آپ سے ریلیٹ (Relate) نہ کرنے کی صورت میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اجنبیت کے اس احساس کو کم کرنے کی خاطر ہی ''ہم اجنبی ہیں'' کا تخلیقی اظہار ممکن ہوسکا ہے۔'' (دیباچہ ''ہم اجنبی ہیں'' ص:۱۵)

''ہم اجنبی ہیں'' کا بغور مطالعہ کئی سوالات ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اُبھرنے والے یہ سوالات وقتی بھی ہوتے ہیں اور ان سوالات کے پس منظر میں کئی جوابات بھی مضمر ہوتے ہیں' مثلاً:

''کیا ہم صرف پردیس میں اجنبی ہوتے ہیں؟''

''کیا ہم اپنے دیس میں بھی اجنبی ہوسکتے ہیں؟''

''اجنبیت داخلی تجربہ ہے یا معروضی رویہ؟''

''کہیں اس کائنات میں انسان اجنبی بنا کر تو نہیں بھیجا گیا؟''

''انسان کب سے اجنبی ہے اور کب تک اجنبی رہے گا؟''

یہ اور اسی قبیل کے دیگر سوالات ہر ذی شعور اور صاحب ادراک انسان کے ذہن میں گردش کرتے ہیں۔ لوگ محض سوچنے پر اکتفا کر لیتے ہیں' لیکن اشفاق حسین ان اُبھرنے والے سوالات کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور انہیں حتی المقدور سمجھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اشفاق حسین نے اجنبیت کے اس دُکھ کو نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اس کرب سے گزرے ہیں اور اسی بنا پر ان کی شاعری میں ہجرت ایک استعارہ بن کر اُبھری ہے اور دردمند قارئین ان کی شاعری میں اس کا ذائقہ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اشفاق حسین نے ذاتی کرب کو آفاقی کرب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری ذاتی حدود سے نکل کر آفاقی قدروں کی حامل ہو گئی ہے۔ وہ کینیڈا میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتے ہیں اور ان کے شعری رویوں کی بدولت ہم اس کائنات میں خود کو اجنبی سمجھنے لگتے ہیں۔

اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ہجرت کا ثمر بھی تو مقدر نہیں اپنا
بے گھر ہوئے ایسے کہ کوئی گھر نہیں اپنا
بیٹھے ہیں سرِ کوئے غریب الوطنی ہم
دیوار نہیں اپنی' کوئی در نہیں اپنا
اِک غول پرندوں کا ہے اور شام کا منظر
ایسے میں خیال آیا کوئی گھر نہیں اپنا

اشفاق حسین چیزوں کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہیں ہجرت کا دُکھ اور تنہائی کا کرب زندگی کا ساتھی محسوس ہوتا ہے۔ انہیں خبر ہے کہ اس بھری کائنات میں انسان تنہا ہے اور اسے زندگی بھر تنہائی کی فصل کاٹنا ہے۔ موسم

آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن ہجرت کا موسم آ کر نہیں جاتا۔ یہ اپنے اثرات مرتب کرتا ہے اور انسان کوشش کے باوجود اس کے دائرہ اثر سے باہر نہیں نکل پاتا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کئی موسم گئے پر ہجرتوں کا دکھ ابھی تک ہے
یہ سناٹا مرے اندر کا میری زندگی تک ہے
نہ جانے کون سی وحشت بسی ہے آ کے شہروں میں
کہ سب چاروں طرف ہیں پھر بھی تنہائی کبھی تک ہے

حقیقت یہ ہے کہ انسان تنہائی کے عالم میں محض ہوش وحواس ہی نہیں کھو بیٹھتا بلکہ اپنی شناخت بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ اپنے تن کے گم شدہ چہرے کے حصول کے لئے وہ اپنے دیس سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ اسے وقتی طور پر اپنے بدن کی شناخت کے لئے چہرہ تو مل جاتا ہے لیکن ازلی اور ابدی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اس کیفیت کو اشفاق حسین نے اپنی نظم ''رابطے'' میں علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے' ملاحظہ فرمایئے۔

اجنبی دیس میں
اپنی پہچان کی لاش اٹھائے
مسافر جو آئے
انہیں دیکھ کر
لوگ بے ساختہ مسکرائے
ایسی نامہرباں ساعتوں میں ہمیں
سندھ کی وہ فضائیں بہت یاد آئیں
بہت یاد آئیں
وہ گلرنگ صبحیں

وہ مخمور شامیں

کہ جب

موج مہرباں کی دلرباؤں سے

اپنے بھی تھے رابطے

اشفاق حسین کی شاعری میں وطن سے بے پناہ اُلفت کا اظہار ملتا ہے۔ وہ وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار کرتے ہیں۔ انہیں وطن کے مظاہرِ فطرت سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ وہ اپنے دیس کی صبح' بیل' بل' سورج' چاند' ستارے' دیپ' آنگن' دریا' ہوائیں' غرضیکہ ہر چیز سے والہانہ محبت بلکہ عقیدت رکھتے ہیں اور انہیں مختلف صورتوں میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے دیس کی گلیوں کے ذرّوں پر نثار ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ وطن کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ وطن کے دلگیر حالات و واقعات انہیں پردیس میں بھی بے کل کر دیتے ہیں۔ وہ تو اپنا چراغِ دل جلا کر وطن کے اندھیروں کو دُور کرنے کے خواہش مند ہیں' ملاحظہ فرمایئے۔

یہ پیام لے کے آئیں مرے دیس کی ہوائیں
جنہیں تیرگی کا غم ہے وہ چراغِ دل جلائیں

مجھے درمیانِ مقتل' یہی فکر ہے مسلسل
کہ شبِ ستمگراں سے کہیں لوگ ڈر نہ جائیں

جو نظر کو آئینہ دے' جو دلوں کو حوصلہ دے
کوئی ایسا شعر لکھیں' کوئی ایسا گیت گائیں

اسی طرح اشفاق حسینؔ نے انتہائی دل گداز انداز میں اپنی ایک نظم ''شہرِ آباد کا نوحہ''

میں علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے دیس کی کرب ناکی کو پیش کیا ہے' ملاحظہ فرمایئے ؂

شہر آباد ہے تیرے دم سے
ورنہ اس شہر کے سارے در و بام
تجھ سے پہلے نہ تھے واقف
کہ یہاں کے رستے
کسی جنت کی طرف جاتے ہیں
راستے تجھ سے ملے جنتِ گم گشتہ کے
تُو ہے اس جنت گم گشتہ کا پہلا راہی
اور اب تیرا مزار
عبرتِ اہلِ تماشا ہے مگر کس کے لئے
قافلے آج بھی جمہور کے آتے ہیں یہاں
جن کے منہ میں ہے فقط
سوکھی ہوئی ایک زباں
اور یہ زباں
جراٗتِ انکار سے واقف ہی نہیں
یہ زباں بھی ہے کوئی شہر
کہ جس کے باسی
آج تک جنت گم گشتہ کی تحقیق میں ہے
اور یہ جنت گم گشتہ ہے خود ان کے قدم کے نیچے

لیکن اس راز کو
اس بات کو
سمجھائے گا کون؟
اُس کے سوا
شہر آباد ہے جس کے دم سے

اشفاق حسین وطن سے دور رہ کر بھی تخیلاتی سطح پر وطن ہی میں موجود رہتے ہیں۔ انہیں اپنے وطن کا ماحول' طرزِ بود و باش' رسم و رواج' کلچر' رویے اور طرزِ احساس سے بے پناہ رغبت ہے۔ جب وہ عملی اور جسمانی طور پر وطن نہیں پہنچ پاتے تو وہ تخیلاتی سطح پر پردیس میں اپنا دیس سجا لیتے ہیں۔ یہ رویہ کسی حد تک رومانوی کہلا سکتا ہے لیکن حقیقت پسند جانتے ہیں کہ اندوہِ غریب الوطنی انسان کے لیے کاہشِ جاں ہے اور اس صورتِ حال میں انسان کو جہاں پناہ ملے وہ سکون حاصل کر لیتا ہے۔ اشفاق حسین نے اپنے کلام میں ہر صورت اور ہر سطح پر اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور بات ذہن نشیں رہے کہ اشفاق حسین محض زبانی کلامی وطن کی یاد میں محو نہیں رہتے بلکہ وہ وطن کی سرفرازی کے لیے بیرونِ ملک عملی جدوجہد بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن سے محبت کے جذبات قابلِ رشک بھی ہیں اور باعثِ تقلید بھی۔

اشفاق حسین کی شاعری میں وطن سے دُوری کا نوحہ بھی ہے اور اجنبیت کا ماتم بھی' لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں مایوسی کی فضا موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اجنبیت کو دل و جان سے قبول کر لیا ہو' اور اب وہ ایک مانوس اجنبی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گئے ہوں' مگر میرے نزدیک اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اشفاق حسین رجائی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ وہ خراب ترین حالات

میں بھی اُمید کا چراغ بجھنے نہیں دیتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جہاں بھی قدم رکھتے ہیں، اسی مقام کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ اہلِ دنیا کو وہ یہی سبق دیتے ہیں کہ ؎

اب کوئی ہجر کا نغمہ نہ زباں تک آئے
ہے یہ سب اپنی زمیں، پاؤں جہاں تک آئے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف پیش کیا تھا کہ وطن سے دُور رہ کر وطن کو یاد رکھنا اور یاد کرنا ایک تخلیقی روّیہ ہے۔ اب آخر میں، میں اشفاق حسین کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف ہنر کے طور پر یہ بات اپنے قارئین کو ہدیہ کر کے اجازت چاہتا ہوں کہ اشفاق حسین کی شاعری میں وطن سے والہانہ محبت نے انہیں ہمارے لئے ''مانوس اجنبی'' بنا دیا ہے۔

◆◆◆

maablib.org

◆◆◆

نسیم سیّد کی مکمل گواہی

◆◆

اُردو میں ایسی شاعرات کی بہتات ہے جنہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد سطحی جذبات پر رکھی ہے۔ عام طور پر ان جذبات کے اظہار کے لئے عامیانہ خیالات کا سہارا بھی لیا جاتا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو کے معتبر اور سنجیدہ ناقدین نے اُردو شاعرات کی فنی حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس صورتِ حال کے برعکس بعض ناقدین نے گل رو شاعرات کے دیدہ زیب شعری مجموعوں پر جو آرا پیش کی ہیں، وہی ان کی حیثیت اور مقام کو مجروح کرنے کا سبب بنی ہیں۔ اُردو شاعرات میں نسیم سیّد ایک مختلف شاعرہ کے رُوپ میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان کی شعری تخلیق ''آدھی گواہی'' پر نہ تو کسی معروف دانشور کا تبصرہ ہے اور نہ مقبول عام نقاد کی مخصوص رائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نسیم سیّد کا بیساکھیوں کے بغیر شعری اُفق پر طلوع ہونا ہی انہیں با اعتبار بنا دیتا ہے۔

نسیم سیّد ایک پختہ مزاج شاعرہ ہیں۔ انہوں نے زندگی کے تلخ و شیریں تجربوں کو شاعرانہ رُوپ دینے کی سعی کی ہے۔ ان کی زندگی میں میر تقی میر کی طرح ذاتی کرب بھی ہے اور معاشرتی آشوب بھی۔ نسیم سیّد نے انتہائی ہنرمندی سے ذات اور معاشرے کے آلام کو شیر و شکر کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں غم ایک

تہذیبی عمل کے طور پر اُبھرتا ہے۔ وہ صرف غم کو محسوس نہیں کرتیں بلکہ اسے دل و جان سے قبول بھی کرتی ہیں۔ یہ طرزِ عمل انہیں دوسری شاعرات میں ممتاز بھی کرتا ہے۔ وہ ''آدھی گواہی'' کے پیش لفظ میں خود رقم طراز ہیں:

''میں نے سیکھا کہ دُکھ' درد' غم وہ کڑوی گولیاں ہیں جنہیں چبانا نہیں چاہیئے بلکہ نگل لینا چاہیے۔'' (پیش لفظ ''آدھی گواہی'' ص:۷)

اس طرزِ احساس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نسیم سید نے ہر اس چیز سے قلبی محبت کی' جو غم والم کی جاگیر میں شامل ہے۔ انہوں نے اُداسی کی اہمیت کو تسلیم کیا' اجنبیت کو محسوس کیا، موت کی حقیقت کو قبول کیا' خوابوں کی ضرورت کو محسوس کیا اور خزاں کی طرف توجہ دی۔ نسیم سید نے یہ طرزِ عمل اس لئے اپنایا کہ کہیں لوگ حقیقت سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ آپ ان اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھئے کہ موصوفہ نے کس طرح غم کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے ۔

زرد پتوں کی یہ رُت کیا کیا نہ سمجھائے مجھے
ہر تھکا ہارا شجر آئینہ دکھلائے مجھے
گردشِ تقدیر کے کچھ ہیں مسلسل دائرے
ہر جنم میرا غلط تحریر کر جائے مجھے
حسرتِ تعمیر میں مٹی مری برباد ہو
جرأتِ اظہار دیواروں میں چنوائے مجھے
میری ہستی کو وہ جیسے چاہے ویسے حل کرے
ضرب دے مجھ کو کبھی تقسیم کر جائے مجھے

نسیم سید کی شاعری میں ذات کا غم کئی سطحوں پر اُجاگر ہوتا ہے۔ ان کی زندگی میں درد و غم نے بسیرا کر لیا ہے' تاہم وہ اس دَرد سے لذتِ حیات حاصل کرتی ہیں۔ جب اندر کا کرب سامنے آتا ہے تو ٹوٹ پھوٹ کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے'

ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ اپنے گھر کی فصیلوں سے بدگمان ہوں میں
کچھ عادتاً بھی مہاجر ہوں بے مکان ہوں میں
نہ اہلِ دل کو سزا اور نہ اہلِ فکر کو دار
عجیب طرح کے لوگوں کے درمیان ہوں میں
ہوا کے زہر نے سینچا ہے میرا ذوقِ نمو
تمام تازہ ہواؤں سے نیم جان ہوں میں
متاعِ غم ہی مناسب تھی میری مٹی کو
خمار ٹوٹا تو جانا کہ بے نشان ہوں میں

نسیم سید کی شاعری میں ذات کا غم سطحی حیثیت میں اُجاگر نہیں ہوتا۔ اگر یہ صورتِ حال ہوتی تو وہ بھی دوسری شاعرات کی طرح یاسیت کا شکار ہو کر شور و غوغا بلند کرتیں۔ نسیم سید ذاتی غم کو بھی اپنی ذات کے اندر قید نہیں کرتیں۔ اُسے کائنات کی لامحدود وسعتوں میں پھیلا دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری بھی ذات کے غم کو آفاق میں پھیلانے کا عمل ہے۔ اس حوالے سے ''آدھی گواہی'' کے پیش لفظ میں وہ رقم طراز ہیں:

''...... موت سے بھی بڑا زندگی کا المیہ وہ موت جو ہماری زندگی میں ہمارے اندر واقع ہوتی ہے' ہوتی رہتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ دل کی ایک بچی خوشی ایک یقین کے لئے ہم اپنے اندر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں یا پھر اُداسی کی دبیز چادر کا بکل مارے' زمین پر ایک جگہ بیٹھے' لکیریں کھینچ کھینچ کے اپنے نقوش بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم مٹی کی کچی لوح پر اپنے خواب' اپنی خوشیاں اور اپنے غم تحریر کرتے رہتے ہیں۔ مٹی کی کچی لوح اور اس پر کھنچی ہوئی الٹی سیدھی' آڑی' ترچھی

لکیریں‘ اس کے علاوہ ہمارے پاس ہے ہی کیا؟'' (پیش لفظ ''آدھی گواہی'' ص:۸)

نسیم سید ذاتی غموں اور قلبی آلام کو معاشرے کے تناظر میں دیکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں سطحیت پیدا نہیں ہوتی اور نہ اس کا کینوس تنگ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''اندر پت جھڑ بڑھتی جائے'' ملاحظہ فرمایئے‘ جو ہمارے موقف کی تائید کرے گی:

ہریالی کی کھوج میں
تنہائی کے شہر بسائے
تن پر سبزہ مہکے
اندر پت جھڑ بڑھتی جائے
جب جب تیرا
سبز بجیلا‘ ہرا بھرا تن دیکھوں
میگھل!!
مجھ کو اپنا زرد سا نیم بہت یاد آئے

اسی طرح نسیم سید کی ایک نظم ''خواب ہمیشہ دھوپ چڑھے تک جل جاتے ہیں'' ہمارے درج بالا موقف کی بھرپور تائید کرتی ہے‘ ملاحظہ فرمایئے۔

خواب تو سب ہی دیکھتے ہیں
پر وہ پاگل خواب
جو میرے گھر نے دیکھا
جیسے اس کی دیواریں
اتنی اونچی اور اتنی مضبوط ہیں

ان سے سب سیلانی موجیں
سر ٹکرا کے لوٹ گئی ہیں
جیسے اس کی چھت میں کوئی شگاف نہیں ہے
بارش کا' اولے کا' دھوپ کا
گھر پر کوئی عذاب نہیں ہے
جیسے اس کی کیاری کیاری
پھول کھلے ہیں
سارا آنگن خوشبوؤں سے مہک رہا ہے
خواب ہمیشہ الٹی تعبیریں پاتے ہیں
خواب ہمیشہ دھوپ چڑھے تک جل جاتے ہیں
سو یہ ہوا...... ٹوٹی چھت...... کچی بنیادیں
خوابوں کی تعبیر ہوئی
ڈالی ڈالی زردی چھائی
کیاری بے تقدیر ہوئی
خواب تراشنے والی آنکھ
اسیر ہوئی

نسیم سید کی شاعری میں متنوع معاشرتی مسائل بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کے مسائل بیان کرتے ہوئے تجزیاتی رویہ اپناتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری نہ تو جذباتی نعرہ بنی ہے اور نہ اس میں معاشرے کی تبدیلی کے لئے کوئی انقلاب آفریں پیغام پوشیدہ ہے۔ وہ سچی سچی باتیں کھرے کھرے الفاظ میں پیش کر دیتی ہیں۔ انہوں نے معاشرے کا مطالعہ کئی سطحوں پر کیا ہے۔ جب وہ معاشرے کو

ایک عورت کی آنکھ سے دیکھتی ہیں تو کچے دھاگے' گزراوقات' نرسنگ ہوم' سمجھوتہ' سانولی رنگت' ایشیاء کی مزدور عورت' کچی بستی' عصا کی حاجت نہیں ہے مجھ کو' اور اسی قبیل کی دیگر نظمیں معرضِ تخلیق میں آتی ہیں۔ ان نظموں کے عمیق مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض عورت کی مظلومیت کا رونا نہیں روتیں اور نہ ان کے سطحی اور جنسی مسائل و معاملات کو نمک مرچ لگا کر پیش کرتی ہیں بلکہ انہوں نے عورت کے حقیقی مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے عورت کو ایک عورت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ذاتی کرب اور زندگی کے بے شمار مسائل میں اُلجھی ہوئی عورت کے لئے نسیم سید کی نظم ''کچے دھاگے'' انتہائی اہمیت کی حامل ہے' ملاحظہ فرمایئے۔

عورت اپنی ذات کو دانہ دانہ
ایک ہی ہستی کے دھاگے میں گوندھے
گوندھ کے سمجھے
اس کی ذات کی سب بکھری کڑیاں زنجیر ہوئیں
دھاگے کی بس ایک گرہ کے بل پر
اپنی ہستی کی تکمیل کے امکانات پرودے
کچے دھاگے
گرہ لگا دینے سے کب مضبوط ہوئے
جب چاہیں
جس طرح سے چاہیں
پھر سے اس تسبیح کو توڑ کے
ذات کو دانہ کردیں

نسیم سید کی عورت کے حوالے سے لکھی گئی نظموں کا ایک اختصاصی پہلو یہ ہے کہ انہوں

نے عورت کو مجبور محض بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ عورت کی زندگی میں نئی امنگیں اور آرزوئیں بھرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ انہوں نے عورت کو معاشرے میں بے ساکھی کے بغیر زندگی گزارنے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''عصا کی حاجت نہیں ہے مجھ کو'' ہمارے درج بالا موقف کی تائید کرے گی' ملاحظہ فرمایئے۔

مجھے خبر ہے
کائی لگے پتھر پہ کھڑی ہوں
مت سمجھاؤ
کھائی ہے نیچے دیکھ رہی ہوں
اپنے اندر
کائی لگے پتھریلے رستے چلتے چلتے
بان ہوئے ہیں تلوے میرے
کائی لگا یہ پتھر میرا کیا کرے گا
اتنے کنکر پتھر لیے ہیں جھولی میں
خوف کی ایک اک کھائی کا سینہ پھٹ جائے گا
عصا کی حاجت نہیں ہے مجھ کو
جس دریا میں پیر دھروں میں
آپ اک رستہ پھوٹ آئے گا

نسیم سیّد کو معاشرے کی بے حسی' ناہمواری اور منافقت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے خاتمے کا نوحہ پڑھتی ہیں اور بنیادی انسانی حقوق سلب ہو جانے پر گریہ کناں ہیں۔ وہ نئی زندگی کے متلاشیوں پر یہ کہہ کر طنز کے تیر برساتی ہیں کہ عصرِ حاضر کے زندہ

نفوس تو موت سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں' لہٰذا مریخ اور چاند پر نئی زندگی کی تلاش کیا معنی رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم "زندگی کی تلاش" ملاحظہ فرمائیں۔

سیڑھیاں آسمان کی چڑھ کے
چاند کے ایک ایک کونے میں
زندگی کو
تلاش کرتے ہیں
اور صومالیہ کے صحرا میں
ایک مُٹھی اناج کی خاطر
"زندگی" ایڑیاں رگڑتی ہے
بُھوکے بچے
سسک کے مرتے ہیں

نسیم سید کی شاعری میں طنزیہ لب ولہجہ اس وقت عروج پر نظر آتا ہے' جب وہ کسی معاشرتی ناہمواری کو بیان کرتی ہیں۔ نسیم سید کا ترش وتند لہجہ شعری متانت کو کمزور نہیں ہونے دیتا بلکہ بعض نظموں میں تو یہ کٹیلا لہجہ گفتار کی شیرینی لئے ہوتا ہے۔ اب آپ ایک نظم "انتباہ" ملاحظہ فرمایئے۔

اپنے ہاتھوں سے خون دھو ڈالو
اس سے پہلے کہ میرے خون کی بو
مشتہر ہو' عذاب بن جائے
اس سے پہلے کہ اُجلے ہاتھوں پر
خون جم جائے' داغ بن جائے
اس سے پہلے کہ بے صدا یہ لہو
خوں بہا مانگنے پہ

تل جائے

اپنے ہاتھوں سے خون دھوڈالو

نسیم سیّد کی شاعری میں معاشرے کی ہر بے راہ روی پر طنز کے عناصر مل جاتے ہیں، لیکن وہ ابتر حالات کے باوجود اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ وہ بے امان معاشرے کو امن و سلامتی کا گہوارا دیکھنا چاہتی ہیں اور اپنا خونِ جگر صرف کر کے خزاؤں کو بہاروں میں بدلنے کی تمنائی ہیں۔ ان کی دو مختلف غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

میں جب بھی خوف کے لشکر کو زیر کر آئی
نئی زمیں مرے پیروں تلے اُبھر آئی

....

نقشِ محرومی تقدیر کو تدبیر میں رکھ
سعیِ امکاں سے گزر شوق کو تعمیر میں رکھ

حقیقت تو یہ ہے کہ نسیم سیّد کا غم آفاقی قدروں کا حامل ہے اور اسے بین الاقوامی تناظر میں سمجھنے اور دیکھنے کی ضرورت ہے۔ عصرِ حاضر کی غمگین زندگی میں یاس کو چھوڑ کر رجا کا دامن تھامنا عام انسان کے لئے سہل نہیں ہے۔ نسیم سیّد نے مایوس اور غمزدہ ماحول میں بھی اُمید کے دیپ جلائے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''دُعا'' ہمارے موقف کی تائید کرے گی، ملاحظہ فرمایئے:

آج کا دن کہ تمہارا دن ہے
آج کی دُھوپ میں نرمی بھی ہے
حدّت بھی ہے
بام سے اُتری ہیں کرنیں
تمہیں چھونے کے لئے

تم کو چھو لیں تو جدھر سے گزریں
رنگ کا' نور کا' خوشبو کا اُجالا پھیلے
ہر طرف پھیلے اُمر ہو جائے
تم کو چھو لیں
چمن سے گزریں
سُرخ پھولوں سے گلے مل کے کہیں
آج ہر رنگ اُمر ہو جائے
آج کا دن کہ تمہارا دن ہے
جھوم کے اُٹھے ہیں مشرق سے
دُعاؤں کے سحاب
تم اُمر ہو جاؤ

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ نسیم سیّد کی شاعری میں ذاتی کرب اور معاشرتی آلام یکجا ہو گئے ہیں۔ نسیم سیّد کا کمالِ ہنر یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی غم کو وسعت دے کر آفاقی بنا دیا ہے اور کائنات کے غم کو سمیٹ کر اپنی ذات میں جذب کر لیا ہے۔ اب میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ نسیم سیّد کی ذات کا مطالعہ ہمیں آفاقی قدروں سے روشناس کرائے گا اور کائناتی قدریں ہمیں نسیم سیّد کی ذات کی جانب لے جائیں گی۔ آیئے مطالعہ کے نئے نئے رُخ دیکھنے کیلئے کتاب ''آدھی گواہی'' پڑھیں اور مزید ''آدھی گواہی'' کی تلاش میں سرگرداں ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ''آدھی گواہی'' میں مزید آدھی گواہی موجود ہے اور یہ دونوں مل کر ''مکمل گواہی'' بن جائیں گی۔

◆◆◆

◆◆◆

صحرائے قطر کا آہو ـــــ محمد ممتاز راشد

◆◆

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ عصرِ حاضر کی تنقید، تحسین اور تنقیص کے دائروں میں بٹ گئی ہے۔ بیشتر تنقیدی مقالات یا تو ''ستائش باہمی'' کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں یا کسی ''برہمی'' کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں قاری کا اس ''شکستہ تنقید'' سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ تنقید پر قاری کے اعتبار کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عصرِ حاضر کے ناقدین غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں، ورنہ تنقید کی اس ناگفتہ صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین کرکٹ کی دنیا کی طرح ادبی دنیا میں بھی ''نیوٹرل نقاد'' کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

عصرِ حاضر میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی ایک جمود کی کیفیت طاری ہے۔ معاشرتی اور سیاسی شکست و ریخت کے اثرات ادب پر بھی مرتسم ہو رہے ہیں اور غالباً اسی زبوں حالی کی بنا پر ادیب، ادب اور قاری کی مثلث ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ ادیب قاری کے تقاضوں سے ناآشنا ہے اور قاری ادیب کے خیالات و نظریات سے بے خبر رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس دورنگی نے ادب کو ''چوں چوں کا مربہ'' بنا دیا ہے۔ نظریہ سازی کا فقدان ہوتا جا رہا ہے اور اب ہوا کے رُخ

پر چلنے والے بادنما ادیب نظریہ ساز شمار ہونے لگے ہیں۔ ادیب ذاتی فوائد کے حصول کے لیے قلم کو بیچ چکے ہیں اور اسی بنا پر قاری کا رُخ ادبی وشعری کتب سے ہٹ کر جاسوسی رسائل کی طرف پھر گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادیب اور شاعر اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھیں اور قاری کے لیے ایسی نثری وشعری تخلیقات پیش کریں جو ان میں ذوق پیدا کرنے کا موجب بنیں۔

اُردو میں بے شمار ایسے تخلیق کار ہیں جنہوں کے معاشرتی رویوں کی پیش کش کے لیے اپنی تخلیقات کو وقف کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ہر تخلیق کو معاشرے کے کسی نہ کسی رویے کا مظہر بنانے کی کاوش کرتے ہیں۔ **محمد ممتاز راشد** بھی ان چنیدہ تخلیق کاروں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی شاعری اور نثر کو ذات اور کائنات دونوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ذات سے آفاق اور آفاق سے ذات کے تشکیلی مراحل بحسن وخوبی ادا کر رہے ہیں۔ اب ذیل میں ان کے مختصراً کوائف پیش خدمت ہیں تاکہ قارئین ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کا خود بھی اندازہ لگا سکیں۔

❖ کوائف

• نام	محمد ممتاز راشد
• ولدیت	میاں محمد شفیع
• ولادت	۲۵ نومبر ۱۹۵۳ء
• مقامِ پیدائش	مزنگ، لاہور
• زوجہ	زاہدہ بیگم
• اولاد	سُنیلا ارجمند، عفرا، شبانہ ناز (بیٹیاں) عدیل ممتاز، شرجیل ممتاز (بیٹے)

❖ تعلیم

• پرائمری	ایم۔سی پرائمری سکول، محمود بوٹی، لاہور
• میٹرک	گورنمنٹ ہائی سکول، باغبانپورہ، لاہور
• بی۔اے	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
• ڈرافٹسمین کورسز	پاک جرمن ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر، لاہور گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی، لاہور
• کمپیوٹر کورسز	آٹو کیڈ......فیملی کمپیوٹر سنٹر، دوحہ۔قطر
• زبانِ عربی	چار سالہ ڈپلومہ کورس۔لینگویج انسٹی ٹیوٹ، قطر

❖ ملازمت

- اورینٹ ماچس فیکٹری لاہور
- این ڈی آئی ایس سی ڈیزائن سنٹر، لاہور
- این ای سی سی دوحہ۔قطر
- قطر الیکٹرسٹی، قطر (کہرماء)

❖ اعزازات

- ادبی ایوارڈ، پاک یوتھ سوسائٹی قطر
- اعزازی وثیقہ، مجلسِ فروغ اُردو، قطر
- توصیفی سند، پاکستان ایمبیسی، قطر
- نشانِ فضیلت، پاکستان کلب، بحرین
- بہترین غزل گو ایوارڈ، بن رائز رائٹرز فورم پاکستان، قطر
- اعزازِ فضیلت ایوارڈ، نظریہ پاکستان فیڈریشن، لاہور
- سفینۂ ادب ایوارڈ، گوجرانوالہ، پاکستان

- بیسٹ سروسز ایوارڈ، پاکستان یوتھ اینڈ چلڈرن فاؤنڈیشن، اسلام آباد
- نشانِ سپاس، ماہنامہ 'ہیلو' انٹرنیشنل فورم، لاہور
- ادبی ایوارڈ ارباب فکروفن، کویت
- خصوصی گوشہ برائے محمد ممتاز راشد، ماہنامہ 'شاعر' بمبئی، مئی ۲۰۰۶ء
- خصوصی نمبر برائے محمد ممتاز راشد، ماہنامہ 'سلسلہ' کراچی، ۲۰۰۱ء
- خصوصی نمبر برائے محمد ممتاز راشد، سہ ماہی 'ادبی شاہین' اندور، ۲۰۰۷ء
- خصوصی نمبر برائے محمد ممتاز راشد، ماہنامہ 'سلسلہ' کراچی، ۲۰۰۱ء
- خصوصی نمبر برائے محمد ممتاز راشد، سہ ماہی ''ادبی شاہین'' اندور، ۲۰۰۷ء

❖ اصلاحِ سُخن (تلمیذ)

- جناب علامہ ذوقی مظفرنگری جانشینِ حضرت احسان دانشؔ

❖ تصنیفات

- صحرا کی ٹھنڈی شامیں (تذکرہ شعرائے قطر)
- کاوش (غزلیں)
- عقیدتِ خام (حمد و نعت و سلام)
- تیری خوشبو سے دل مہکتا ہے (رومانی قطعات)
- سخن ریزے (فردیات)
- ہم ہیں اپنے مزاج کے بندے (معاشرتی قطعات)
- لاہور کے نئے پرانے رنگ (تذکرہ و تاریخ)
- مذاق مذاق میں (مزاحیہ شاعری)
- اِک بات محبت کی (غزلیں)
- تیرا جادو بول رہا ہے (نظمیں)

❖ زیرِ ترتیب

- کرماں دی چھاں کردے (پنجابی شاعری)
- جب لاڈلا منّا جاگے گا (بچوں کیلئے نظمیں)
- ایک محرومی کا ازالہ (افسانے)
- مدحت سرائی (حمد و نعت)
- تبصروں کی آنچ (درجنوں کتب پر تبصرے)
- منفرد بیت بازی (مبنی بر کلام ممتاز راشد)

❖ ادب پروری

- صدر ادارہ 'خیال و فن' قطر
- چیئرمین، بزمِ اُردو، قطر
- جنرل سیکرٹری، پاک یوتھ سوسائٹی، قطر
- ادبی مشیر، پاکستان آرٹس سوسائٹی، قطر

❖ رابطہ

(۱) پوسٹ بکس نمبر ۸۱۶۲، دوحہ۔ قطر
فون: ۵۲۰۰۶۲۱ (۰۰۹۷۴)

(۲) سارہ ہاؤس، اے ٹیپ روڈ، لاہور
فون: ۷۳۱۱۵۱۸ (۰۰۹۴۲)

محمد ممتاز راشد کی یوں تو ہر تخلیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم اور لائق توجہ ہے تاہم "اک بات محبت کی" اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اس میں انسان کے

بنیادی جذبے ''محبت'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ موضوع جہاں ایک جانب قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے وہاں دوسری جانب ممتاز راشد کی بے پناہ صلاحیتوں کا مظہر بھی ہے۔ ممتاز راشد کا وصف خاص یہ ہے کہ انہوں نے ہم عصر شعرا کی طرح اس پامال موضوع کو سطحی جذبات کی سیرابی کے لیے مخصوص نہیں کیا بلکہ محبت کو علوئے فکر کے لیے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے محبت کی اک بات سے سینکڑوں قصے اُجاگر کیے ہیں گویا اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی مشکور سعی کی ہے۔ اگر آپ ممتاز راشد کے تخلیقی دوائر سے آگاہ ہیں تو آپ کو علم ہوگا کہ غزل ان کے تخلیقی ہنر کا بنیادی دائرہ ہے اور اس دائرے کا مرکزی نقطہ محبت ہے۔ آپ ان کی غزل کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انہوں نے محبت کے کیا کیا روپ اور مظاہر پیش کیے ہیں:

اظہار محبت میں نہیں دیر لگائی
صد شکر کہ یہ کام تو برجستہ کیا ہے

....

محبت کس طرح کی ہے، یہ نفرت ہے تو کیسی ہے
نہ مجھ سے دور جاتے ہو، نہ آنکھیں چار کرتے ہو

....

خیال و فکر میں ندرت ملا گیا ہے کوئی
مجھے غزل کا سلیقہ سکھا گیا ہے کوئی

....

جگنو چمکیں، تارے مہکیں
تو آئے تو رستے مہکیں

بہت نفرتوں نے بلایا ہمیں
محبت کی خو نے بچایا ہمیں

....

یونہی جب وہ نیلے پیلے ہوتے ہیں
پیار بڑھانے کے یہ حیلے ہوتے ہیں

....

اک ترا رنگ جفا بدلا نہیں
ورنہ اس دنیا میں کیا بدلا نہیں

....

ہم ان کے حُسن خصائل کی قدر کرتے ہیں
نہ جانے کیا ہے کسی کا نسب نہیں معلوم

....

اپنوں کا جبر، غیروں کے طعنے، غمِ معاش
راہِ وفا میں کتنے ہوئے امتحاں نہ پوچھ

....

جو تیرے شہر، تیرے درو بام کے نہیں
ایسے تصورات مرے کام کے نہیں

....

کسی کے لطف و کرم کا ہے معجزہ راشد
کہ صحنِ دل میں شگفتہ گلاب اُترے ہیں

اس کی یادیں ہی سہارا بن گئیں
کر کے جس نے بے سہارا رکھ دیا

....

دل کہ رہتا تھا بے قرار بہت
غم سمیٹے تو کچھ قرار آیا

....

تیرے بعد آوارگی کو اوڑھ کر
زندہ رہنے کا سہارا رکھ لیا

....

عشق جس فرد میں تنویر فشاں ہوتا ہے
اس کے سینے میں چراغاں کا سماں ہوتا ہے

....

شورشِ عہدِ محبت کا اثر کچھ کم ہے
اب بھی دل میں ہے ترا درد مگر کچھ کم ہے

....

ممتاز راشد کی غزلوں میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو جسمانی طور پر وطن سے دور رہ کر بھی روحانی اور قلبی طور پر خود کو وطن میں محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی تفرقہ بازی اور دہشت گردی سے نالاں ہے اور یہاں کی ظلم و ستم کی داستانیں اسے بے قرار کر دیتی ہیں۔ وہ جھوٹ، فریب، ریاکاری، خوش کن وعدوں، افلاس، منافقت، فقہی اختلافات، زیست کے حادثات، معاشرتی ناانصافی اور حاکمانِ بے چہرہ سے زچ ہو کر اپنے ہم وطنوں سے التماس کرتا ہے کہ:

جسے چاہو اسے رسوا نہ کرنا
ستم کرنا مگر ایسا نہ کرنا
بہت اُجلا ہے آنگن قربتوں کا
جدائی سے اسے میلا نہ کرنا
رواداری کی باتیں خوب لیکن
کبھی غیرت پہ سمجھوتہ نہ کرنا
ملے منصب تمہیں گر منصفی کا
تو پھر انصاف کا جھٹکا نہ کرنا
رویے میں لچک رکھنا مگر تم
کبھی مقصد پہ سمجھوتا نہ کرنا
اگر لکھنا تو لکھنا حرف روشن
یونہی کاغذ کو تم کالا نہ کرنا

ممتاز راشد وطن سے دور رہنے کے باوجود وطن کے معاملات سے لاتعلق نہیں ہیں۔ وہ اپنے وطن کے موسموں، رنگوں، تتلیوں، پہاڑوں، صحراؤں، بہاروں، دریاؤں، غرض ہر چیز سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان کا وطن رشکِ بہشت ہے اور وہ اپنے وطن کے لیے ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اپنے وطن پاکستان سے والہانہ محبت کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ انہوں نے قطر جیسے صحرائی علاقے میں اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی جریدے "خیال و فن" کے ذریعہ سے بے شمار تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور نوجوان لکھنے والوں کو اُردو زبان سے رغبت دلانے اور پاکستان سے محبت کا جذبہ بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہی دونوں عوامل ان کے افکار و نظریات کے لیے بھی مفید و معاون

ثابت ہوئے ہیں۔

ممتاز راشد کی غزلوں میں طنزیہ رجحان بھی وافر مقدار میں ملتا ہے۔ وہ کبھی تو اپنی ذات پر طنز کرتے ہیں اور کبھی معاشرتی رویّوں اور زوال آمادہ قدروں پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ کبھی ان کا طنز ذات سے شروع ہو کر پوری کائنات پر پھیل جاتا ہے اور کبھی پورے معاشرے کا طنز ان کی ذات میں سمٹ آتا ہے۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ ممتاز راشد کی شاعری پھیلتی ہے تو آفاق پر حاوی ہو جاتی ہے اور جب سمٹتی ہے تو شاعر کی ذات میں مقید ہو جاتی ہے۔ آپ ان کی غزل کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور اس میں طنز کی زہرناکی دیکھیے:

آپ نے تو جو بھی چاہا، جو بھی سوچا ہو گیا
مسئلہ تو ان کا ہے جن کا مقدر سو گیا
میں کسی سے مانگتا کیا ایک لمحے کی ہنسی
مجھ سے جو بھی ملنے آیا اپنا رونا رو گیا

....

فائدے سارے سمیٹے آپ نے
میرے ذمے ہر خسارہ رکھ دیا
آسماں نے ظلم ڈھایا اور پھر
خاک پر الزام سارا رکھ دیا

....

تعصب کو لبادہ کر لیا کیا
تباہی کا ارادہ کر لیا کیا؟
امیرِ شہر سے قربت ہے پھر سے
قصیدوں کا اعادہ کر لیا کیا؟

خوب اس کی پہچان ہے اپنے لوگوں میں
دھوکہ دینا عادت، اور وتیرہ جھوٹ
سچ کا حلف اٹھا کر بھی وہ جو بولا
آدھا اس میں سچ تھا باقی آدھا جھوٹ

....

ہمارے دل کو غموں سے نڈھال رکھتے ہیں
یہ آپ خوب ہمارا خیال رکھتے ہیں
ہمیں ملال نہیں بے وفا زمانے کا
تری جفاؤں کا لیکن ملال رکھتے ہیں

....

کچھ سوالوں میں کچھ جوابوں میں
عمر گزری انہی عذابوں میں
وقت پڑنے پہ کچھ نہ کام آیا
جو پڑھایا گیا نصابوں میں

....

گلا خواہشوں کا دبائے ہوئے ہیں
کہ حالات سے تنگ آئے ہوئے ہیں
وہ خود بھی تماشا بنیں گے یقیناً
ہمیں جو تماشا بنائے ہوئے ہیں

....

ممتاز راشد کا اختصاص یہ ہے کہ وہ حالات کی یورش اور تقدیر کی بے حسی سے گھبراتے نہیں بلکہ نامساعد حالات میں بھی اُمید کے چراغ جلاتے ہیں۔ وہ غم انگیز ماحول میں بھی مسکرانے کا عزم رکھتے ہیں اور اہلِ دنیا پر واضح کرتے ہیں کہ عقل مند وہ ہوتا ہے جو

سخت اور ترش حالات میں بھی خوشگوار اور شیریں زندگی گزارنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ راشد کی یہی رجائیت انہیں ہم عصر شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمایئے:

سدا سہولتیں پیدا کرو جہاں کے لیے
نشانِ راہ بنو اہلِ کارواں کے لیے
کہیں ہے کوئی رکاوٹ تو غم نہیں راشد
بہت سے اور بھی رستے ہیں کارواں کے لیے

اب چلتے چلتے چند باتیں ممتاز راشد کے اسلوب کے بارے میں بھی سُن لیجیے۔

ممتاز راشد کی غزلوں میں غیر محسوساتی طریقے سے ٹ، ڈ اور ڑ کے حروف کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا لفظوں کا ساختیاتی نظام کہ یہ تینوں حروف غزل کے کومل جذبات کے اظہار میں مانع ہیں۔ ممتاز راشد نے شیخ امام بخش ناسخ کی طرح کمال یہ دکھایا ہے کہ غیر مانوس الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ ہر دل عزیز بن جاتے ہیں۔ آپ ان کی چار غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

جھوٹے نے تو پل میں بولا فرفر جھوٹ
جو سچا تھا اس کے گلے میں اٹکا جھوٹ
فنکاری کے زمرے میں آ جاتے ہیں
خوش کن ڈینگیں، ستھرے ڈھونگ اور عمدہ جھوٹ

....

جب ہوئیں میری وحشتیں گڈمڈ
ہو گئیں ساری صورتیں گڈمڈ
دیکھ لیجے اُلجھ گئے نا پھر؟
اور کیجے روایتیں گڈمڈ

....

جو آفتوں کے تناظر میں کٹ کے دیکھتے ہیں
وہ زندگی کو زمانے سے ہٹ کر دیکھتے ہیں
یہ دیکھ کر کہ کوئی دیکھتا نہیں راشدؔ
ہم اس کے پھول سے چہرے کو ڈٹ کے دیکھتے ہیں

....

نظر تیغِ بلا سے ہٹ نہ جائے
رہو چوکس کہ گردن کٹ نہ جائے
جواں ہونے لگے ہیں گھر کے بچے
کہیں اب گھر کا آنگن بٹ نہ جائے

ممتاز راشد زبان و بیان پر مہارت رکھنے والے کلاسیکی شاعر تو نہیں ہیں لیکن آپ ان کی غزلوں کی ردیفوں کا مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان پر دبستانِ ناسخ کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

جو نہیں اپنی ذات سے مانوس
کیسے ہو کائنات سے مانوس

....

ہجوم درد و الم کا سبب نہیں معلوم
تمام شہر ہے کیوں جاں بہ لب نہیں معلوم

....

فقط شہرت کا رستہ ڈھونڈتے ہیں
کہ عزت کام سے ہے نام سے نئیں

....

ستم بردوش آتی ہیں غموں کی سرد برساتیں
جلاتی ہیں، رُلاتی ہیں غموں کی سرد برساتیں

....

تنہائیوں کی شب ہے، اُداسی کا شور ہے
یادوں کی انجمن ہے خموشی کا شور ہے

....

مجس تو سب کو عام فراہم کیے گئے
روزن برائے نام فراہم کیے گئے

....

اک خوبرو جواں کی جوانی سفر میں ہے
اوراس کے ساتھ روپ کی رانی سفر میں ہے

....

خیر اور شر کو تولنے سے نہ رُک
عدل کے حق میں بولنے سے نہ رک

....

اب بھی ہے سوالات کا معیار سلامت
اب بھی ہیں ترے شہر میں خوددار سلامت

....

ممتاز راشد کا اسلوب شعر دوسرے شعراء سے منفرد نظر آتا ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست اور تراکیب و مرکبات کا استعمال واضح کرتا ہے کہ ممتاز راشد الفاظ کے تہذیبی سیاق وسباق سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ وہ علم بیان وبدیع کے استعمال پر بھی قدرت رکھتے ہیں

لیکن انہوں نے اپنے خیال کی انفرادیت کو لفظی اُلٹ پھیر کے لیے کہیں بھی قربان نہیں کیا۔ ممتاز راشد زبان و بیان کی نزاکتوں سے آگاہ ہیں اور یہی چیز انہیں دوسرے شاعروں سے نمایاں کرنے کا سبب ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شعرا کو چاہیے کہ وہ اپنے شعری افکار کے ذریعہ قارئین کو ادب کی جانب مائل بھی کریں اور عملی زندگی میں اپنے موضوعات کے ذریعہ ان کی سمت نمائی بھی کریں۔ ہمارے لیے یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ ''اک بات محبت کی'' میں ممتاز راشد نے یہ دونوں امور حُسن اور سلیقے سے انجام دیے ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے اور لطف یہ ہے کہ اپنی عاجزی کے باعث وہ آج بھی اہلِ دانش سے کہہ رہے ہیں کہ

ہزار شعر بھی لکھتا ہوں نثر بھی راشدؔ
کہاں ہے منزلِ شعر و ادب نہیں معلوم

◆◆◆

***

عرفانہ عزیز کی شعری کائنات

**

عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ سائنس کی برق رفتار ترقی سے کماحقہٗ استفادہ کی کاوش ہی نہیں کرتے۔ اس طرح ان کے اذہان سطحی مسائل و موضوعات کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کا اسپِ قلم عالم گیر میدان میں دوڑنے سے گریزاں دکھائی دیتا ہے۔ اس المناک صورت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جلبِ منفعت کا شکار ہو کر ذاتی اور سطحی مسائل میں اُلجھ کر برباد ہو جاتے ہیں۔ جب تک ہمارے تخلیق کار بین الاقوامی تناظر میں اپنے ذہنی اُفق کو وسیع نہیں کریں گے ان کی تخلیقات آفاقی قدروں کی حامل قرار نہیں پائیں گی۔ آج کے تخلیق کار کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ جلد از جلد شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند مقام پر متمکن تو ہونا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے جس جدوجہد، محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے کوسوں دور ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تخلیق کاروں کے لیے ایسا پُرسکون ماحول پیدا کریں کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کریں اور **عرفانہ عزیز** کی طرح ان کی تخلیقات کی روشنی سے عالمِ امکان جگمگا اُٹھیں۔ یقیناً یہ کام بے حد دشوار ہے لیکن عرفانہ عزیز ایک طویل عرصے سے اپنے گراں قدر افکار و نظریات سے اس دُشوار کام

کو آسان بنانے میں مصروف ہیں۔ وہ جوش وخروش اور ولولہ سے عصرِ حاضر کے تمام تخلیق کاروں کو پیغام دے رہی ہیں۔

خموشیوں کو صدا دے گئی زباں میری
حروف، رہروِ فن کو مری زباں سے ملے

پاکستان میں اُردو شاعری کی بنیاد ناصر کاظمی کی اُداسی، فیض احمد فیض کی کلاسیکی غنائیت، ظہیر کاشمیری کی بلند آہنگی، احمد فراز کی رومانیت اور ن۔م۔راشد کی جدّت طراز بغاوت پر استوار ہوئی ان پانچ ذائقوں میں ہمارے وطن کی خوشبو بھی شامل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مبتدیوں کے لیے جلد یا بدیر ان پانچ راستوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب ضروری ہوگیا۔ بیشتر شعرا نے اپنے مزاج و مذاق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے لیے شعری جادے کا انتخاب کرلیا اور عمر بھر اسی میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ پاکستانی شاعرات نے جب اختر شیرانی کی سحر انگیز رومانوی شاعری سے دامن چھڑایا تو احمد فراز کی لطف انگیز شاعری کی اسیر ہو کر رہ گئیں۔ اس وسیع شعری تناظر میں جب عرفانہ عزیز نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو دوسری شاعرات کے برعکس انہوں نے سطحی جذبات کی پیش کش کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا بلکہ فیض احمد فیض کو اپنا رہبر بنا کر انہوں نے کلاسیکی شاعری کو نیا ذائقہ اور اسلوب عطا کرنے کی مشکور سعی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیض احمد فیض کا فیض ہے کہ عرفانہ عزیز ایک وسیع تناظر کی حامل ہوگئیں اور ان کی شاعرانہ روش دوسری شاعرات سے جدا بلکہ منفرد ہوگئی اور وہ ایک مخصوص نظریہ لے کر شعری اُفق پر نمودار ہوئیں۔ سب سے پہلے آپ ان کے خیالات ملاحظہ فرمایئے اور میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا ہماری کسی شاعرہ کا ذہنی اُفق اتنا وسیع ہے؟؟

"ہر فنکار کا ایک نظریہ فن ہوتا ہے اور مخصوص موضوعات اُس کی قلبی

تخلیقات کا محرک بنتے ہیں۔ شاعر، باطنِ انسان میں روپوش قوت متحرکہ کو بیدار کر کے اُسے اعلیٰ وارفع نصب العین عطا کرتا ہے۔ ہر صاحبِ وجدان عرصۂ دہر میں عہدِ تازہ کی آفرینش کے لئے فکر و نظر کے اجتہاد سے کام لیتا ہے۔ ہر فنکار کا تعلق عالم گیر نفسِ اجتماعی سے ہوتا ہے جو رنگ و نسل کے امتیاز اور جغرافیائی حدود سے بالا ہوتا ہے۔ شاعر خصوصاً موجودات کی یکتائی کا ترجمان ہوتا ہے۔ زندگی کی بنیادی وحدت اُسے گاہے گاہے غمِ دیگراں کی طرف مائل کرتی رہتی ہے اور وہ تادیر غمِ ذات میں مقید نہیں رہ سکتا۔ جب کوئی فنکار اپنے شخصی میلانات یا ہنگامی محسوسات کو بروئے سُخن لاتا ہے تو شعر کی آفاقیت سمٹ جاتی ہے۔ حالات کی جزوی تفسیر، غمِ ذات کا نوحہ، شاعری میں پائندگی اور عالم گیری کے عناصر کو کم کر دیتا ہے۔ اس لئے جب تک قلم کار کا شعور اپنے عہد کے غالب رجحانات سے مربوط نہ ہو اُس کی ہنرمندی میں آفاقی کشش پیدا نہیں ہو سکتی۔ عالم گیر انسانیت کی وحدت وہ دل آویز خواب ہے جو فنکار کی چشمِ باطن کو صد رنگ تابانیاں عطا کرتا ہے۔ دلِ پُرخوں کا "گداز" اور دردمندی کا احساس سُخن سنج کو انسان کی اُس فطری معصومیت نے بخشا ہے جو بدی کو سربلند پا کر بھی نیکی کی عظمت سے منکر نہیں ہوتی، اور ہمیشہ سچ کی دائمی فتح کی پیش گوئی کرتی ہے۔ چنانچہ عدم تشدد اور بقائے باہمی کا مسلک میں نے کسی مخصوص عقیدے کے تحت اختیار نہیں کیا بلکہ میرے نزدیک یہ ارتقائے انسانی کی دلیل اور مہذب انسانیت کی دوامی قدر ہے۔ میں نے انسان کو طفلکِ معصوم پایا اور میرا جذبۂ عاطفت اُن راہوں کا متلاشی رہا ہے جو نسلِ آدم کو تختۂ دار کی طرف لے جانے کے بجائے انسانی زندگی کی عالم گیر آسودگی پر ختم

ہوتی ہوں۔ زندگی کی دوامی قدروں کو موضوعِ سخن منتخب کرتے وقت ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان ہی میں سے ایک قدر زمین کی سلامتی اور امن کی بقا ہے۔ تہذیبی ارتقا کے پس منظر میں حرمت کی رجز خوانی، سطوتِ نغمہ گری پر میرے شاعرانہ ایمان کو بحال کرتی رہی ہے۔ جو زمین ماں کی آغوش کی طرح ہمیں پناہ دیتی ہے اس کا تحفظ بڑی سعادت ہے۔ اپنے ہمنواؤں کی طرح میں نے بھی اپنے وطن کو ثمر بار دیکھنے کا خواب دیکھا ہے۔ یہ سرزمینِ نوخیز و جمال آفریں جس کے طول و عرض میں لیلائے وطن کے جاں نثاروں کے پیغام گونج رہے ہیں۔ اس کی بقا اور سلامتی ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ عوام کی اُمنگوں اور مسرتوں کی ترجمانی ہر محبِ وطن ادیب، شاعر اور دانشور کا ایک اہم فریضہ ہے۔''

(عرفانہ عزیز، حرفِ آغاز، برگِ ریز، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص۱۲)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عرفانہ عزیز دوسری شاعرات کی نسبت وسیع تناظر کی حامل کس طرح ہو گئیں؟؟ اور ان کے شعری موضوعات میں ہمہ رنگی اور کثیر الجہات ذائقے کس طرح پیدا ہو گئے؟؟ میرے خیال میں اس کے تین اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ انہوں نے معاشیات کے مضمون میں مہارت حاصل کی اور بطور معلم انہوں نے اقتصادیات کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور سمجھانے کی کاوش کی۔ جس کے باعث ان کا ذہنی اُفق بے حد وسیع ہو گیا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یورپ میں قیام کے باعث وہ بین الاقوامی ادبی صورتِ حال سے براہِ راست آگاہ بلکہ متاثر ہوئیں اور انہیں عالمی ادب کو پڑھنے اور پڑھانے کا موقع دستیاب ہو گیا۔ تیسرا سبب یہ ہے انہوں نے شعر و ادب میں فیض احمد فیض سے اکتساب کیا اور ان کی طرزِ شاعری کو اپنانے کی شعوری کاوش کی۔ درج بالا تینوں اسباب کے بغور مطالعہ

کے بعد آپ عرفانہ عزیز کی شاعری کا مطالعہ فرمایئے تو آپ کو خود بخود اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ عرفانہ عزیز ہم عصر شاعرات سے اتنی مختلف کیوں ہیں؟؟ وہ خود اپنے مجموعے کفِ بہار کے ابتدائیہ میں رقمطراز ہیں:

''میرے نزدیک آج بھی اس کارگاہِ شیشہ گری میں انسان ہی جنسِ معتبر ہے۔ وہ میزانِ جلال بھی ہے اور مولائے جمال بھی۔ آدمی کی خاک میں پیغمبری ہے۔ وہ صورت گرِ لوح وقلم ہے اور لوح وقلم پر تمدن کی اساس ہے خواہ وہ آسمانی کتابوں کے تقدس سے پیدا ہوا یا سقراط و منصور کی سچائیوں سے۔ ناموسِ آیات وعلوم کے پیچھے آدمی ہی تو ہے۔ مردم گزیدگی کے باوصف انسان کے بارے میں میرا حسنِ ظن سلامت ہے۔ میں نے مشاہدے اور تجربے سے خود نتائج اخذ کیے اور میرے وجدان نے میری تربیت کی۔ مجھے روسو، ہیگل، برگساں اور گوئٹے نے متاثر کیا۔ میں نے جذبے کی نسبت اگر منطق وحکمت کو زیادہ اہمیت دی تو اُس میں میرے ماحول، میری تربیت اور خود میرے مزاج کو دخل تھا۔ روحِ عصر، زندگی اور حسنِ فطرت کی ترجمانی حقیقت پسندی اور صداقت پرستی کے بغیر ممکن نہیں۔ محسوسات قرض نہیں لیے جاسکتے نہ ہی تجربہ مستعار لیا جاسکتا ہے۔ میں نے خلاؤں میں معلق سُرخ انگور کی بیلوں اور اُن پر تیرتے ہوئے چاند کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ البتہ سرسبز ڈھلوانوں پر رائن سے نیاگرا تک جب نیلے دریاؤں اور آبشاروں کے تعاقب میں چلی تو انگور کی بیلیں مجھ پر سایہ کیے تھیں۔ میں نے ان بیلوں کے نم آلود پتوں کو چھو کر دیکھا اور نظمیں لکھیں۔ آلوچے کے پھول اور چیری کے شگوفے اپنی پلکوں پر محسوس کیے اور سچے خواب دیکھے۔ جرمنی کے سیہ جنگل، سوئٹزرلینڈ کے سبزہ زار، ڈھلوانوں پر

ترچھی چھتوں کے شاتو، سبزے پر قلانچیں بھرتے غزال، سبز جھیلوں میں تیرتے راج ہنس، کہرآلود کہساروں کے سلسلے اور دُور وادی میں سُرمئی کاسنی دُھند میں چھپے گوتھک دریچے، دریچوں میں سُرخ گلاب پر تیرتا چاند، یہ سب نقوش میری شاعری کا جزو ہے۔ فرانس، اطالیہ، یونان جہاں کہیں پارینہ ثقافت ملی اُس کی جبروت نے مجھے متاثر کیا۔ وسیع و عریض فضاؤں میں بکھر کر اکثر یہ احساس ہوا کہ میرا وجدان تیسری جہت کی تلاش میں ہے۔ ہجرت نے اگر مجھے لامحدود کرب دیا ہے تو سرمدی لطافتوں سے بھی آشنا کیا ہے۔ تھکے قدموں سے جب بھی کسی چشمے کے پاس ٹھہری ہوں تو ہجرتوں کے زخم دھو لیے ہیں۔ مجھے ہر سرزمین سے محبت ہے اور میرا تعلق ہر سمت سے ہے۔"

(عرفانہ عزیز، ابتدائیہ، کفِ بہار، لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲)

عرفانہ عزیز ایک ہمہ جہت شاعرہ ہیں۔ غزلیں اور نظمیں ان کے پُر تجمل شاعرانہ اظہار کے سلیقے ہیں۔ ان کے شاعرانہ سفر کی روداد بہت طویل اور حیرت افزا ہے۔ ان کے درج ذیل شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

(۱) برگ ریز

(۲) کفِ بہار

(۳) حرفِ شیریں

(۴) خوشبوئے پیرہن

(۵) دشتِ آواز

(۶) ابرِ گہربار

(۷) پھول دیں گے سراغ منزل کا

اگر کوئی قاری یا ناقد سنجیدگی سے ان تمام مجموعوں کا مطالعہ کرے تو وہ عرفانہ عزیز کے شعری سفر کی روداد سے بخوبی آگاہ ہو سکتا ہے۔

عرفانہ عزیز ایک ہوش مند شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اُن سطحی اور ہنگامی شاعرانہ موضوعات سے اپنی شاعری کو آلودہ نہیں کیا جو ان کی ہمعصر شاعرات کی پہچان ہے۔ انہوں نے نہ تو سفلی جذبات کی تسکین کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا اور نہ سستے جنسی موضوعات کو اپنی شاعری کا مرکز و محور بنایا۔ انہوں نے تو ہجوم ظلمتِ دوراں میں قندیل مہر و ماہ روشن کرنے کی کوشش کی اور غالباً اسی باعث ان کی آبروئے نظر سلامت رہ گئی۔

اسی سبب سے سلامت ہے آبروئے نظر
ملے جو آپ تو دنیا کی چاہ کر نہ سکے

عرفانہ عزیز کی شاعری کا کینوس انتہائی وسیع ہے۔ ایک جانب تو وہ عشق و محبت کے جملہ موضوعات کو اتنے حُسن اور سلیقے سے بیان کرتی ہیں کہ پرانے پھولوں میں بھی تازہ مہک محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک مستحسن رویہ ہے کہ اپنی کلاسیکی قدروں اور موضوعات کو جدید رویوں کے ساتھ پیوست کر دیا جائے لیکن اس کے لیے فیض جیسی شعری ریاضت کی ضرورت ہے۔ عرفانہ عزیز چونکہ فیض احمد فیض کے فکری قافلہ کی رہرو ہیں لہٰذا ان کی شاعری میں بھی یہی صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے۔ آپ ان کی شاعری کے بارے میں فیض احمد فیض کی رائے ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے موقف کی تائید کرے گی۔

"......'برگ ریز' کے مطالعے کے بعد مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ عرفانہ عزیز ہر اعتبار سے ہمارے جدید شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ ان کا کلام ایک ایسی عاقل، بالغ، انتہائی سنجیدہ اور حساس شخصیت کی تخلیق ہے جس کی صحتِ فکر و نظر اور خوبیِ گفتار و اظہار کا

اندازہ آپ اس کتاب کے مطالعے سے بھی پہلے محض اس کے حرفِ آغاز اور فہرست عنوانات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے کر سکتے ہیں۔

شعر کے محاسن کے لیے ہمارے ہاں جو پرانی اور نئی اصطلاحات رائج ہیں مثلاً سوز و گداز، سلاست و روانی، مضمون آفرینی، قدرتِ کلام، زورِ بیان، خلوصِ اظہار، صداقتِ جذبات، پاکیزگیِ فکر، شعورِ حقیقت، حُبِّ انسانیت وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب میں آپ کو ان سب کی مثالیں مل جائیں گی لیکن یہ سب رسمی الفاظ یکجا کر دیے جائیں تو بھی ان صفحات پر بکھرے ہوئے ان سخن پاروں کی صحیح توصیف کا حق ادا نہیں ہوتا جو اس شاعرانہ جوہر کے بہت اچھے نمونے ہیں جس سے حرفِ سادہ کو اعجاز کا رنگ عنایت ہوتا ہے اور صریرِ خامہ میں نوائے سروش سنائی دیتی ہے۔

ان کے غنائیہ کلام کی سادگی اور گداز، بے سلیقہ خود نمائی اور مصنوعی جذباتیت سے ملوث نہیں اور ان کی خطیبانہ اور "تبلیغی" نظموں کا خلوص اور وقار تعلی اور بے جا غلو سے پاک ہے۔ ان کی زبان اور لہجہ خالص کلاسیکی ہونے کے باوجود محض روایت کی سطح سے ہمیشہ بلند تر رہتا ہے اور ان کے ترنم کا زیر و بم بہت تنوع کے باوجود کبھی غیر مترنم نہیں ہوتا۔"

(فیض احمد فیض، فلیپ، برگ ریز (عرفانہ عزیز)، لاہور، ۱۹۷۱ء)

آپ ان کی غزلوں کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے عشق کے پامال اور فرسودہ موضوعات کو کس طرح نئی زندگی عطا کی ہے۔

پیکرِ لفظ میں خورشیدِ معانی جیسے　　ختم اس چشم پہ ہو فلسفہ دانی جیسے

....

اے دشتِ زرنگار کے معصوم ہمسفر　　میں کائناتِ دل کو ترا نقشِ پا کہوں

زمیں سے ربط ہوا استوار تیرے بعد
ترے فراق میں پہنچی نظر حقائق تک

....

آرائشِ جمال کا ساماں بھی نہیں
اس درجہ حُسن آج تہی دست ہے کہ پاس

....

کہ تار تار ہوئے دُکھ کے پیرہن سارے
ملامتوں ہی سے بدلو مزاجِ بخیہ گراں

....

کہ خوف اہلِ محبت کو کب زباں سے ہے
بساطِ شوق پہ رقصاں ہے تیشۂ فرہاد

....

ترے بغیر مری زندگی کہاں گزری
ٹھہر گئے ہیں مہ و سالِ عمر کے شاید

....

سمندروں کی طرف جب گہر شناس آئے
سرشکِ خوں غمِ جاناں سے پست کش کیوں ہو

عرفانہ عزیز کی شاعری میں ایک نیا دور سانس لے رہا ہے۔ یہ دور نئے امکانات سے پُر ہے۔ عرفانہ عزیز جانتی ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی شاعری کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا تو وہ بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ہر بڑے اور معتبر شاعر کی طرح انہوں نے معاشرے کی بے حسی پر طنز کے تیر برسائے ہیں تاہم امید و رجا کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دانش مند کہتے ہیں کہ یاسیت انسانی ذہن کی شکست و ریخت کا نام ہے جب کہ رجائیت انسان کو عزم و حوصلہ عطا کرتی ہے۔ عرفانہ عزیز رجائیت پسند شاعرہ ہیں۔ وہ ہمیشہ مثبت اقدار کی طرف متوجہ رہتی ہیں اور راہِ وفا کو مشکبو کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ آپ ان کی غزلوں میں حیات بخش رجائیت کے جو موضوعات دیکھتے ہیں وہ ان کی ہر دلعزیز شخصیت کا برملا اظہار ہیں۔ آپ درج ذیل اشعار کا بغور مطالعہ کیجئے اور دیکھیے کہ وہ کس طرح منفی رویوں سے مثبت رویوں کا استخراج کرتی ہیں اور اپنے رجائیت پسند ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

قبائے راہِ وفا مشکبو کیے جاؤ　　ملے گی منزلِ دل جستجو کیے جاؤ
فضائے دہر میں رنگینیِ چمن کے لیے　　ہر ایک تیر کو زیبِ گلو کیے جاؤ

....

کب سطوتِ اسباب کی ہے دل کو تمنا　　ہم اہلِ طریقت کو تو پندار بہت ہے

....

چراغ دل کے قریں اپنی چشم تر رکھیے　　سجا کے خانۂ ویراں کے بام و در رکھیے

....

لے آیا زندگی کی طرف ذات کا سفر　　ہر درد کی نجات غمِ دہر ہی میں ہے

....

متاعِ درد بھی اپنی، جگر بھی اپنا ہے　　وہ بے وفا ہی سہی چارہ گر بھی اپنا ہے

....

عرفانہ عزیز کی شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ ان کی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کی بعض نظمیں ہمارے شعری منظرنامے میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے حرفِ اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں اور ہمارے قلب و اذہان کی وسعت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ عرفانہ عزیز کی نظمیں ان کی غزلوں سے جدا ذائقے کی حامل ہیں۔ ان کی تمام نظموں کے مطالعہ کے بعد ہم ان کو درج ذیل موضوعات میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

◆ عشق و محبت

(اہم نظمیں) لیلیٰ وطن سے خطاب، طاقِ قمر، شہبا، گل آفریں، تنہائی، انتظار، دائرے، حریف، آنچل کی حنا، محبت کا فسوں، زندگی کے ساتھی سے۔

اب عشق و محبت کے اہم ترین موضوع کے حوالے سے عرفانہ عزیز کی صرف ایک نظم '**طاقِ قمر**' ملاحظہ فرمایئے:

اُس کی پیشانی پہ رخشندہ صداقت کا وقار
جلوۂ صدق و صفا دیدۂ روشن پہ نثار

مژۂ نُور سے ہے مہرِ فلک تاب عیاں
منزلِ طاقِ قمر ابروئے برجستہ کماں

عارضِ گُل کی ضیا شمسِ زر افشاں کی طرح
غنچۂ لب کی شفق لعلِ بدخشاں کی طرح

چشمۂ خضر ہے اُس لب کے پرستاروں میں
جوئے سیمیں ہے رواں اُس کے سُخن زاروں میں

زم و شیریں و رواں اُس کے تخیّل کا فرات
اُس کے شاداب خدوخال میں فردوسِ حیات

اُس کی معصوم وجاہت کے پرستار ملک
چہرہ پرداز ہے اُس فرد کا سیماب فلک

مہ و سیّارہ ہیں تفسیرِ حقیقت اُس کی
ورقِ ماہ پہ تحریر ہے عظمت اُس کی

اُس کی قدموں کے تعاقب میں ہیں راہیں میری
صبح بردوش ہیں پھیلی ہوئی باہیں میری

اُس کی یادوں کی کرن نجمِ شہابی کی طرح
چشمِ پُرآب میں ہے آدمِ آبی کی طرح

(برگِ ریز۔ص ۷۰) ....

◆ معاشرتی آلام و مصائب

(اہم نظمیں) شہر آشوب، امین لوح وقلم، نارسائی، پتھر آنکھیں، شب چراغ، دُکھ کا زہراب، نیم وا زخموں کے پاس

معاشرے کے غم واندوہ کے حوالے سے عرفانہ عزیز کی نظم **پتھر آنکھیں** ملاحظہ فرمایئے:

شام ڈھلتے ہی صدا دینے لگیں
گھر کی دہلیز کو پتھر آنکھیں
اور سورج نے مرے کیسری آنچل کا کنارا تھاما
ہٹ گئے راہ سے برفیلے پہاڑ

دشت و صحرا مرے قدموں کے تعاقب میں چلے
زم دریاؤں کی لہروں میں ڈھلے
گیت مرے
نوکِ مژگاں پہ سمٹ آئے سمندر سارے

فصلِ گریہ نے اُٹھائیں نظریں
ایک دیوار نظر آئی شکستہ در پر

زنگ آلودہ سلاخیں تھیں فلک بوس مگر

زندگی بند دریچوں سے پرے نوحہ بلب
ڈھونڈ رہی تھی اب تک
بیتے موسم کے وہ خوشبو چہرے
جو فصیلوں کی ہری بیل کے پیچھے تھے کہیں
فرشِ گل رنگ کو بس تکتی رہیں
سنگ زاروں میں یہ پتھر آنکھیں

(کفِ بہار۔ ص ۱۴۱)

◆ حُب الوطنی

(اہم نظمیں) برگ ریز، ساعتِ دردیدہ، طاس فیروزہ، میرے محبوب وطن، ہجرت کا شجر، ہم روشوق کے ہیں خاک نشیں، ساکت ہیں نظارے سارے، دور نیلے سمندر پہ چلتی ہوا، اے نگارِ وطن

وطن سے والہانہ محبت کے حوالے سے عرفانہ عزیز کی نظم 'اے نگارِ وطن' ملاحظہ فرمائیں:

کیوں ہیں نوحہ بلب تیرے دشت و دمن
دردِ وحشت کی طالب ہے کیوں تیری جاں
کیوں ہیں محشر بداماں ترے بام و در
پھول جس میں اُمیدوں کے پھر آئیں گے
تیری نظروں میں ہے کوئی ایسا شجر؟

پھول جب بھی کھلے ہیں
ترے کنجِ لب کے چمن زار میں
میرے آنچل کی خوشبو تجھے یاد آئی بھی
آج بھی کیا ستاروں بھرے
آسماں کے تلے
گونجتا ہے دلوں کا ترانہ کوئی
یاد تجھ کو ہے پیمانِ اُلفت مرا؟
یاد تجھ کو ہے میرا فسانہ کوئی

.... (پھول دیں گے سراغ منزل کا۔ص ۸۳)

◆ رجائیت

(اہم نظمیں) دشتِ زرنگار، زندانی، تلاش، منتہائے نظر، صلیبِ درد، تلافی، پھول دیں گے سراغ منزل کا، بہارِ فردا، وہ ابن مریم

اس اہم ترین رُخ کے حوالے سے عرفانہ عزیز کی نظم 'بہارِ فردا' ملاحظہ فرمائیے:

خوش خرامی تو بجا ہے لیکن
موجۂ بادِ صبا صحن میں آہستہ سے چل
سایۂ گل میں ہے خوابیدہ ابھی
طفلکِ معصوم مرا
چاند کو چھونے کی کوشش نے رُلایا ہے اسے
لوریاں دے کے ابھی میں نے سلایا ہے اُسے

دشتِ غربت کی گرانباری میں
میں نے چاہا ہے اسے ارضِ وطن کی صورت
پاسبانی کو اگر کوئی فرشتہ آئے
بامِ گیتی پہ اڑے طیرِ چمن کی صورت

ہے مرے پھول کا مقسوم بہارِ فردا
اس کے گلرنگ خد و خال کی رعنائی سے
مشکبو ہوں گے کبھی نقش و نگارِ فردا
میری یادوں کی مہک میرے بدن کی خوشبو
اس کے پیراہنِ رنگیں کی امانت ہوگی
طالبِ نورِ سحر اس کی ذہانت ہوگی
دور اس چاند سے ظلمت کے رہیں جور و ستم
عرصۂ دہر میں راس آئے اسے وضعِ کرم
جانے کس راہ پہ اُٹھ جائیں یہ معصوم قدم
چن لیے خار ہر اک راہگزر سے میں نے
اس کو پالا ہے فقط خونِ جگر سے میں نے
اس کی قربت کے سوا دہر کی پہنائی میں
میں نے دیکھی نہیں عشرت کوئی
غم کی ارزانی سے مانوس شب و روز مرے
اور اس شوخ نے دیکھا ہی نہیں قحطِ مسرّت کوئی

سایہ افگن رہے معصوم خدوخال کی رعنائی پر
رحمتِ حق کی طلبگار مناجات مری
بھول جائے یہ مری زیست کے سب درد والم
یاد آئیں نہ کبھی اس کو حکایات مری

.... (خوشبوئے پیرہن۔ ص ۵۸)

◆ **فکروفلسفہ**

(اہم نظمیں) سوال، عکس، اپنچ، لمحوں کی منطق، منجمد جب صداؤں کے چشمے ہوئے، خود وجودیت، لہو کی پرواز، تلاش

فکروفلسفہ کے حوالے سے عرفانہ عزیز کی نظم **لمحوں کی منطق** ملاحظہ فرمائیے:

ہماری عادت سی ہو چکی ہے
ہر ایک لحظہ شمار کرنا
گئی بہاروں سے پیار کرنا
حساب لمحوں کا کرنے بیٹھو
تو وقت کا بے ریا مسافر
نئی رُتوں کا شمار کر کے
کشادہ راہوں پہ گیت گاتا
کچھ اور آگے پہنچ کے بیگانگی سے تکتا ہے وادیوں میں
ہماری بیزار کرم خوردہ فسردہ روحیں
کہ جن کے بوسیدہ پیرہن پر

دلوں کے اعداد

آرزو کے حساب سارے
رقم شدہ دیکھ کر مسافر کے نرم ہونٹوں سے گیت گاتا
ہنسی کا جھرنا
فریب خوردہ سماعتوں کا لباس چھو کر
سہانے موسم کے خواب بنتا
شفق کی بے خواب وادیوں میں گلاب چنتا
مسافتوں کی تھکن سمیٹے
اُفق میں تحلیل ہو کے رنگت نئی رُتوں کی نکھارتا ہے
ہمیں اگرچہ پکارتا ہے
رقم ہے نیلی ردا پہ لیکن
ہماری آنکھوں کا گوشوارہ
نجومِ شب کی بساط جیسے
خلاؤں کا ارتباط جیسے
ہم اپنے حاصل کو لوحِ منطق پہ دیکھتے ہیں
کہ سود لیل و نہار کیا ہے
ہر اک عددِ چشمِ وا کی صورت
حیات کا زہر خند تکتا ہے خامشی سے
کہ روحِ دوراں کا گوشوارہ
ہمارے حرفوں کی جمع و تفریق

ضرب و تقسیم سے جدا ہے

.... (کفِ بہار۔ ص۸۲)

◆ طنز

(اہم نظمیں) فقیہِ شہر سے خطاب، کافر، خود شکن، بے برگ شاخوں کی فغاں، چشمِ نم

عرفانہ عزیز کی ایک طنزیہ نظم 'فقیہِ شہر سے خطاب' ملاحظہ فرمایئے:

تیرے سینے میں رواں موجۂ الہام سہی
ساغرِ زہر مرے صدق کا انعام سہی
تفرقہ ساز روایات سے بیزار ہوں میں
دل ملامت کا ہدف کشتۂ دشنام سہی

زنگ آلودۂ ماحول نہیں میرا ضمیر
صبحِ فردا ہوں، گرفتارِ غمِ شام سہی

میرے قدموں پہ ہے خم اوجِ تمدن کی جبیں
سرگراں مجھ سے روایات کے اصنام سہی

عظمتِ فکر پہ ابہام کی تہمت تو نہیں
لفظ پر تنگیِ مفہوم کا الزام سہی

.... (برگ ریز۔ ص۹۵)

◆ انقلابی رجحان

(اہم نظمیں) اعلانِ سحر، فلک پرواز، میرے اشکوں کے ورق، سخنوری کا

عذاب، سرِ منصور کی قیمت

آپ عرفانہ عزیز کی نظم 'سرِ منصور کی قیمت' کا مطالعہ کیجیے اور اُن کے انقلابی تیور ملاحظہ فرمایئے:

خراب دشت و در تھا راہرو کوئی
قیامت سی بپا کرتا تھا اُس کا نالۂ پیہم
ہوا کا کل پہ اپنے ہونٹ رکھتی تھی
جبیں کا چاند
جھیلوں میں کنول کے پھول تکتا تھا

ہر اک صحرا میں رُسوا تھی محبت اُس دوانے کی
نہ اُس کی رہگزاروں میں بچھاتے تھے شجر سائے
نہ فصلِ رنگ و بو گرمِ تواضع تھی
گریزاں اُس کے سائے سے فصیلیں شہر جاناں کی
بہت چرچا تھا اُس کے عشق کا کوئے ملامت میں
کفِ پا سے لہو رستا تھا
تن پر تھے خس و خاشاک کے احساں
سراسیمہ رقیبوں سے، ہراساں سنگِ طفلاں سے
غمِ دوراں کی وادی میں نکل آیا تھا شوقِ نارسا اُس کا
لہو اس اجنبی کا غرق تھا اب حبِ انساں میں
ہر اک مقتل تھا اب عشرت گہِ دیوانگی اُس کو

فرازِ دار کا طالب تھا اُس کی قامتِ زیبا
اگر شانے پہ آسودہ صلیبِ آزمائش تھی
وہ حق گوئی کا دیوانہ چکانا چاہتا تھا عصرِ حاضر میں
سرِ منصور کی قیمت

(خوشبوئے پیرہن۔ ص ۱۲۰)

....

◆ مظاہرِ فطرت

(اہم نظمیں) کربِ آفرینش، ایجاد، کھوئے پرندے کی صدا، سفید پھولوں کی وادیوں میں، نیاگرا گیت گا رہا ہے، رائن سے نیاگرا تک، موسی بیل کے پھول، اپریل کا چاند، جاڑوں کی دھوپ، تتلیاں اور پرندے

عرفانہ عزیز کی فطرت سے والہانہ محبت کا اظہار **'نیاگرا گیت گا رہا ہے'** میں ملاحظہ فرمائیں:

نیاگرا گیت گا رہا ہے
سفید آبی پرندے لہروں سے کھیلتے ہیں
کبھی ہیں قوسِ قزح تلے یہ
کبھی اُبھرتے ہیں دُھند میں ڈوب کر زمرد کی طشتری میں

فضا میں جولاں ہیں آبشاروں کی پرفشاں سی وہ ننھی بوندیں
ہر ایک سیاح کی قبا جن میں بھیگتی ہے
اُچھلتے پانی کی تند بوچھاڑ
لرزتے پودوں کو دیکھتی ہے

نیاگرا انس کے آگے بڑھتا ہے، پھر گرجتا ہے
اور پلٹ کر نگارِ گیتی کو دیکھتا ہے
ہری ہری دوب میں چھپی سرمگیں چٹانیں
شکستہ ساحل کے دل سے لپٹی
ہر اک امر بیل جانتی ہے
نیاگرا سے پرے ہیں جنگل
جہاں ہوائیں بلند اشجار سے گرے، دوب پر سسکتے
فسردہ پھولوں کو چن رہی ہیں
وہ ریشمیں جال بن رہی ہیں
بنے گا گہوارہ چاند کا جو کنارِ گیتی میں آخرِ شب
جسے سنائیں گی لوریاں پھر نیاگرا کی روپہلی لہریں
نمی سے بھرپور ہے کناروں پہ خواب آلودہ نرم سبزہ
ہر ایک سو ناصبور خوشبو
تلاش کرتی ہے پیرہن اُن مسافروں کا
جو قدر پہچانتے ہیں افسونِ زندگی کی
سخاوتوں سے ہیں آشنا مہرباں نظارے
کنارِ دشت و دمن میں خودرو ہیں پھول سارے

.... (پھول دیں گے سراغ منزل کا۔ص۱۱۰)

عرفانہ عزیز کی شاعری میں ایک جانب تو موضوعات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا

سمندر جلوہ گر ہے اور دوسری جانب ان کا ہمہ رنگ اور پُر تجمل اسلوب ان کی کج کلاہ شخصیت کا غماز ہے۔ ان کی شاعری میں معرّب اور مفرّس الفاظ کا برمحل استعمال ان کی کلاسیکی روایات سے انسلاک کو واضح کرتا ہے۔ خاص طور پر فارسی تراکیب کو انہوں نے جتنے سلیقے اور ہوش مندی سے استعمال کیا ہے اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ میرے خیال میں غالب، اقبال، فیض اور راشد کے بعد عرفانہ عزیز نے سب سے زیادہ فارسی تراکیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ فارسی تراکیب استعمال کرنے والے شعرا پر عرفانہ عزیز کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے ان تراکیب میں ایک خاص طرح کی نرمی اور لوچ پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اسی باعث ان کی یہ فارسی تراکیب جمالیاتی رنگوں سے پُر ہیں۔ علی سردار جعفری کا یہ کہنا صدفی صد درست ہے کہ

> ''......عرفانہ کا عرفانِ شعر کلاسیکی اور تربیت یافتہ ہے۔ اس میں فارسی ترکیبیں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ ان ترکیبوں کا انداز غالبؔ اور اقبالؔ کی ترکیبوں سے مختلف ہے۔ ن۔ م۔ راشد کی ترکیبوں سے قریب ہے۔ لیکن عرفانہ کے اپنے ذاتی آہنگ کے ساتھ اُن کے افکار میں نرمی اور جذبے میں افکار کی صلابت ہے۔ اُن کی شاعری صرف جمالیاتی تسکین ہی کا باعث نہیں ہے بلکہ ایک روحانی کرب بھی عطا کرتی ہے۔ اُن کے شعری پیکر تر و تازہ ہیں اور آہنگ میں اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ ذاتی درد بھی شامل ہے۔ اُن کے مزاج کی یہ کیفیت اُن کو آج کے زمانے کی مردم بیزاری اور کلبیت سے دُور رکھتی ہے اور ایک لطیف آرزومندی عطا کرتی ہے۔''
>
> (علی سردار جعفری، عرفانہ کا عرفانِ شعر (دیباچہ)، کفِ بہار، لاہور، ص ۱۶)

آپ عرفانہ عزیز کی شاعری میں موجود درج ذیل تراکیب و مرکبات کا مطالعہ فرمایئے اور ان

کی غنائیت اور جمالیاتی رنگوں سے لطف اٹھایئے:

شہرِ سنگ، دشتِ زرنگار، ہنگامہ ہائے شوق، نویدِ گُل، مقتلِ حیات، طفلانِ شوخ و شنگ، کلمۂ حبیب، پندارِ حسنِ ظن، کفِ بہار، ہوائے دیارِ ستم گراں، اسرارِ ہست و بود، پیکرِ رعنائی وجود، نخلِ دار، دامنِ گُل، تنویرِ فکرِ نو، نشاطِ ثبات، غنچۂ وفا، شافیِ کرب، حرفِ شیریں، نزولِ حرفِ وفا، حدیثِ نظر، عنانِ سحر، زخمِ ہنر، انیسِ قلب، رختِ دل، نالۂ پیہم، کنارِ چشمِ فروزاں، متاعِ چشم و نظر، بحرِ رسمِ امتحاں، بامِ فلک، نقش و نگارِ روح، بے ذوقِ سوز و ساز، گوہرِ شبنم، آبروئے نظر، عارضِ گیتی، کنجِ گلشن، رہروِ دشتِ وفا، خسروِ جاں، ترکِ تمنا، نگارِ گل، طیرِ چمن، شکستِ موج، سنگِ صدا، وفورِ درد، مشعلِ پیماں، طولِ وفا، بامِ گیتی، شریکِ بزمِ تمنا، اعتمادِ نظر، کشتۂ یاس، حریفِ شوق، فکرِ سخن، شرطِ استواری، سکوتِ لب، چشمِ نیم وا، تجدیدِ اُلفت، شیشۂ پندار، آشفتۂ متاعِ نظر، رقیبِ رہروِ شب، محوِ فغاں، چشمِ امیدواراں، متاعِ قرار، بشارتِ سود، قحطِ عشرت، ہوائے شامِ غریباں، ایوانِ طلسمات، موجۂ بادِ صبا، خانۂ ویراں، حریفِ دل، شمیمِ جاں، حرفِ تسلی، رہینِ شوق، حریمِ وفا، اندازِ دگر، رونقِ شہرِ طرب، حدیثِ شوق، ذوقِ پرستش، دیارِ خیال، شہرِ رعنائی، برگِ آوارہ، شہرِ ناپرساں، شمیمِ جاں، حریفِ گردشِ ایام، تلاشِ حرفِ تسلی، عکسِ دیدۂ نم وغیرہ وغیرہ۔

عرفانہ عزیز کا شعری اسلوب عصرِ حاضر کی شاعرات سے یکسر منفرد اور جدا ہے۔ بلاشبہ اس اسلوب کی تشکیل میں ریاضت، کلاسیکی اساتذہ کا مطالعہ اور اختراعی طبیعت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ جس سے ہمارے عہد کی شاعرات ہی نہیں بلکہ اکثر شعرا

بھی نابلد ہیں۔ اب چلتے چلتے عرفانہ عزیز کے اسلوب اور موضوعات کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی گراں قدر رائے بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

"......عرفانہ کی فنی شخصیت سے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ حقائق حیات کے بارے میں اتنے حکیمانہ طرزِ فکر کے باوجود انسان کے انفرادی جذبوں سے بے خبر نہیں۔ اپنے عصر کے ساتھ عرفانہ کا رشتہ بہت گہرا سہی مگر وہ اس ہمہ گیریت میں اپنی ذات کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ذات کے مسائل کا بھی اس انداز سے اظہار کرتی ہیں کہ ان میں عمومیت اور ہمہ گیریت پیدا ہو جاتی ہے۔

(احمد ندیم قاسمی (فلیپ)، برگ ریز، لاہور، ۱۹۷۱ء)

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہمارے تخلیق کار سطحی مسائل میں اُلجھ کر خود کو بین الاقوامی ادبی صورتِ حال سے دور کر رہے ہیں۔ عرفانہ عزیز نے اپنے آپ کو جدید رویوں کا علمبردار بنانے کے لیے شعروادب کو جدید تناظر میں سمجھنے، پرکھنے اور سمجھانے کی حتی المقدور کاوش کی اور وہ اس سلسلے میں کامیاب و کامگار دکھائی دیتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اس راز سے آگاہ ہیں کہ ان کا انداز دوسروں سے جدا ہے لیکن وہ اسے معجزہ کہنے کے بجائے کوششِ پیہم کا نام دیتی ہیں۔

اندازِ سخن اپنا کہ اوروں سے جدا ہے
اک کوششِ پیہم تو ہے، اعجاز نہیں ہے

◆◆◆

♦♦♦

سیّد وصی الحسن نقاش ہاشمی کی شاعری

♦♦

جدید ناقدین کا موقف یہ ہے کہ مذہب محض اخلاقی موعظت کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے لیکن ادب و شعر کے لیے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر دو سطحوں پر رد کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ادب اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اعلیٰ مذہبی اقدار نے شعر و ادب کو جو مواد فراہم کیا ہے اہل بینش اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ پوری دنیا کے کلاسیکی اور جدید ادب کا مطالعہ فرما لیجیے آپ دیکھیں گے کہ ہر بڑی تخلیق کے پس منظر میں کوئی مذہبی فکر ضرور کارفرما ہوگی۔ عظیم تخلیق کار ادب اور معتقدات کو شیر و شکر کر دیتا ہے اور اپنی تخلیق کو مذہب سے سیراب کرنے کے باوجود مذہبی نہیں بننے دیتا۔ اس طرح اس کی تخلیق آفاقی قدروں کی حامل ہو کر اپنے مثبت اثرات مرتب کرنے لگتی ہے۔

شاعری میں عقیدے کا بھرپور اظہار کیا جاتا ہے۔ شاعر معتقدات کی قوت سے کام لے کر اپنی ذات کی تطہیر کا عمل کرتا ہے اور معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کی مقدور بھر کوشش بھی کرتا ہے۔ اس صورت حال میں اسے ایک جانب تو دینی روایات سے استفادہ کرنا پڑتا ہے اور دوسری جانب مابعد الطبیعاتی صداقتوں کے

اظہار کے لیے مقدس و مطہر شخصیات کا انتخاب بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس پس منظر میں سید وصی الحسن نقاش کی شاعری ہمارے مطالعہ کے لیے ایک نیا تناظر پیش کرتی ہے کہ اس میں مذہبی معتقدات کو سطحی جذبات سے نکال کر ایک ارفع رنگ دینے کی شعوری کاوش ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وصی الحسن نقاش نے معتقدات اور شعر کے فنی لوازم کو یکجا کر کے اپنی شاعری کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا ہے۔ ان کی شاعری کے ممدوحین کا مطالعہ کر لیجیے یہ تمام مقدس شخصیات تقلید کی اہل ہیں اور حق و باطل میں حد فاصل ہیں۔ ان شخصیات کے انتخاب سے وصی الحسن نقاش یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ کردار سازی میں افراد کی تقلید اولین ترجیح ہونا چاہیے اور مقدس شخصیات یا ان کی تعلیمات سے کسب فیض نہ کرنا نادانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

انسانی زندگی غم و نشاط سے عبارت ہے۔ غم کے اظہار کی ادبی صورت المیہ اور نشاط کی طربیہ ہے۔ وصی الحسن نقاش نے اپنے مجموعہ میں ان دونوں صورتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان کے کلام میں المیہ سلام اور طربیہ منقبت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ غم و نشاط کی کیفیات سے لبریز ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وصی الحسن نقاش نے اپنے مناقب و سلام کو کن محاسن سے آراستہ کیا ہے۔

سید وصی الحسن نقاش ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے پردادا میر انتظام علی گفتگو فارسی میں اور شاعری بھاشا زبان میں کرتے تھے۔ آپ کے دادا سید شبیر حسن صفا الہ آبادی فارسی' اردو اور ہندی زبان میں شعر کہتے تھے۔ ان کے دس ہزار سے زیادہ اشعار زیور طبع سے آراستہ ہوئے اور بہت سا کلام دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ آپ کے تایا حبیب جونپوری ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے اور ہر صنف سخن پر دسترس رکھتے تھے۔ حال ہی میں ان کا کلام ''کلیات حبیب'' کے نام سے طبع ہوا ہے۔ وصی الحسن نقاش کے والد ماجد سید وحید الحسن

ہاشمی عصر حاضر کے ایک معتبر اور مستند شاعر ہیں۔ ان کی پچاس سے زیادہ نثری و شعری تخلیقات طبع ہو کر اہل دانش و بینش سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ گزشتہ برس پروفیسر عباس رضا نے ''وحید عصر'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن کے تمام نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وحید الحسن ہاشمی آج بھی شعر و ادب کی ترویج میں مصروف ہیں۔

وصی الحسن نقاش کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے شغف تھا۔ گھر میں علمی و ادبی ماحول تھا۔ جب چہار جانب شعر و شاعری کا غلغلہ بلند ہو' گھر کی الماریاں شعری مجموعوں سے پر ہوں' ادبی رسائل اور مذہبی جرائد کی بھرمار ہو' گھر کے اندر اور باہر مشاعرے اور مسالمے منعقد ہوتے ہوں' ملاقاتیوں میں ادیبوں اور شاعروں کی کثرت ہو تو ایسے ماحول میں شعری رجحان رکھنے والا خود شعر نہ کہنے لگے تو کیا کرے' چنانچہ نقاش دس بارہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ قیصر بارہوی مرحوم کی ہدایات اور والد کی اصلاح نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ نقاش نے مشق سخن جاری رکھی اور یہ سلسلہ دیارِ غیر میں بھی آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

اُردو میں نعت نگاری کی روایت مستحکم بھی ہے اور توانا بھی۔ شعرائے قدیم کی نعتوں میں حضور اکرمؐ کے جلال و جمال کے مختلف روپ اور مظاہر جلوہ گر ہوئے جبکہ جدید شعرا نے حضرت محمدؐ کی سیرت و کردار کے چیدہ پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کاوش کی۔ عصر حاضر میں حضور اکرمؐ کو جدید تناظر میں دیکھنے اور ان کے حقیقی اور مثبت پیغام کو سمجھنے والوں میں ایک اہم نام **نقاش ھاشمی** کا بھی ہے۔

وصی الحسن نقاش ہاشمی نے نعت گوئی کا آغاز کیا تو ان کے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو وہ روایتی انداز نعت کو قبول کر لیتے یا اس میں اختراع کرتے۔ نقاش ہاشمی نے اپنی جدت طبع کے باعث نعت کی شاہراہ عام سے بچ کر چلنے کو ترجیح دی۔ یہی سبب ہے

کہ ان کی نعتوں میں نہ تو رسول اکرم کا سراپا ملتا ہے اور نہ مخصوص اور روایتی معجزات کا بیان۔ وہ رسول اکرم کو تخلیق کائنات کا موجب سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک خدا سے قریب ہونے کا سب سے بہترین ذریعہ حضرت محمدؐ سے قربت ہے۔

نکلو تو اپنے گھر سے کسی کی تلاش میں
مل جائے گا خدا بھی نبیؐ کی تلاش میں

نقاش ہاشمی اس فانی دنیا میں اجرِ رسالت ادا کرنے کے متمنی ہیں۔ ان کے خیال میں حضور اکرمؐ کی محبت ومودت کا بہترین طریق یہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو اسوۂ محمدؐ کے مطابق ڈھال لیں۔ اگر ہم آج بھی غذائے اُلفتِ محمدؐ پر انحصار کرنے لگیں تو کوئی سبب نہیں ہے کہ ہمیں درد کے اٹھنے سے پہلے ہی شفائے کامل نہ ملنے لگے۔ آپ نقاش کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور رسول اکرمؐ سے ان کی والہانہ عقیدت کے چند مظاہر دیکھئے:

یوں شہِ بطحاؐ کی اُلفت کی غذا ملنے لگی
درد کے اٹھنے سے پہلے ہی دوا ملنے لگی
آ گیا خود موت کے رُخ پر ندامت کا عرق
جب یہ دیکھا مجھ کو یثرب کی ہوا ملنے لگی
میرے ہاتھوں پر مسیحا جانے کس نے لکھ دیا
شافعِ محشرؐ سے جب مجھ کو شفا ملنے لگی
میرے دل میں آ گیا تھا اسمِ احمد کا خیال
کچھ طلب کرنے سے پہلے ہی جزا ملنے لگی

نقاش ہاشمی نعت میں روایتی اور پامال موضوعات پیش کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شعروادب میں عشقِ محمدؐ کے نت نئے دائرے بناتے رہنا

چاہیے۔ آپ ان کی ایک نعت کے درج ذیل اشعار دیکھئے اور ان کی سرکار رسالتؐ سے بے پناہ محبت محسوس کیجیے:

آپ کی چاپ پہ یہ دیدۂ بیدار رہے
کوئی رشتہ تو مرا آپ سے سرکارؐ رہے
دائرے عشق محمدؐ کے بناتے جاؤ
جب تلک ہاتھ میں اُلفت کی یہ پرکار رہے
شاہِ بطحاؐ کی محبت ہو اگر سینے میں
پھر تو ممکن ہی نہیں آدمی بیمار رہے

نقاش ہاشمی حضور اکرمؐ سے والہانہ محبت کرتے ہیں ان کے خیال میں جہاں سیرتِ رسولؐ اپنانے سے انسان دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو جاتا ہے وہاں دوسری جانب اس کی اپنی شناخت بھی اسی ذات گرامیؐ کے باعث ہوتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حضور اکرمؐ وہ لازوال ہستی ہیں کہ جو ان کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے وہ بھی لافانی ہو جاتا ہے۔ نقاش ہاشمی کی دانائی یہ ہے کہ وہ نعت گوئی کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں اور عشق محمدؐ کی موجیں انہیں اُبھار دیتی ہیں۔ آپ ان کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے عشق محمدؐ کو کس طرح منفرد زاویوں سے پیش کیا ہے۔

آنکھ میں ان کا نام ڈھالا ہے
ہم نے اس طرح قد نکالا ہے
ہم تو ڈوبے تھے نعت گوئی میں
ہم کو دریا نے خود اُچھالا ہے

عکس شاید انہیؐ کا اُبھرے گا
میری آنکھوں میں پھر اُجالا ہے
یہ سمجھ کر میں نعت پڑھتا ہوں
میرا سامع تو حق تعالیٰ ہے

....

نقاش ہاشمی نے اپنی نعتوں میں سماج کی ابتر حالت، معاشرتی پریشاں حالی، حق اور انصاف کی عدم دستیابی اور مسلمانوں کی ابتر آفاقی حیثیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے بعض نعتیہ اشعار تو شہرآشوب محسوس ہوتے ہیں۔ وہ حالیؔ کی طرح حضور اکرمؐ کے سامنے قوم کی حالت زار بھی بیان کرتے ہیں اور ان سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ کی دستگیری فرمائیں۔ آپ نقاش ہاشمی کی ایک نعت کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے کہ وہ حضور اکرمؐ سے کیا التجا کر رہے ہیں:

صرف مسلم ہی رہے دار پہ جانے کے لیے
صدیاں گزری ہیں یہ بات اُن کو بتانے کے لیے
کوئی لشکر ہی ابابیل کا ہم کو دے دیں
کچھ تو ہو فیل ابوجہل کو ڈھانے کے لیے
میں گنہ گار تھا دیکھا جو انہیں رونے لگا
مجھ کو آنسو ہی ملے خود کو بچانے کے لیے
میرے سرکارؐ یہ اُمت کا تماشا دیکھیں
لکڑیاں لائے ہیں گھر میرا جلانے کے لیے
کیسی اُفتاد یہ ہم پر ہے دہائی مولاؐ
رہ گئے ہم ہی زمانے کے نشانے کے لیے

نقاش ہاشمی معاشرتی بے کسی اور بے بسی پر نوحہ کناں ہیں۔ وہ اُمت مسلمہ کی صورتِ حال سے کبیدہ خاطر ہونے کے باوجود اس راز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جب حضورؐ کی نظرِ کرم ہم پر پڑ جائے گی تو اُمت مسلمہ کی تقدیر سنور جائے گی۔ آپ ان کی مختلف نعتوں کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا نقشہ کس طرح کھینچتے ہیں:

کیسے اقراء کی روشنی نکلے
غار کے منہ پہ اب بھی جالا ہے
نعت سے دست کش ہوئے جب لوگ
ہم نے منصب وہ اب سنبھالا ہے

....

کیسے نفرت کی چٹانوں کو میں توڑوں مولاؐ
کس طرح دل کی زمیں آج بھی ہموار رہے

....

یہ مرضی حضورؐ سے دوری کا ہے اثر
بھولے خدا کو لوگ خودی کی تلاش میں

نقاش ہاشمی ایک واضح رجائی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ بے رحم حالات کی یورش کے باوجود اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اگر آج بھی مسلمانانِ جہاں رسول اکرمؐ کی سیرت کو اپنا مطمحِ نظر بنالیں تو وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں۔

قافلہ منزلِ مقصود پہ خود پہنچے گا
شرط یہ ہے کہ نبیؐ قافلہ سالار رہے

اردو میں سلام نگاری کی روایت بڑی زرخیز ہے۔ قدیم اور جدید شعراء نے اس صنف کی آبیاری کے لیے اپنا خون جگر صرف کیا۔ عصر حاضر کے شعراء نے اس صنف کو بطور خاص حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے اور تمرد کے خلاف ہتھیار بنانے کی کوشش کی اور مقصد شہادت کربلا سلاموں کا اہم ترین موضوع ٹھہرا۔ وصی الحسن نقاش بھی جدید طرز کی سلام نگاری کے قائل ہیں۔ انہیں یہ روایت تو اپنے والد سید وحید الحسن ہاشمی سے ملی ہے جو اس دور کے ایک عظیم سلام نگار ہیں اور فن سلام نگاری پر ایک درجن سے زیادہ مضامین لکھ کر اپنی علمیت اور فہم و فراست کا لوہا منوا چکے ہیں۔ تاہم نقاش کا اشہب قلم روایتی راستوں پر گامزن نہیں رہتا بلکہ وہ دوسری راہوں کی خبر بھی لاتا ہے۔ وصی الحسن نقاش کے سلاموں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ وہ سلاموں میں ایک ایسی نئی ڈگر کے خالق ہیں جس میں عقیدہ پیغام بن جاتا ہے لیکن یہ پیغام سطحی جذبات کو سیراب نہیں کرتا بلکہ آفاقی قدروں کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ نقاش اس دور کے جدید شاعر ہیں۔ جدت طرازی کا فن انہوں نے سیکھا نہیں ہے بلکہ جدت ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ کبھی الفاظ اور کبھی مفہوم کے نئے پن سے جدت پیدا کرتے ہیں۔ اس عمل میں نہ ان کا روایت سے رابطہ ٹوٹتا ہے نہ مفہوم گنجلک ہوتا ہے۔ ان کے ایک شعر کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ یزید عقبیٰ میں خالی ہاتھ ہی جائے گا کیونکہ اس کے دامن میں کوئی نیکی نہیں ہے مگر نقاش اسی مضمون کو جدیدیت کا جامہ پہنا کر یوں کہتے ہیں:

جو چلیں بازار عقبیٰ میں یزید
تیری جھولی میں وہ سکے ہی نہیں

اب ذیل میں چند ایسے اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ وصی الحسن نقاش کی فکری اپج انہیں نئی راہوں کی خبر دیتی ہے۔ یہی سبب

ہے کہ ان کے موضوعات میں ایک تازہ پن کا احساس ملتا ہے۔ فکر کی یہ تازگی اسلوب کی سادگی سے اور زیادہ پر لطف ہو جاتی ہے۔

شفق سے روز یہ کہتا تھا دریا
تمہارے ہاتھ میں کچا گھڑا ہے

....

کربلا کا جو امیں پایا گیا
وہ لہو کے گھر میں دفنایا گیا

....

یزیدی دھوپ کا قصہ تمام ہے نقاش
دکھائی دیتا ہے وہ سائبان کرب و بلا

....

گر گئے گیلی مٹیوں کے شجر
شجرِ حق بہت توانا ہے

....

ہم سے زندہ نہیں ہے ماتم شہ
ہم تو خود اس غذا پہ پلتے ہیں

....

یہ سمجھتے تو کاٹتے نہ عدو
کٹ کے چھتنار یہ شجر ہو گا

....

کربلا دیکھ کر یقیں آیا
زندگی کو شہید اگاتا ہے

جہاں بشر کے قوانین درج ہیں نقاشؔ
برتنے بیٹھیں تو کچے گھڑے نظر آئیں

....

ظالم نظر آئے گا جہاں گھات لگائے
ہم کرب وبلا اوڑھ کے اس سمت چلیں گے

....

کربلا سے ہمیں ہے گر نسبت
زندگی کا شجر ہمارا ہے

....

خود وہ کیسا زندہ جاوید ہے
موت کو جو زندگی پہنا گیا

....

شاخ ظالم کا جو لگتا ہے امیں
اس پرندے کو اڑایا جائے

شاعر کی شاعری کو فکر بلند آہنگی اور علوئے مرتبت بخشتی ہے۔ تجربہ الفاظ وتراکیب کا پہاڑ نظروں کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے مگر فکر اس پہاڑ کے حسین نظاروں سے روح ودل میں اتر جانے والی کیفیات کو اور پر فریب اور پر اثر بنا دیتی ہے۔ فکر ہی آسمان شاعری کا ایک چمکتا ہوا ستارہ اور آنکھ کی سیپی میں تابندہ گہر ہے۔ کہیں یہ ذہن کی جھیل میں ابھرا ہوا یادوں کا کنول ہے اور کہیں روشنی کا جزیرہ ہے۔ فکر ہی شعر میں معنویت اور شاعری کو خلعتِ دربار دوام عطا کرتی ہے۔ نقاشؔ کے اکثر اشعار نہایت

سادہ اور آسان ہیں مگر ان میں تہ داری کی ایک رو جاری وساری ہے۔ یہی پہلو دار اشعار ان کی فکری توانائی کی دلیل بن گئے ہیں۔ درج ذیل اشعار کو غور سے پڑھیے تو وہ آپ کو کسی اور ہی زمین و آسمان کی سیر کرائیں گے۔

فکرِ شبیرؑ ہے بحرِ بیکراں
اس سمندر میں ہے گہرائی بہت

....

وہ تھی معراج ابن حیدرؑ جب
سجدۂ آخری ہوا ہو گا

....

شبِ عاشور یہ ثابت ہوا ہے
اندھیرا روشنی سے کم نہیں ہے

....

خود تجھے اپنائے گی شبیریتؑ
غیریت کی جنسِ ناقص کھو تو لے

....

درِ حسینؑ سے اک پل نہ رابطہ ٹوٹے
مزاجِ عشق یہیں پر جوان ہوتا ہے

....

تیر کھا کر تو ہنس دیا بچہ
اب بتاؤ کہ کون ہارا ہے

انتہا ہے کہ خدا کا باغی
عزمِ شبیرؑ سے بس ڈرتا ہے

....

ہر جگہ ظالم سے ہے الجھی ہوئی
کربلا وہ اس قدر پھیلا گیا

....

اس سنِ میں ثبوت دے خدا کا
اصغرؑ سے کوئی بڑا نہیں ہے

....

اتنا محدود کہ گودی میں بہتر لاشے
اتنی وسعت کہ نہ عالم میں سمائے مقتل

شاعری غزل میں ہو یا سلام میں، یہ نہ خبر ہے، نہ صحافت نہ یہ روزنامچہ ہے نہ کسی پارٹی یا کسی فرقے کی مبلغ۔ یہ تو خاندانوں اور قبیلوں سے اوپر کی شے ہے جسے کسی معینہ تعریف کے شکنجے میں کسا نہیں جا سکتا۔ شاعر کسی ملک، کسی قبیلے، کسی خاندان اور کسی زمین کا ہو جب شعر کہتا ہے تو اس کے لاشعور میں کوئی نہ کوئی مقصد پنہاں ہوتا ہے۔ ایک اچھا نقاد اس کے الفاظ، اس کی تراکیب اور شعروں کے در و بست سے شاعر کا مخفی عندیہ معلوم کر لیتا ہے۔ وصی الحسن نقاش کے اشعار میں ایک خاص مقصدیت ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے واقعاتِ کربلا پر ایک عمیق نظر ڈال کر زندگی کے چند حقائق معلوم کیے ہیں اور اب وہ انہی حقائق کو اپنے دور کے باسیوں کو بتانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کسی کو ان کے اس استخراج سے اتفاق نہ ہو لیکن جس تیقن اور جس دلالت

سے وہ بات کرتے ہیں اس میں صداقت ہی صداقت نظر آتی ہے۔ آپ درج ذیل اشعار پڑھ کر یقیناً ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے مثلاً جنگ کربلا کے گواہ حسینؑ اور یزیدی افواج کے نفوس ہی ہو سکتے ہیں لیکن کربلائے حسینؑ کا گواہ وہ مقتل ہے جس میں بہتر (۷۲) بے گناہوں کی بے سر لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ نقاش آج کے انسانوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جاوداں زندگی کے طلب گار ہیں تو انہیں بے گناہ قتل ہونا پڑے گا اور اس بے گناہی کی گواہی وہ قتل گاہ دے گی جہاں انہیں شہید کیا گیا ہے۔

کربلا دے گئی ہر عہد کے انساں کو پیام
بے گناہی کی گواہی کو وہ لائے مقتل

اسی قبیل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں تا کہ آپ شاعر کے حقیقی پیغام سے واقف ہو سکیں۔

کسی ظالم کی اطاعت نقاشؔ
پوری تہذیب کی رسوائی ہے

....

کہہ دے نقاشؔ یزیدوں سے کوئی
ہم ابھی دوش پہ سر رکھتے ہیں

....

شہؑ کا پیغام نسلِ نو نے پڑھا
ظالموں کا سبق پرانا ہے

....

یہ بتاتا ہے لوشا حرؑ کا
سوئے شبیرؑ سب کو آنا ہے

جب بھی انسان آنکھ کھولے گا
تیرے پیغام کا اثر ہو گا

....

اب پھر سے ضرورت ہے تری فکر کی ہم کو
ہم اپنے زمانے کے یزیدوں سے لڑیں گے

....

حسینیت کے مقاصد کو جو بھی اپنائے
اسی کے نام کے جھنڈے گڑے نظر آئیں

....

حسینی فکر سے نسبت ہے ہم کو
اسی سے شام بھی اپنی سحر ہے

....

شاعری میں اعراض کا مطلب نہ گریز پائی ہے نہ اظہار نفرت ہے بلکہ اس سے مراد وہ ناپسندیدگی ہے جو شاعر کی نظر میں معیوب معلوم ہوتی ہے مثلاً دہشت گردی ایک عمل ہے جسے کوئی ذی شعور انسان پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ لیکن اگر کوئی حکومت یا ملک ہی دہشت گردی کرے تو ممکن ہے اس ملک کے رہنے والے اس عمل پر تالیاں بجائیں مگر حساس اور باہوش افراد اسے کسی طرح خیر کی علامت قرار نہیں دے سکتے۔ عصر حاضر میں امریکہ اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر دوسرے کمزور اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے اسے کھلی جارحیت ہی کہا جا سکتا ہے اس وقت امریکہ کے اس عمل کو یزیدی عمل سے مشابہ کرنا فطرت کے عین مطابق ہے اسی لئے سلام کی فضا میں شاعر امریکہ کے اس غیر فطری اور غیر انسانی عمل پر سراپا احتجاج کرتے

ہوئے کہہ اٹھتا ہے:

مخالف ہم بڑے شیطان کے ہیں
عمل سے سب کو بتلانا پڑے گا

اب اعراض کی چند اور مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

لڑا ہے وہ کہاں باطل سے نقاشؔ
جو خوفِ مرگ سے پیلا پڑا ہے

....

کیوں پشیماں ہو مدح خوانِ یزید
ھو ہی بوئے تھے جو نکلتے ہیں

....

اسی کے پاؤں کروں گا میں قطع اے نقاشؔ
یزیدیت کو جو اپنی کمر پہ ڈھوتا ہے

....

جس کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے
وہ یزیدوں کا شجر لگتا ہے

....

وہ اقتدار اور وہ راج کیا ہوا
یزید کا وہ تخت و تاج کیا ہوا

....

اجتماعی عقیدت انفرادی عقیدت سے بہر طور بہتر ہے انفرادی عقیدت میں جھول اور مبالغہ دونوں ہو سکتا ہے لیکن اجتماعی عقیدت حسن بھی ہے اور لائق توجہ بھی۔

نقاش نے اپنے سلاموں میں جو عقیدت کے پھول کھلائے ہیں ان میں خوشبو بھی ہے اور تروتازگی بھی' رعنائی بھی ہے اور رنگینی بھی' انہوں نے ایک عاشق صادق کی طرح آلِ محمدؐ کی شان اقدس میں ایسے خوبصورت اشعار کہے ہیں کہ ان میں' شہد کی شیرینی اور صاف وشفاف حلاوت ملتی ہے۔اس سلسلے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

نقاش اس عقیدے پہ بنیاد ہے مری
سب کچھ یہاں خدا کا ہے مختار ہے حسینؑ

....

ان پہ لکھ دے جو کوئی نام حسینؑ
خشک پیڑوں پہ ثمر آ جائے

....

پورا اسلام ادھر ملتا ہے
رخ عزادار جدھر کرتا ہے

....

رئیس عالم امکاں ہے سوگوار حسینؑ
وہ ایک اشک میں دونوں جہاں سموتا ہے

....

تلاش خلد بریں میں ادھر ادھر نہ پھرو
جہاں حسینؑ ہیں خلد بریں وہیں ہو گی

....

جب بھی لیتا ہوں میں نام شبیرؑ
سارا عالم مجھے گھر لگتا ہے

غمِ حسینؑ نے نقاش یہ بتایا ہے
ستم کی جیت کسی دور میں نہیں ہو گی

....

کربلا کے حادثے میں جو واقعات رونما ہوئے وہ تاریخ کی کتابوں اور مقاتل میں بالتفصیل موجود ہیں۔ شاعر مورخ ہوتا ہے نہ نقاد وہ اپنی شاعری میں ان احساسات کو نظم کرتا ہے جن کا تعلق عمرانیات اور معاشرت سے ہوتا ہے۔ شاعر یہ دیکھتا ہے کہ واقعہ کربلا کا اثر عام آدمی کی زندگی پر کیا ہوا۔ اس کے علاوہ اس جنگ میں کس قدر انسانی قدریں پامال ہوئیں اور ان مستحکم قدروں کو پامال کرنے والے کن صفات کے انسان تھے۔ وصی الحسن نقاش نے کبھی دنیاوی جاہ وجلال کا پرچم سرنگوں ہوتے' کبھی بیعت کے خواہان یزید کو ہاتھ ملتے اور کبھی یزیدی رسم ورواج کو تاراج ہوتے دیکھا ہے۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یزیدی جبر کے مقابلے میں شہدائے کربلا کے نظم وضبط نے بڑے دوررس اثرات چھوڑے ہیں جن سے آج کے عہد کے مظلوم انسان مستفید ہو رہے ہیں اس سلسلے میں ان کے چند اشعار ہدیہ قارئین کئے جارہے ہیں:

مثلِ شبیرؑ قریں کھینچ کے لائے مقتل
ہے کوئی ایسا جو صحرا میں بنائے مقتل

....

خاک میں مل گیا سب مکرِ یزید
زندہ شبیرؑ کی سچائی ہے

....

فتح اصغرؑ ہے یہ کہ اب ظالم
مار کر تیر ہاتھ ملتے ہیں

جس کو فن شہادت آتا ہے
وہ حکومت کا سر جھکاتا ہے

....

جہاد کربلا جاری ہے اب بھی
ابھی لوٹے بہتر کب سفر سے
حسینیت کی ہر طرف پکار ہے
یزیدیت نما سماج کیا ہوا

وصی الحسن نقاش جدید فکری رویوں کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عموماً اور سلاموں میں خصوصاً علامات و استعارات کو جگہ دی ہے۔ ان کے سلاموں سے کسی بڑے علامتی نظام کی تلاش تو ممکن نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی پیش کردہ علامتیں بڑی معنویت رکھتی ہیں۔ یہ علامتیں بعض اوقات تو واضح صورت میں ابھرتی ہیں اور کہیں ان میں معنی کی تہہ داری ملتی ہے۔ ذیل کے اشعار دیکھئے کہ نقاش کس طرح علامتوں کو ایک نئی معنویت دینے میں کامیاب ہوئے ہیں:

بقا کا لفظ بنا ہے اس آدمی کے لئے
کہ جس نے شمع بجھائی تھی روشنی کے لئے

....

کربلا دے گئی ہر عہد کے انساں کو پیام
بے گناہی کی گواہی کو وہ لائے مقتل

....

شقی سے روز یہ کہتا تھا دریا
تمہارے ہاتھ میں کچا گھڑا ہے

شب عاشور یہ ثابت ہوا ہے
اندھیرا روشنی سے کم نہیں ہے

....

جب رواں غم کا کارواں ہو گا
عزمِ کونین پھر جواں ہو گا

....

شہؑ کے دل پر چوٹ یہ گہری لگی
سینۂ خوشبو میں جب برچھی لگی

....

فنا سے دور بقا کے نگر بسائے ہیں
زمینِ عشق نے کیا کیا شجر اگائے ہیں

....

کسی ظالم کی اطاعت نقاشؔ
پوری تہذیب کی رسوائی ہے

....

وصی الحسن نقاش نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا تخلیقی جوہر سلاموں میں ابھر کر سامنے آیا ہے ان کے اشعار اتنے مقدس اور معزز ہیں کہ جس کے موسم میں انسان تو انسان ہیں پرندوں کی دعا بن جاتے ہیں۔ ان کا لہجہ حیات افروز ہے۔ ان کے الفاظ موتیا کے پھول کی طرح مہک دیتے ہیں۔ ان کی تراکیب الفاظ سے معنی کے بند در کھل جاتے ہیں۔ ان کے محاورے صرف زبان کو چاشنی نہیں دیتے بلکہ معنویت کی اندھیری کوٹھری میں جگنو بن کر چمکتے ہیں۔ ان کی شاعری کی متحرک

علامات ہمارے عہد کی بے یقینی میں لہو بن کر تحلیل ہو جاتی ہیں۔

نقاش کی سب سے بڑی خوبی ان کے اشعار کی سلاست ہے۔ ان کا کلام دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ ایک شفاف دریا رواں دواں ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ اردو محاورات بھی استعمال کئے ہیں یہ محاورات جہاں استعمال ہوئے ہیں شعر کے معنی میں اور اضافہ ہو گیا ہے چند اشعار ملاحظہ کریں جنہیں محاورات کے استعمال نے دو آتشہ کر دیا ہے۔

یوں تو تبدیلی اجل لائی بہت
اک ہنسی اصغرؑ کی کام آئی بہت

....

غمِ شبیرؑ میں جاں دیتے ہیں
ہم نے جینے کی قسم کھائی ہے

....

دیکھ کیا دیتے ہیں تجھ کو پنجتنؑ
پہلے تو آلِ نبیؐ کا ہو تو لے

....

مدحِ شبیرؑ ہے نقاش کا فن
اسی چوٹی کو وہ سر کرتا ہے

....

یزید وقت کا کس وقت سامنا ہو جائے
ہم اس لئے علمِ کربلا اٹھائے ہیں

....

یا خدا اتنا معتبر کر دے
زیر لگتا ہوں تو زبر کر دے

....

اردو میں منقبت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ قدیم شعراء عقیدت کا سہارا لے کر آلِ رسولؐ کی منقبت کرتے تھے۔ اس میں دینی حسیت کو اولیت دی جاتی تھی۔ عصر حاضر میں منقبت کی روایت کو جدت کا رنگ دیا گیا۔ ممدوحین کو دیکھنے اور دکھانے کا ایک نیا وتیرہ اختیار کیا گیا۔ اب منقبت نگاری بھی جدید شعری رویوں کی ترجمان بن گئی ہے اور منقبت نگار قوم کی کردار سازی کے لئے ایسی مقدس اور پاکیزہ شخصیات کو اپنا موضوعِ سخن بناتا ہے جس کی تقلید کر کے قوم راہ راست پر آ جائے۔ ان منقبت نگاروں میں وصی الحسن نقاش کا نام بھی آتا ہے۔ جنہوں نے اپنی منقبتوں میں عصری حسیت اور معاشرے کے آشوب کو بھی جگہ دی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈاکٹر آغا سہیل کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> ''ہمارے جدید دور کے شعرا اولاً تو قصیدے اور منقبت کی طرف رجوع نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو محض اشک شوئی کے لیے۔ وصی الحسن نقاش کے ہاں ایک تو عقیدت و ارادت کے جذبات موجزن ہیں جن میں کہیں کہیں مبالغہ بھی نظر آتا ہے جو فنی تقاضوں کے لحاظ سے جائز ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ عام نوجوان شعرا کے علی الرغم اعلیٰ قسم کے احساسات اور جذبات پیش کرتے ہیں جس میں اسفل کی کہیں گنجائش نہیں ہو سکتی۔

(آغا سہیل، ڈاکٹر (مقدمہ) ''کوئی صحرا میں بنائے مقتل'' (وصی الحسن نقاش) لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، صفحہ ۱۵

نقاش کی منقبتوں میں ایمان کا شعور اور ممدوحین سے والہانہ وابستگی کے اجزا

نمایاں نظر آتے ہیں۔ درحقیقت ایمان اور وابستگی اصل اور فرع کا درجہ رکھتے ہیں اور ان دونوں کا الگ الگ تجزیہ بے سود ہو گا کیوں کہ جس قدر ایمان محکم ہو گا اسی قدر ایمان سے وابستگی بھی غیر متزلزل ہو گی۔ نقاش نے کہیں بھی اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دوٹوک الفاظ میں اس کا اظہار کر دیا ہے۔ ان کی ایمانی کاوش کی چند مثالیں دیکھیے:

اس کا کوثر اس کی فردوس بریں
جس کا دل آلِ نبیؐ کے ساتھ ہے

....

درحقیقت وہ نبیؐ کے ساتھ ہے
جو بشر مولا علیؑ کے ساتھ ہے

....

لاکھ ہم پڑھ لیں کتابیں لیکن
جب حیدرؑ سے سبق آتا ہے

....

جس کے دل میں نہ علیؑ کی ہو ولا
وہ کہاں آدمی کہلاتا ہے

....

مرتبہ اس کا بڑا ہے نقاشؔ
علم کے در پہ جو آ جاتا ہے

....

حبِّ علیؑ کا ایک بھی ذرہ ہو جس کے پاس
وہ شخص کائنات میں سب سے امیر ہے

....

نقاش ان ہتھیلیوں کے نقش پر نہ جا
عشقِ علیؑ نصیب کی سیدھی لکیر ہے
سکونِ قلب کی حالت وہی بتائے گا
کہ جس کا کرب و بلا سے کبھی گزر ہو جائے

....

سوچتا ہوں کہ رکھوں آنکھوں میں
نام حیدرؑ بھی تو بینائی ہے

....

حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار شاعر کے ایمانی شعور کا پتہ دیتے ہیں اتنا مستحکم ایمان رکھنے والا اپنے قلب کی وابستگی میں بھی پختہ اور آزمودہ کار ہونا چاہئے۔ اب ذرا شاعر کا اپنے ممدوحین سے وابستگی کا اندازہ بھی کرلیں تاکہ شعری اصلیت کا راز کھل کر سامنے آجائے اور شاعر کی شعری گرفت کا مرقع بھی سامنے آجائے۔

ہم سے چھن سکتی نہیں حبِّ علیؑ
یہ محبت زندگی کے ساتھ ہے

....

میں پریشان نہیں ہو سکتا
اسمِ حیدرؑ مجھے بہلاتا ہے

ذکر حیدرؑ سے مرا ناتا ہے
ان کے خورشید بھی گن گاتا ہے

....

حقدار کو دلائیں گے ہم اس کا حق یہاں
اتنی سی بات کے لئے یومِ غدیر ہے

....

نقاش کو بس اتنا بتا دیجئے حضور
کب تک ملا کرے گی سزا اس کو دار کی

....

اب آپ نے غور کیا ہوگا کہ شاعر کے قلب میں جس ایمان و آگہی کا سورج چمک رہا ہے اس سے اس کا رشتہ نہایت مضبوط و مستحکم ہے اگر دونوں میں ذرہ برابر بھی کمی ہوتی تو اتنے شیریں اور جاندار اشعار کا معرضِ وجود میں آنا ناممکن ہوتا کیونکہ شعر بہتر ہوں یا کمتر حقیقت کا آئینہ ہوتے ہیں اور ہم انہی اشعار سے شاعر کی نفسیات کا ادراک کر سکتے ہیں۔

کسی زمانے میں قطعات دو سے پانچ سات اشعار پر مشتمل ہوا کرتے تھے جن کا مقصد کسی ایک خیال کو تفصیلاً بیان کرنا تھا اگر ہم اسے ایک چھوٹی سی نظم کہہ دیں تو خلاف واقعہ نہ ہوگا۔ جدید دور میں قطعہ کی شکل رباعی سے ملتی جلتی ہے جس میں دو شعر ہوتے ہیں۔ قطعہ کا چوتھا مصرع قطعہ کی جان ہوتا ہے۔ جو خیال آخری مصرع میں ہوتا ہے اسی کی رعایت سے اوپر کے تین مصرعے کہے جاتے ہیں قطعہ کی بحر کی کوئی حد نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ اختتامی مصرع اچھوتا ہونا چاہئے۔ غزل اور سلام کہنے والے

شاعروں کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ جس خیال یا جس نکتے کو چاہیں جس طرح اپنے اشعار میں پیش کر سکتے ہیں اس لئے انہیں قطعات لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن قوافی کی تنگی کی وجہ سے اکثر قطعات وجود میں آتے ہیں کیونکہ قطعہ میں صرف دو قوافی کا استعمال ہوتا ہے۔ وصی الحسن نقاش کے قطعات بڑے کاٹ دار ہیں نقاش الفاظ کی آری سے انسانی احساسات کے پردوں کو چاک کرتے جاتے ہیں اور آخر میں اپنی تمام کوششیں ایک نکتے پر مرکوز کر دیتے ہیں اس نکتے میں کسی ممدوح کی کوئی خاص صفت' اپنی درد بھری عقیدت' قوم کے نام کوئی پیغام یا کسی دشمن اسلام کو تنبیہ ہوتی ہے۔

قطعات کے چند مرکزی خیالات ملاحظہ فرمائیں:

تیرے دشمن کو بھی معلوم ہے یہ
تیرا دروازہ کھلا رہتا ہے

....

خون شبیرؑ کی یہ ہے فطرت
اس کا نسلوں میں اثر آتا ہے

....

کوئی تیرا نہیں مثیلِ علیؑ
تو تو مر کر بھی کامیاب رہا

ہماری قومیت کرب وبلا ہے
ہمیں الفت ہے اپنی سر زمیں سے

....

کیا مجھے یوسفوں کی قیمت سے
میں دیارِ نجف میں بکتا ہوں

....

جو نہ مانے علیؑ کو اپنا امام
وہ سمجھ لو ہلاک ہوتا ہے

....

ہو جا شبیرؑ کا پیرو ورنہ
تو یزیدوں میں گنا جائے گا

....

حبِّ حیدرؑ جہاں ملے نقاشؔ
اپنا سر کاٹ کر وہیں رکھ دو

....

اس نئے عہد کا نقاشؔ تقاضا ہے یہی
صبرِ شبیرؑ کی شمشیر اٹھائی جائے

....

کہیں نہ ہاتھ یزیدوں کے اور بڑھ جائیں
ہمیں حسینؑ کے ہاتھوں میں ہاتھ دینا ہے

....

کیوں نہ کاٹیں آج کے ظالم کا ہاتھ
کیا ہمیں نسبت نہیں شبیرؑ سے

....

زندگی بھر کی کمائی کہاں نقاشؔ گئی
پاس اپنے یہی سرمایۂ شبیریؑ ہے

اس معروضے کے آغاز میں ہم نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مذہب اور شاعری کی ازلی اور ابدی رفاقت ہے اور عظیم شاعری مذہب کے سائے میں نشو ونما پاتی ہے۔ اگر کوئی شاعر دینی روایات کے حوالے سے مقدس صداقتوں کا ذکر کرے تو اس کی شاعری لافانی ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے ہم نے وصی الحسن نقاش کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اور اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وصی الحسن نقاش بیسویں صدی کے عصری حقائق کا شعور بھی رکھتے ہیں اور مذہب کی مابعد الطبعیاتی قدروں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں دینی اقدار کو عصری مسائل کے حوالے سے دیکھنے اور دکھانے کی سعی مشکور کی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر احمد عقیل روبی کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

> ''شاعری تو ان جذبات و احساسات کو لفظی پیکر دینے کا نام ہے جنہیں روح کی ان دیکھی انگلیاں بنتی ہیں۔ شاید شاعری کو اسی لیے Breath of Soul کہا جاتا ہے۔ وصی الحسن نقاش نے روح کی ان سانسوں کو اظہار کے تخت پر بیٹھ کر بڑے خلوص کے ساتھ عقیدت کے دھاگوں میں پرویا ہے عقیدت پر رکھی شاعری کی بنیاد ہمیشہ چاند بن کر وقت کے ماتھے پر چمکتی رہی ہے۔ ہومر ہو یا ورجل ملٹن ہو یا انیس ہر عہد نے ان کی عظمت کو سلام کیا ہے۔ نقاش کی شاعری عقیدے اور رومانویت کا خوبصورت ''Blend'' ہے۔ جہاں یزیدیت کی فنا اور حسینیت کی بقا کا ذکر آتا ہے روح نکھر جاتی ہے۔ جہاں دل رومانویت کا ملبوس پہن کر آتا ہے رگوں میں رکا لہو آنکھیں کھول کر گنگنانے لگتا ہے۔ نقاش کا

لہجہ انسانی زبان انسانی' دکھ سکھ انسانی۔ یہ شاعری ایک انسان کی انسانوں سے بات چیت ہے' دلچسپ' پرمغز' پرمعنی بات چیت ہے۔ اس میں نہ کوئی الجھن ہے نہ کوئی ابہام اور نہ مبالغہ۔ بزرگوں نے اچھی شاعری کی یہی تعریف کی ہے۔ نقاش کی شاعری اس تعریف پر پوری اترتی ہے۔

(احمد عقیل روبی (فلیپ) کوئی صحرا میں بنائے مقتل (وصی الحسن نقاش) لاہور: الحسن پبلی کیشنز ۱۹۹۹، صفحہ پشت)

وصی الحسن نقاش ھاشمی ایک جدید ذہن رکھنے والے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کی وراثت کے امین بھی ہیں۔ وہ مغربی کلچر میں رہتے ہوئے بھی مشرقی اقدار و روایات کو سینے سے لگائے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انہوں نے شعر گوئی کی مشق جاری رکھی اور کلاسیکی اور جدید شعراء کے کلام سے مستفید ہوتے رہے تو آسمان شعر و ادب پر ایک چمکتے دمکتے ستارے کا اور اضافہ ہو جائے گا اور نقاش کی یہ دیرینہ تمنا پوری ہو جائے گی کہ

اسی لئے تو میں ذکرِ حسین کرتا ہوں
کوئی ہنر تو ہو جس میں بڑے نظر آئیں

◆◆◆

تسنیم عابدی کی شاعری میں حزنیہ عناصر

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی معاشرہ تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والوں کی ذہنی ترقی کی رفتار رک جاتی ہے اور لوگ بحرانی کیفیات کا شکار ہو کر غیبی امداد کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ معاشرے کے دیگر شعبوں کی طرح ادب پر بھی اس بحرانی دور کا اثر پڑتا ہے اور اُس عہد میں تخلیق ہونے والا ادب زیادہ دوررس اثرات مرتب نہیں کر پاتا۔ ادب کی اس ابتر صورتِ حال میں اگر کوئی شاعرہ اپنے افکار و نظریات کی پیش کش میں سنجیدہ دکھائی دے تو حیرت بھی ہوتی ہے اور تعجب بھی۔ حیرت اس بات پر کہ اس بحرانی دور میں کوئی شاعرہ مردانہ معاشرے کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور تعجب اس بات پر کہ اس کی باتوں میں گہرائی اور گیرائی بھی موجود ہے۔ اس شاعرہ کا نام تسنیم عابدی ہے جو اپنے شعری مجموعے "**تخلیق**" کے ساتھ میدان شاعری میں اتر رہی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی شاعرانہ قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے ہاتھ میں میزان کردار ہے۔

اپنی قیمت کا بس اندازہ لگانے کے لیے
کتنے خوش فہم ہیں کردار لیے پھرتے ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ تسنیم عابدی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کس پیرائے میں کرتی ہیں اوران کے کردار کی مہک کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔

شاعری میں اظہارِ ذات کے کئی طریقے ہیں۔ بعض اوقات شعرا ذاتی مسائل کو آفاقی مسائل بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور شاعرات کا تو مسئلہ ہی مختلف ہے کہ وہ چہروں کی طرح مسائل پر بھی پردہ ڈال دیتی ہیں۔ تسنیم عابدی کا معاملہ دیگر شاعرات سے جُدا ہے کہ وہ آفاقی مسائل کو بھی ذاتی مسائل سمجھتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ دیگر شاعرات کا شعری سفر ذات سے کائنات کی طرف ہوتا ہے جبکہ تسنیم عابدی کا شعری سفر کائنات سے ذات کی طرف ہے۔ یہی سبب ہے کہ آفاق کی تمام تر سرگرمیاں ان کے انفس میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ جب تسنیم عابدی اپنی ذات کا حصار توڑتی ہیں تو انہیں ایک نئی کائنات مل جاتی ہے گویا ان کی ذات میں کئی کائناتیں پوشیدہ ہیں اور ان کی یہی تخلیقی آوارگی انہیں بے چین و بے قرار رکھتی ہے۔

حصارِ ذات سے نکلی تو کائنات ملی
عجیب ہوں مری آوارگی نہیں جاتی

دانش مندوں کا کہنا ہے کہ اس کائنات کا سب سے مشکل کام اپنی ذات کا عرفان ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم سب اپنی شناخت تک کھو بیٹھے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہم کسی دوسرے کے کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنے ہونے کی اہلیت سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ تسنیم عابدی کی شاعری میں انسانی ہجوم میں اپنے آپ کو دریافت کرنے کا عزم ملتا ہے۔ وہ اس بات پر انتہائی غم زدہ ہیں کہ ان کی زندگی اوران کے معاشرے نے انہیں اپنا نہیں ہونے دیا۔

پوری کوئی بھی تمنا نہیں ہونے دیتے
لوگ مجھ کو مرا اپنا نہیں ہونے دیتے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تسنیم عابدی کو کس چیز نے اپنا نہیں ہونے دیا۔ اس کا سادہ جواب تو یہ ہے کہ ۔

عمر رشتوں کے تقاضوں کو سنبھالے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

تاہم بنظر غائر دیکھا جائے تو تسنیم عابدی کی پوری شاعری میں درد و غم کا احساس نمایاں ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ کو چشم احساس کا ٹپکا ہوا آنسو قرار دیتی ہیں اور کبھی دشت تنہائی کا بھٹکا ہوا آہو۔ آپ ان کی اس غزل کے تین اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ اپنی ذات کو کس تناظر میں دیکھتی ہیں ۔

چشم احساس سے ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں
تو ہے گر پھول تو پھر پھول کی خوشبو میں ہوں
کس قدر مجھ سے گریزاں ہے یہ وحشت میری
دشتِ تنہائی میں بھٹکا ہوا آہو میں ہوں
خامشی سے مری رُک جائے گی یہ نبضِ حیات
اور لب کھولے تو اک نعرۂ یاہو میں ہوں

تسنیم عابدی کی شاعری میں غم و الم کی ایک کیفیت اس وقت ابھرتی ہے جب معاشرے میں بطور عورت ان کی شناخت اور پزیرائی نہیں ہوتی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اس مردانہ معاشرے میں عورت کو اس کا جائز مقام بھی نہیں دیا گیا۔ آپ ان کی اس غزل کا مطالعہ فرمایئے اور اس میں موجزن دردمندی کی لہر محسوس کیجیے۔

سوچا نہیں گیا مجھے سمجھا نہیں گیا
تاریخ میں کبھی مجھے لکھا نہیں گیا
میرے ہنر میں عیب نظر آئے اس لیے
معیار پر کبھی مجھے پرکھا نہیں گیا
میں اپنے حق کے واسطے تنہا کھڑی رہی
میزانِ عدل پر مجھے تولا نہیں گیا

غیرت کے نام پر کبھی حرمت کے نام پر بکتی رہی زمانے میں، بکنا نہیں گیا
میرے لیے سزا یہی تجویز کی گئی زندہ رکھا گیا مجھے مارا نہیں گیا
جنگوں میں تھی میں مالِ غنیمت کے طور پر میرے لیے کبھی مجھے بانٹا نہیں گیا

ہر موڑ کاٹ کاٹ کے تسنیمؔ ہو گئی
تم سے تو ایک موڑ بھی کاٹا نہیں گیا

تسنیم عابدی حساس دل رکھتی ہیں۔ وہ عورت کے دُکھوں کو نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ انہیں بلند آہنگی کے ساتھ بیان کرنے کا عزم و حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں میں محض عورت کی درد بھری کہانیاں ہی بیان نہیں ہوئی ہیں بلکہ انہوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ عورت کے نفسیاتی اور عمرانی مسائل کو بھی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کریں۔ اس سلسلے میں آپ ان کی نظم ''ریت کے بگولے'' ملاحظہ فرمایئے:

کھنکتے قہقہوں میں
چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں
دہکتے عارضوں پہ
بالیوں کی مسکراہٹ میں
شجر کی سرسراہٹ میں
مری ہستی بھی خالی اور یہ جذبے بھی فانی ہیں
مسرت ختم ہو جاتی ہے غم کی دھوپ چھاتی ہے
کلائی خالی ہو جاتی ہے چوڑی ٹوٹ جاتی ہے
گلوں کی پتیاں جھڑتی ہیں، شاخیں سوکھ جاتی ہیں
سراغِ زندگی میں آنکھیں میری تھک سی جاتی ہیں

تو میں تھک ہار کر اِک درد کی دہلیز پر بیٹھی
زمین و آسماں کے درمیاں کچھ تکنے لگتی ہوں
بگولے ریت پر پھر رقص کرتے مجھ سے کہتے ہیں
تمہیں کیا زیست کے مفہوم اور معنی سمجھنے ہیں
ذرا سی خاک اڑا کر تم فضاؤں میں اڑا دینا
یہی ہے زندگانی اور یہی ہستی تمہاری ہے

ہمارا رقص جاری ہے، ہمارا رقص جاری ہے
بھٹکتی روح کی صورت ہمارا رقص جاری ہے

تسنیم عابدی اس بھری پُری دنیا میں تنہائی کا شکار ہیں۔ اس تنہائی کے کئی روپ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس لیے بھی تنہا محسوس کرتی ہیں کہ ان کے ہم مزاج و ہم خیال لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کی تنہائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ خاندان میں خود کو تنہا محسوس کرتی ہیں۔

ایسی تنہائی ہے کہ سوچتے ہیں
کیا کوئی خاندان میں نہ رہا

وہ اکیلے ہی تنہائی کا زہر پیتی ہیں۔ اس غم انگیز کیفیت میں بھی وہ دولت درد کو اپنی ذات میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔ انہیں علم ہے کہ غم دم کے ساتھ ہے اور انہیں چراغ شب غم کے ہاتھوں اسی طرح جلتے رہنا ہے۔ اپنی اس بے بسی و بے کسی کو انہوں نے درج ذیل غزل میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔

ہم تماشا ہوئے یوں اہلِ کرم کے ہاتھوں — وحشتِ دل ٹوٹ گیا آ ہوئے رم کے ہاتھوں
سوچتے ہیں تجھے اب اور کہاں ڈھونڈیں ہم — عقل بھٹکی ہے سدا دیر و حرم کے ہاتھوں

میں بدل جاؤں تو حیرت کی کوئی بات نہیں کیا سے کیا ہو گیا کعبہ بھی صنم کے ہاتھوں
تو جلا ڈالے تمناؤں کا دامن نہ کہیں مجھ کو بجھنا ہے چراغِ شبِ غم کے ہاتھوں
اپنی مرضی کا کہاں ہے یہ وجودِ ہستی اک کھلونا ہوا انسان عدم کے ہاتھوں
لوگ سچے ہی سرِ دار لٹکتے دیکھے حرفِ حق کھینچ گئے قرطاس وقلم کے ہاتھوں

بات ہونٹوں پہ رہی، کہنے نہ پائے تسنیمؔ
ہم تو مجبور رہے ظلم و ستم کے ہاتھوں

تسنیم عابدی کے خیال میں یہ دنیا محض ایک تماشا ہے اور بے بس عورت تماشائی۔ اس عورت کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ کٹھ پتلی کی طرح اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہمارے معاشرے کی عورت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ تماشائی سے تماشا بن گئی ہے۔

ہے تماشے کا اختتام یہی
جب تماشا بنے تماشائی

آپ ان کی مختلف غزلوں کے درج ذیل چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ وہ تماشے اور تماشائی کو کس تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی سعی کرتی ہیں۔

نظر حیران ہے کیا ہو رہا ہے تماشے پر تماشا ہو رہا ہے

....

تماشے میں پسِ پردہ بھی کردار بے بس تھے سحر کاری تھی ساری ہم اداکاری نہ کرتے تھے

....

دیدۂ شوق تو آمادہ رہا ہے ہر دم کبھی خود کو وہ تماشا نہیں ہونے دیتے

....

راز کا بزم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا ہم نے اپنے کو تماشا کبھی ہونے نہ دیا

تسنیم عابدی اس آب وگل کی دنیا میں سلیقے سے زندگی بسر کرنے کی متمنی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کبھی تماشا نہیں بننے دیا۔ یہ مثبت تخلیقی عمل سہل نہیں۔ اس میں صبر وضبط کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہمت وتوانائی کی بھی۔ وہ اپنے دل سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

ضبط کے سارے مراحل سے گزر جا' اے دل
دولتِ درد کو دنیا سے نہاں رکھنا ہے

تسنیم عابدی ذات کا کرب سہتی ہیں مگر اپنی تکلیفوں کو منظر عام پر لانے سے گریزاں ہیں۔ یہ ان کی خوش دلی بھی ہو سکتی ہے اور دریا دلی بھی۔

ستم کو سہتے رہو خوش دلی سے اے تسنیم
ہمارے دل سے یہ دریا دلی نہیں جاتی

یہاں یہ امر پیش نگاہ رہے کہ تسنیم عابدی زندگی گزارنے کو ایک فنکاری تصور کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے بھی فنکاری کرنا پڑتی ہے گویا اس کی زندگی ایک اداکاری کے علاوہ کچھ نہیں۔ تسنیم عابدی اپنی نظم "زندگی ہے فنکاری" میں انکشاف کرتی ہیں۔

کھلی ہوا میں چلو سانس لیں کہ کمرے میں
گھٹن بہت ہے، اُداسی ہے، سوگواری ہے
ہماری آنکھوں میں برسوں کی شب بیداری ہے

کبھی کبھی تو یہ احساس بڑھتا جاتا ہے
کہ جیسے زندگی کٹتی ہے رات کی مانند
اک ایسی رات کو جس کو ہمیں گزارنا ہے

بغیر نیند کے خوابوں کے اور تاروں کے
تمام رات کا حاصل ہو کروٹیں لینا

یہ کروٹوں کا سفر کس قدر کٹھن ٹھہرا
شبِ حیات کو طے کرنا ایک فن ٹھہرا
سو ہم بھی رات گزاریں گے اس طرح اپنی
کہ کروٹوں کی شکن زندگی کی چادر پہ
کوئی بھی دیکھنے والا نہ دیکھ پائے گا
ہماری آنکھ میں آنسو کبھی نہ آئے گا
شبِ حیات کا فن آتے آتے آئے گا

تسنیم عابدی کی ذات میں غموں کی ایک کائنات آباد ہے۔ اس غم کدہ میں معاشرتی آلام مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ وہ ایک حساس عورت کی نگاہ سے کائنات کو دیکھتی ہیں تو انہیں کُل کائنات سیہ پوش دکھائی دیتی ہے۔ انہیں بزم جہاں میں ہر چیز دکھ اور درد کی علمبردار نظر آتی ہے اور وہ چلا اٹھتی ہیں۔

پتے پتے پہ ہے شبنم
بزمِ گل ہے بزمِ ماتم

ان کے خیال میں ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں سے امن وسکون رخصت ہو گیا ہے۔ معاشرتی ابتری نے انسان کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ خوشی اور خوشحالی نام کی ہر چیز معاشرے سے ناپید ہو گئی ہے اور زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔

جب خوشی میں کوئی خوشی نہ رہی
زندگی جیسے زندگی نہ رہی

اس صورتِ حال میں تسنیم عابدی افسردہ ودل شکستہ ہو کر بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہیں کہ مالکِ دو جہاں ہی ہمارے معاشرے کو خوش حال بنائے۔ وہ اپنے قارئین سے استدعا کرتی ہیں کہ

پڑھتے رہیے نمازِ خوف کہ اب
کوئی امن و امان میں نہ رہا

تسنیم عابدی اس ذاتی کرب اور معاشرتی آلام میں بھی رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ ایک جانب تو وہ معاشرتی رویوں کا رونا اس لیے بھی نہیں روتیں کہ سارا جہان ہی غم والم کا شکار ہے۔

گردش دوراں کا کیا رونا
گردش میں ہے سارا عالم

اور دوسری جانب انہیں خبر ہے کہ اگر وہ معاشرے کے ظلم وستم کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گی تو ان کا پورا وجود شکست خوردہ ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ معاشرے کی چکی میں پسنے کے باوجود وہ نہ تو اپنے لہجہ کو شکستہ ہونے دیتی ہیں اور نہ اپنے رویوں کو زنگ آلود۔ یہ طرزِ احساس رجائیت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

ہم کو اس گردشِ دوراں نے کہیں کا نہ رکھا
پھر بھی لہجے کو شکستہ کبھی ہونے نہ دیا

تسنیم عابدی معاشرے کی اچھی اور پائیدار قدروں کی بحالی چاہتی ہیں۔ وہ اپنے معاشرے میں حق گوئی، نیکی، حیا، خلوص، مروت اور پاکبازی جیسی اعلیٰ قدریں رائج کرنے کی متمنی ہیں لیکن جب معاشرہ ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہے تو وہ خون کے آنسو رونے لگتی ہیں۔ آپ ان کی نظم ''پرانے سکے'' ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح مختلف علامات، تلمیحات اور اشارات کے ذریعہ اپنا موقف اُجاگر

کرنے کی بلیغ سعی کی ہے۔

اصحاب کہف کی صورت میں
بازارِ عالم سے اکثر
جب کوئی خوشی لینا چاہے
تو چھوٹے بڑے سارے تاجر
یہ کہہ کے ہمیں لوٹاتے ہیں
وہ سکے جو کہ کیسہ میں
ہیں آپ سنبھالے آج تلک
حق گوئی، مروت اور خلوص
تہذیب، حیا اور دلداری
یہ سکے بڑے پرانے ہیں
ہیں آپ بڑے دقیانوسی
یہ سکے اب کہاں رائج ہیں
آپ اپنے غارِ ہستی میں جا کر آرام سے سو جائیں

تسنیم عابدی کی شاعری میں کربلا کا استعارہ ایک نیا جہانِ معنی لیے ہوئے ہے۔ جب وہ ذاتی دکھوں اور معاشرتی مصائب کے باعث تنہائی کا شکار ہو جاتی ہیں تو کربلا کی یادوں سے اپنے دل کے عزا خانے کو سجا لیتی ہیں۔ اس صورت حال میں وہ تنہا کر بھی تنہا نہیں رہتیں۔

سر جو نیزوں پہ فروزاں ہیں وہ ہیں ساتھ مرے
میری تنہائی کو تنہائی نہ سمجھا جائے

کرب وبلا کا واقعہ حق وصداقت کے علمبرداروں کے لیے رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تمام زمینیں ''کربلا'' بن چکی ہیں اور ہر یوم اپنی کیفیت کے اعتبار سے ''عاشورہ'' ہے۔ تسنیم عابدی کا موقف یہ ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔ ظالم مظلوم کو سر دار چڑھا رہا ہے اور نیزوں کی نوک پر سروں کی فصلیں تیار کھڑی ہیں۔

گلی کوچوں میں اب مقتل سجا ہے
جدھر دیکھو اُدھر اک کربلا ہے

تسنیم عابدی کی شاعری میں مقتل' فرات' تشنگی' نوکِ نیزہ' دریا' تشنہ دہن' عزاداری' کوفہ' بیعت' شام' خیمۂ دل' خونِ ناحق اور اسی قبیل کے بیسیوں الفاظ احساس دلاتے ہیں کہ وہ کربلا کے واقعہ سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ اسے جدید تناظر میں دیکھنے کی عادی ہیں۔ وہ کربلا کو حق وناحق کے درمیان حدِ فاصل سمجھتی ہیں۔ آپ ان کی غزلوں کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے واقعۂ کربلا کو کس طرح اپنی ذات اور معاشرے سے منسلک کرنے کی مشکور سعی کی ہے۔

کسی طرح سے مری تیرگی نہیں جاتی — لبِ فرات کی اب تشنگی نہیں جاتی

....

شرم سے ڈوب گیا مہرِ منور آخر — نوکِ نیزہ پہ چمکتا جو کوئی سر ٹھہرا

....

کسی تشنہ دہن کے بعد ہم نے — بھرے دریا کی دیکھی تشنگی ہے

....

سر کٹانے کی سعادت پہ نہ مجبور کرے — پھر یہ کوفہ کسی بیعت پہ نہ مجبور کرے

....

اس بار مدینے ہی میں در آیا تھا کوفہ
اس بار کیا ہم نے سفر اور طرح کا

....

شام تنہائی نے یہ حشر اٹھایا کیوں تھا
خیمۂ دل کی طنابوں کو جلایا کیوں تھا

خون ناحق مرا مٹی میں ملانے والو
سر سوالی ہے کہ نیزے پہ چڑھایا کیوں تھا

شہرِ ناپرساں کی گلیوں میں پھری ہوں تنہا
کوفۂ عصر میں اپنا بھی پرایا کیوں تھا

....

تسنیم عابدی کی شاعری میں کربلا کے تلازمات اتنی کثرت سے استعمال ہونے کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ ان کی رگوں میں خانوادۂ رسالتؐ کا لہو موجزن ہے اور وہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک منفرد نظم ''شجرۂ نسب'' ملاحظہ فرمایئے۔

اپنے اسلاف کے ناموس پہ فقط زندہ ہیں
اپنا شجرہ ہے رسولِ عربیؐ کا شجرہ
اپنا خوں وہ ہے جو ہر دور میں پانی طرح
کربلا میں کبھی کوفہ میں بہا کرتا تھا
قصر کے گارے میں وہ خون ملا کرتا تھا
ہاں مگر تخت کے پائے کو ہلا دیتا تھا
اپنے اجداد کی عزت کی شرافت کی قسم
آج تہذیب وثقافت کی یہ تصویر بنی
ہر بُری رسم گلے ہم نے لگا رکھی ہے
کوفہ والوں کی طرح شکل بنا رکھی ہے

کاش کردار سنور جائیں تو پہچان بنیں
آج ہم لوگ کہ دامن میں اندھیرے کو لیے
اپنے اسلاف کے ناموں پہ فقط زندہ ہیں

کربلا سے تسنیم عابدی کے تعلق خاطر کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے خیال میں اگر عصرِ نو میں ہم میدانِ کربلا میں کھڑے ہیں تو ہمیں حسینؑ کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔

عجب تھی تعزیت کی رسم شہرِ خونِ ناحق میں
نمک پاشی تو کرتے تھے عزاداری نہ کرتے تھے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تسنیم عابدی نے اس میدان کارزار میں اپنا کردار ادا کیا ہے؟؟ یہی وہ مقام ہے جہاں تسنیم عابدی کی شاعری ہم عصروں میں ممتاز ہو جاتی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کرب وبلا کے میدان میں حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی بے مثال قربانیاں اپنی جگہ لیکن اگر زینبؑ وکلثومؑ اس کی تشہیر نہ کرتیں تو یہ خونِ ناحق کربلا تک محدود ہو جاتا۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ واقعۂ کربلا کو ایک عورت نے تحریک بنا دیا ہے۔ کربلا کے واقعہ میں یقیناً امام عالی مقام نے اپنے خون سے رنگ بھرا ہے لیکن اس لہو کی مہک کو زندگی اور تابندگی حضرت زینبؑ کے طرزِ عمل اور طرزِ احساس سے ملی ہے۔ آپ ان کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

راہِ عشق میں کام جو کوئی کر جاتی
زندہ رہنے کی خاطر میں مر جاتی
صحرا' شام کا سناٹا اور تنہائی
سورج ڈوبتا' جب میں اپنے گھر جاتی
خونِ ناحق صحرا ہی میں چھپ جاتا
کیا ہوتی تشہیر اگر میں ڈر جاتی

میرے نزدیک تسنیم عابدی کا اختصاص ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں محض کربلا کے تلازمات ہی کو استعمال نہیں کیا بلکہ ایک عورت کے کردار واعمال کے مثبت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور احساس دلایا ہے کہ جہاں جاکر تنظیمی یعنی مردانہ معاشرہ ختم ہو جاتا ہے وہاں سے تخلیقی یعنی نسوانی معاشرے کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

عصر تک کام آ گیا بھائی
شام کو یاد اِک بہن آئی

تسنیم عابدی کی شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ وہ مخزنِ ادراک سے حروف کے موتی چنتی ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ جب انفس و آفاق کا غم شعر کے قالب میں ڈھالنا ہو تو محض فاعلاتن' فاعلات سے کام بھی نہیں چلتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تسنیم عابدی اپنی شعری کائنات کو کیسے سجاتی ہیں اور شاعری کرتے ہوئے کن باتوں کو مدنظر رکھتی ہیں ـــــ؟؟؟ سب سے پہلے تو ان ہی کی زبان سے سنیے۔وہ اپنی نظم ''کسبِ سخن'' میں کہتی ہیں۔

چنے ہیں مخزنِ ادراک سے حروف گہر
زمینِ لفظ سے معنی کشید کرتے ہوئے
قرأتوں کے سمندر میں لہر لہر حروف
ہمارے خوابِ پریشاں کو مجتمع کرکے
کفِ سطور پہ آکے بکھرسے جاتے ہیں
مگر حروف ومعانی سے ماورا اکثر
اثر کلام کا دل میں اُتر سا جاتا ہے
صحیفہ دل کا ہے الہامی اور مرے افکار

جبیں کی لوح پر آ کر چمکنے لگتے ہیں
میں کشفِ ذات سے کسبِ سخن کماتی ہوں

کشفِ ذات سے کسبِ سخن کمانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تسنیم عابدی نے تخلیق کا کرب نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اپنی شاعری کو بھی اس کی آنچ سے خوب گداز کر دیا ہے۔ آپ ان کی نظم ''کربِ تخلیق'' کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھئے کہ انہوں نے تخلیق کے کیا کیا روپ ابھارے ہیں اور اس جانکاہی کے عمل میں وہ کس حد تک کامیاب و کامران ہیں۔

کربِ تخلیق سے گزرتے ہوئے
کھنچ رہی تھیں مری رگیں ساری
خون کے بدلے آگ دوڑتی تھی
سانسیں نشتر کی طرح چبھتی تھیں
میں نے فریاد کی خدا سے پھر
مجھ کو تکلیف سے نجات دلا
یا مجھے موت دے دے میرے خدا
ساری دنیا کا درد جیسے کہ
میرے پہلو میں آن بیٹھا ہے
کسی پہلو مجھے قرار نہ تھا
وقت کی نبض تھم گئی اور پھر
اک صدا آئی مجھ کو رونے کی
ماں کی تکلیف میں شریک تھا وہ

اس گھڑی سارے دُکھ بھلا کر میں
دیکھ کر اس کو مسکراتی تھی
اپنی ماں مجھ کو یاد آتی تھی
میرے خالق نے میرے پہلو میں
اک نئی زندگی ہویدا کی
کربِ تخلیق کا صلہ یہ دیا
درد سے زندگی اُبھر آئی

تسنیم عابدی کی شاعری کربِ تخلیق کا صلہ ہے۔ آپ ان کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ بعض منفرد موضوعات کو انہوں نے اتنے سلیقے اور مہارت سے پیش کیا ہے کہ تسنیم عابدی پر کلاسیکی شاعرہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تسنیم عابدی کی غزلوں میں انفرادیت بھی ان کی کلاسیکی روایت سے ربط کے باعث جلوہ گر ہوتی ہے۔ آپ ان کی مختلف غزلوں کے منتخب کردہ ان اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھئے کہ دستِ ہنر کس طرح صفحۂ قرطاس پر رنگوں کو سلیقے سے بکھیرتا ہے۔

روح ہے مائل پرواز تو یہ جسم اسے　　ایک مٹی کی تجارت پہ نہ مجبور کرے

....

کیا گلہ تم سے کریں تم نہیں رُک پائے اگر　　میری بھی آنکھ کا آنسو تو نہ پل بھر ٹھہرا

....

اک لباس اور وہ بھی سادہ سا　　آخری پیرہن پہ غور کیا

....

بستیوں میں تھی اگر امن کی خواہش تم کو　　فوج کو جنگ کے میدان میں رہنے دیتے

....

وہی ہے چاک پہ گردش میں عنصر ہنر میں دستِ کوزہ گر نہیں ہے

....

چشم و لب، عارض و رخسار لیے پھرتے ہیں بیچنے کے لیے بازار لیے پھرتے ہیں
ٹھہر اے لطف تمنائے چراغ ہستی آنکھ میں حسرتِ دیدار لیے پھرتے ہیں

....

میں بدل جاؤں تو حیرت کی کوئی بات نہیں کیا سے کیا ہو گیا کعبہ بھی صنم کے ہاتھوں
لوگ بیچے ہی سرِ دار لٹکتے دیکھے حرفِ حق کھنچ گئے قرطاس و قلم کے ہاتھوں

....

حیرتیں آنکھ میں، دل میں غمِ جاں رکھنا ہے ہم کو معلوم ہے کس شے کو کہاں رکھنا ہے
اے سرابِ غمِ ہستی یہ بتا دے مجھ کو اک قدم اور تمنا کا کہاں رکھنا ہے

....

دل کا یقین آنکھ کی حیرت نہیں گئی پیغمبری تو مل گئی لکنت نہیں گئی

....

خوب چرچے ترے ہنر کے رہے ہم نے بھی اپنے فن پہ غور کیا

....

بساطِ فن پہ مصور نہ کھینچ صورت کو ہمارے عکس میں پہلا سا اب جمال نہیں

....

سب سے محفوظ مقامِ غمِ تنہائی ہے فکرِ دنیا نے اکیلا کبھی ہونے نہ دیا

....

غنچۂ دل نہ کھلا سکتے تو اتنا کرتے سوکھے پھولوں کو ہی گلدان میں رہنے دیتے

....

زندگی بھر کی رفاقت کی ضرورت کیا ہے　　　پھول اِک جھونکا ترا بادِ صبا مانگے ہے

....

دل کی حالت کا بتانا تھا بہت دشوار جب　　　آنکھ کا آنسو بنا پھر ترجمانِ آرزو

....

دامنِ تر زمانہ دیکھا کیا　　　آپ کرتے رہے وضو صاحب

....

خلا ہے مجھ میں کچھ اندر نہیں ہے　　　مگر کچھ خاک کے باہر نہیں ہے

....

جس نے تسنیم جلائے ہیں بناوٹ کے چراغ　　　اُس کی رعنائی کو رعنائی نہ سمجھا میں نے

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ تسنیم عابدی کی شاعری میں غم ایک اساسی قدر کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ کبھی یہ غم ذات کے نہاں خانوں کا چکر لگاتا ہے اور کبھی یہ کائنات کے اسرار سے سربستہ رازوں کو منکشف کرتا ہے۔ تسنیم عابدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں درد و غم کے تمام ذائقوں کو سمو دیا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ تسنیم عابدی کے شعری قفل کو صرف اور صرف کلیدِ غم سے کھولا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ کنجی نہیں ہے تو وہ تسنیم عابدی کے شعری کائنات کے قفل کو ہرگز ہرگز نہیں کھول سکتا ہے۔

قالب شعر میں ہر غم کو سمونا ہے تو پھر
شعر کو قافیہ پیمائی نہ سمجھا میں نے

◆◆◆

◆◆◆

اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری۔ چند معروضات

◆◆

عصرِ حاضر میں انسان طرح طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہے۔ غمِ جاناں سے نجات ملتی ہے تو غمِ دوراں گھیر لیتا ہے۔ ذاتی مسائل سے پیچھا چھڑانے والا انسان آفاقی مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایک جانب تو دنیا گلوبل ولیج سے سمٹ کر گلوبل ہٹ میں سما گئی ہے اور دوسری جانب ذات کے مسائل نے آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اس ابتر صورتِ حال نے حساس دل رکھنے والے تخلیق کاروں کو بے قرار کر دیا ہے۔ دوسروں کو نئی زندگی کی نوید سنانے والے فنکار آج خود نوحہ خواں ہیں کہ

دنیا میں حادثات کی اقبالؔ حد نہیں
انسان مر نہ جائے تو بے چارہ کیا کرے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس درد بھری کائنات میں انسان خوشیوں اور مسرتوں کے چند لمحات کہاں سے مستعار لے......؟؟ حقیقت یہ ہے کہ دائمی مسرت دولت اور شہرت سے حاصل نہیں ہوتی۔ لازوال خوشی تو انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ اطمینان قلب وہ عظیم اور لازوال دولت ہے جس پر کئی جہاں قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اطمینانِ قلب کے حصول کے لیے انسان کو ان ذواتِ مقدسہ کا دامن تھامنا پڑتا ہے جو شفیع المذنبین بھی ہوتی ہیں اور

رحمتہ للعالمین بھی۔ جو لوگ محمد و آلِ محمدؐ کے عشق میں سرشار رہتے ہیں دنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں ان کے قدم چومتی ہیں۔ بقول وحید ہاشمی ؎

ہمارا کام ہے ڈوبے رہیں عشقِ پیمبرؐ میں
محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

سچ تو یہ ہے کہ محمدؐ و اہلبیتِ محمدؐ کے بغیر نہ تو اس دنیا میں کامرانی عطا ہو سکتی ہے اور نہ آخرت میں نجات مل سکتی ہے۔ بقول سید اقبال حیدر:

علیؑ ہوں جس کے لیے میر کارواں اقبالؔ
پھر اس کو کون سا دھڑکا رہِ نجات میں ہے

سید اقبال حیدر نے بھی آلِ محمدؐ کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ انہوں نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے تاہم ان کے جوہر مدحیہ اور رثائی شاعری میں کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، نوحہ غرض ہر صنف میں اقبال حیدر نے اپنے بلیغ افکار و نظریات پیش کیے ہیں اور وہ خود اس پر نازاں بھی ہیں۔

مدح خوانِ علیؑ ہوں میں اقبالؔ
مرتبہ کوئی اس سے بڑھ کر ہے
سر جھکائے ہوں بابِ حیدرؑ پہ
آسماں پہ مرا مقدر ہے

سید اقبال حیدر کی درج ذیل کتب زیورِ طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر صاحبانِ نقد و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

۱۔ بے آب زمینیں ۲۔ اُمیدِ سحر
۳۔ الہام ۴۔ مرے دل کے آس پاس

۵۔ شبستانِ ولا ۶۔ قلم سے کالم تک

لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے دیس میں رہنے والے ہمارے فنکار معاشرتی زبوں حالی کا رونا روتے رہتے ہیں اور جرمنی جیسے علاقے میں رہنے والے سید اقبال حیدر اُردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے تمام ممکنہ ذرائع بروئے کار لاتے ہیں۔ان کی بے پایاں علمی وادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم انہیں جرمنی میں ''پاکستان کا علمی و ادبی سفیر'' قرار دے سکتے ہیں۔ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قوتِ گویائی اور اصابت فکر عطا فرمائے تاکہ وہ آسمانِ ادب پر ایک روشن آفتاب بن کر جگمگاتے رہیں اور ان کی یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو جائے۔

چمک رہے ہیں جس طرح مہ و نجوم و کہکشاں
مجھے بھی اک مقام دے مرا بھی اعتراف کر

سید اقبال حیدر کو رثائی ادب سے بے پناہ دلچسپی ہے۔وہ سوز و سلام و نوحہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اب صنفِ مرثیہ سے تعلقِ خاطر جوڑ رہے ہیں۔ ان کے درج ذیل دو مرثیے بہت جلد بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہے ہیں۔

ا) معرکۂ حق و باطل

ب) اسلام اور حکومت

ان دونوں مرثیوں کے عمیق مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اقبال حیدر نے اپنی شاعری کے جملہ محاسن کو ان مرثیوں میں سمونے کی شعوری کاوش کی ہے۔ان مرثیوں میں غزل کا سوز و گداز، قصیدے کا طنطنہ، مثنوی کا پھیلاؤ، سلام کا ایجاز و اختصار، منقبت کی بلند فکری اور نعت کی عقیدت موجزن ہے۔اس طرح یہ مرثیے محض اقبال حیدر کی عقیدت کا مظہر ہی نہیں بلکہ جملہ اصنافِ سخن کا پُرتجمل اظہار بھی ہیں۔اب ذیل میں ان مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

یہ بات انتہائی ملال انگیز ہے کہ ہمارے کج فہم اور بدبیں ناقدین ایک عرصہ تک مرثیے کو محض رونے رلانے کی چیز قرار دیتے رہے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے مرثیہ کو فن سے دور کر کے صرف اخروی ثواب تک محدود کر دیا۔ بھلا ہو ان ناقدین کا جنہوں نے اس صنف مرثیہ کو فن کی کسوٹی پر پرکھا اور اس ہشت پہلو صنف کے تمام رنگوں کو اُجاگر کرنے کی مشکور سعی کی۔ ان چشم معنی آشنا ناقدین کی کاوشوں کی بدولت آج مرثیوں کے ان اوصاف حمیدہ پر بھی ہماری نگاہ پڑ رہی ہے جو ایک عرصہ تک تعصبات کی دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ بیسویں صدی میں بطور خاص تمام اصناف کو ایک نئے تناظر میں پرکھنے کا رواج عام ہوا۔ اصناف کا رشتہ سماج سے جوڑا جانے لگا اور ان اصناف کو اہمیت دی جانے لگی جو ہماری سماجیات کو تبدیل کرنے پر قادر تھیں۔ اس صورتِ حال میں آل رضا، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، نسیم امروہوی، جمیل مظہری، قیصر بارہوی اور سید وحید الحسن ہاشمی نے مرثیے کے مزاج و مذاق کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی حتی المقدور کاوشیں کیں اور مرثیے کو اپنا خونِ جگر دے کر سب سے بڑی فتح کا نقارہ بنا دیا۔ بقول قیصر بارہوی۔

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

سید اقبال حیدر بھی اسی روشن جادے کے راہرو ہیں انہوں نے اپنے مرثیوں کو محض عقیدت کا اظہار نہیں بننے دیا بلکہ ان میں سماجی رویوں کو شامل کر کے عہدِ جدید سے پیوست کر دیا ہے۔ اقبال حیدر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جدت اور روایت دونوں کو دانائی سے آمیخت کر دیا ہے۔ آپ دیکھیے کہ انہوں نے ازل سے جاری حق و باطل کے معرکہ کو کتنی دانش مندی سے صرف ایک بند میں عہد حاضر سے جوڑ دیا ہے۔

اس دن سے آج تک حق و باطل میں جنگ ہے
ہر سمت نور و نار کی محفل میں جنگ ہے

حلق شہید و خنجرِ قاتل میں جنگ ہے
ہر قلب میں فشار ہے ہر دل میں جنگ ہے
کچھ لوگ اب بھی خالقِ اکبر کے ساتھ ہیں
کچھ منحرف ہیں خیر سے اور شر کے ساتھ ہیں

(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

اقبال حیدر کے مرثیوں میں تلوار کے محامد اور گھوڑے کے محاسن تو شاید نہ مل سکیں لیکن ان میں زندگی بسر کرنے کے اعلیٰ تر اصول ضرور مل جائیں گے۔ ہمارے معاشرے میں اخلاقی قدروں کو جس طرح زوال آ رہا ہے۔ وہ صاحبانِ فہم و ذکا سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اقبال حیدر اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا احیا چاہتے ہیں تو ہمیں سیرت محمدؐ و آلِ محمدؐ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہم آج بھی باطل کو صرف اور صرف سیرتِ رسولؐ اپنا کر ہی شکست دے سکتے ہیں۔ صرف ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

چالیس سال سیرت و کردار سے لڑے
کّے میں صرف خُلق کی تلوار سے لڑے
یثرب میں آ کے لشکرِ کفار سے لڑے
یعنی ہر ایک ظالم و بدکار سے بڑے
شیطان جن میں رہتا تھا وہ دل مٹا دیے
سارے نشانِ سطوتِ باطل مٹا دیے

(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

اقبال حیدر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے محمدؐ و آلِ محمدؐ سے اپنا

ناتہ توڑ لیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم دنیا میں رسوا اور آخرت میں ذلیل ہو گئے۔ اس حوالے سے ان کے دو درد انگیز بند ملاحظہ فرمایئے:

کل اگر آلِ پیمبرؐ سے محبت ہوتی
کل اگر قوم کو قرآں سے عقیدت ہوتی
کل اگر پیرویِ سیرت و سنت ہوتی
کل اگر عزت و ایمان و شریعت ہوتی
آج اس طرح نہ رسوا سرِ عالم ہوتے
آج اقوام کے سردار فقط ہم ہوتے

ہم کو اللہ نے اسلام کی دولت دی تھی
اس کا احساں کہ محمدؐ کی نبوت دی تھی
حشر تک جو رہے قائم وہ شریعت دی تھی
ساتھ میں عترت و قراں کی قیادت دی تھی
اپنے سر گردشِ دوراں کی ہر آفت لے لی
ہم نے سب بیچ دیا اور حکومت لے لی

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

سید اقبال حیدر نے اپنے مرثیوں میں کوئی بڑا فلسفیانہ نظام حیات تو پیش نہیں کیا البتہ ہمارے لیے سوچ اور فکر کے نئے نئے در ضرور وا کیے ہیں۔ انہوں نے حق و باطل کی آویزش میں ہمیں تنہا نہیں چھوڑا بلکہ راہ ہدایت کا تعین کیا ہے اور آل محمدؐ کے جادے کو صراط مستقیم قرار دیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے کرب و بلا کو محض شہادت گاہ امام عالی مقام ہی قرار نہیں دیا بلکہ کربلا کو عصر حاضر کے لیے ایک ہمہ گیر استعارہ بنا کر ہمارے

سامنے پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیے ؂

کربلا درسِ گہہ اہلِ وفا آج بھی ہے
کربلا حق و صداقت کی صدا آج بھی ہے
کربلا دینِ پیمبرؐ کی بقا آج بھی ہے
کربلا عزتِ احکامِ خدا آج بھی ہے
کربلا اب بھی درخشندہ و تابندہ ہے
فیض اسی کا ہے کہ اسلام ابھی زندہ ہے

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

اقبال حیدر معاشرتی صورتِ حال سے انتہائی کبیدہ خاطر ہیں۔وہ پردیس میں بیٹھ کر دیس کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے افسردہ ہو رہے ہیں۔وہ جہاد کے نام پر ہونے والے فساد سے دل گرفتہ ہیں۔ان کا موقف یہ ہے کہ چند دین ناشناس ملاؤں نے نوخیز ذہن رکھنے والوں کو شوقِ جنت کا اسیر بنا کر جہنم رسید کر دیا ہے۔خودکش حملہ آوروں کا روپ دھارنے والے نہ تو اسلام کے دوست ہیں اور نہ پاکستان کے شیدائی۔آپ اقبال حیدر کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمائیے اور ان کی ذہانت، فطانت اور عمیق نگاہی کی داد دیجیے۔

لوگ اسلام کے اب نام سے گھبراتے ہیں
داڑھی رکھے کوئی آتا ہے تو تھراتے ہیں
اہلِ ایماں جو ہیں ان باتوں پہ شرماتے ہیں
یہ جہاں چاہیں بلا خوف و خطر جاتے ہیں
کب بھلا اپنے بزرگوں سے یہ کم لاتے ہیں
وہ صنم لاتے تھے مسجد میں یہ بم لاتے ہیں

مدرسے ان کے ہیں شیطان بنانے کے لیے
یعنی انسان کو حیوان بنانے کے لیے
اہلِ عالم کو پریشان بنانے کے لیے
بستیاں دہر کی ویران بنانے کے لیے
حور و فردوس کے ان باتوں پہ حقدار بھی ہیں
قتل بھی کرتے ہیں جنت کے طلب گار بھی ہیں

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

اقبال حیدر کا مؤقف یہ ہے کہ اسلام امن اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے اور اس مذہب کی آرزو ہے کہ پوری دنیا میں شادکامی ہو اور ہر انسان خوش وخرم زندگی بسر کرے۔ یہ بات انتہائی ملال انگیز ہے کہ کچھ عاقبت نااندیشوں نے ظلم وجور کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ وہ خود بھی دنیا میں ذلیل ہو رہے ہیں اور ہر صاحب دل پاکستانی کو بھی رسوا کر رہے ہیں۔ اقبال حیدر چشم تر سے یہ المناک مناظر دیکھ رہے ہیں اور اسے جہالت، بے یقینی، اسلامی تعلیمات سے دوری اور فرامین محمدؐ و آل محمدؐ سے بے اعتنائی کا سبب گردانتے ہیں۔ ان کے مرثیے کا صرف ایک بند ملاحظہ فرمایئے اور ان کی دل گرفتگی کو محسوس کیجیے :

آج پھر دین ہے مشکل میں گھرا اے یارو
آج پھر ظلم کا طوفاں ہے چڑھا اے یارو
آج پھر مذہب حق پر ہے جفا اے یارو
آج پھر حشر ہے اک تازہ بپا اے یارو
آج پھر ظلم کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے
آج پھر قصرِ یزیدی کی ہوا آئی ہے

(مرثیہ: اسلام اور حکومت)

میر انیسؔ نے کہا تھا کہ ''مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے'' اقبال حیدر نے بھی اپنے مرثیوں میں حزن وملال کی تمام کیفیات کو سلیقے سے جگہ دی ہے۔ ان کے پورے مرثیوں میں میرزا دبیر کی طرح حزنیہ رنگ تو نہیں چھایا ہوتا تاہم مرثیے کے آخری حصوں میں بکائیہ انداز اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ پتھر آنکھوں سے بھی اشک رواں ہو جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اقبال حیدر مرثیہ میں غم پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ کبھی تو وہ صورتِ حال سے غم کشید کرتے ہیں اور کبھی لفظ کے ذریعہ غم اُبھار دیتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ کربلا خود ایک غم انگیز واقعہ ہے مگر اقبال حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کو بھی ایک حرکی قوت کے طور پر استعمال کر کے پیغام رسانی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپ ان کے مرثیوں کے درج ذیل بند ملاحظہ فرمایئے اور ان میں موجود غم والم کی مختلف کیفیات کو خود محسوس کیجیے۔

بین ہمشیر کے تھے اے مرے ماں جائے حسینؑ
بوند پانی دمِ آخر نہ ملا، وائے حسینؑ
میں تو زندہ رہی اور تو نہ رہا ہائے حسینؑ
تجھ کو ڈھونڈے کہاں اب تجھ کو کہاں پائے حسینؑ
ناؤ منجدھار میں ہے آ کے سنبھالو بھیا
پاس تم اپنے بہن کو بھی بلا لو بھیا

رو کے کہتی تھی سکینہ مرے پیارے بابا
اے مرے رنج و مصیبت کے سہارے بابا
چھوڑ کے مجھ کو کہاں آپ سدھارے بابا
کہیں ایسا نہ ہو دشمن مجھے مارے بابا

آپ واپس جو نہ آئے تو بہت روؤں گی
آپ کا سینہ نہ ہو گا تو کہاں سوؤں گی

(مرثیہ۔ اسلام اور حکومت)

مصروفِ جنگ تھے کہ فلک پر گئی نظر
لاحول پڑھ کے ٹھہر گئے شاہِ بحر و بر
تلوار روک لی تو ہوئے جمع اہلِ شر
چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے شہ پہ بدگہر
کچھ اشقیا تھے نیزہ و خنجر لیے ہوئے
کچھ سنگدل تھے ہاتھوں میں پتھر لیے ہوئے

اک تیر آ کے سینۂ پرنور پر لگا
کھینچا جو اس کو خون کا پرنالہ بہہ گیا
نیزہ کسی کا پہلوئے اقدس پہ جب پڑا
گھوڑے سے فرشِ خاک پہ آئے شہِ ہدیٰ
تلواریں مارتے تھے بد اختر حسینؑ پر
چلتے تھے تیر و نیزہ و خنجر حسینؑ پر

تا وقتِ عصر ختم جو یہ معرکہ ہوا
محوِ نماز شہ تھے کہ محشر بپا ہوا
سجدے میں تھے کہ وعدۂ طفلی وفا ہوا
زہراؑ کا لال دینِ خدا پر فدا ہوا

خیمے میں جب اسے کسی صورت نہ کل پڑی
سر اپنا پیٹتی ہوئی زینبؑ نکل پڑی
(مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

سید اقبال حیدر مرثیے میں ایک جداگانہ اسلوب کے حامل ہیں۔ وہ نجم آفندی یا جوش ملیح آبادی کی طرح صاحب طرز مرثیہ نگار تو نہیں تاہم وہ اپنے افکار و نظریات کو سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی باتوں کی طرح ان کا اسلوب بھی قارئین کے دلوں پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔ وہ علم بیان و بدیع کے تمام ارا کین کو مہارت سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اقبال حیدر شاعری میں فنی محاسن کے قائل تو ہیں لیکن وہ فن کے لیے اپنے افکار کو قربان کرنے پر مائل نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں صنائع لفظی و معنوی نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ان کے مرثیوں کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور ان میں موجود علم بیان و بدیع کے ارا کین، روزمرہ محاورات اور تراکیب و مرکبات کا برمحل استعمال دیکھیے۔

آدمؑ کے بعد نوحؑ تھے اللہ کے سفیر
معصوم و پاک باز و اولوالعزم و بے نظیر
پیغام حق وہ لائے بچے ہر جوان و پیر
تکذیب ان کی کرتے رہے قوم کے امیر
مشرک تھے جتنے دہر میں فی النار ہو گئے
کشتی میں جو سوار ہوئے پار ہو گئے

(صنعت تلمیح، صنعت تضاد، تراکیب و مرکبات، محاورہ) (مرثیہ۔ معرکۂ حق و باطل)

ملک گیری کی تمنا کا یہ انعام ملا
علم سے منہ کو جو موڑا تو یہ پیغام ملا
ظلم و آزار کا جذبہ سحر و شام ملا
دامنِ آلؑ جو چھوڑا تو یہ اسلام ملا
ننگِ تاریخِ جہاں ہو گئے وہ کام کیا
خود بھی رسوا ہوئے مذہب کو بھی بدنام کیا

(صنعت تضاد، تراکیب و مرکبات، محاورات) (مرثیہ۔ اسلام اور حکومت)

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں ہر فرد مضطرب ہے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اقبال حیدر نے اپنی شاعری اور خصوصاً مرثیوں کے ذریعہ اہلِ دانش و بینش کو یہ پیغام دیا ہے کہ اس دنیا میں سکون اور اطمینان کے متلاشیوں کو دامنِ محمدؐ و آلِ محمدؑ تھام لینا چاہیے۔ ان ذواتِ مقدسہ سے منسلک ہو جانے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی اور کامرانی حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر ہم صدقِ دل کے ساتھ اقبال حیدر کے فکری سفینہ میں سوار ہو جائیں تو یقین واثق ہے کہ ہم ساحلِ مراد تک ضرور پہنچ جائیں گے کیوں کہ بقول نسیم امروہوی۔

اسے کیا خوفِ طوفاں ہو سفینہ جس کا وابستہ
بہتر لنگروں سے اور چودہ بادبانوں سے

◆◆◆

◆◆◆

نذیر۔اے۔قمر کے ماہیوں کا مجموعہ 'چاندا کیلا ہے'

◆◆

ایک سوال ادبی و شعری دنیا کے ناقدین کے مابین ہمیشہ باعثِ نزاع رہا ہے کہ عظیم شاعری الفاظ سے پیدا ہوتی ہے یا اعلیٰ خیالات سے جنم لیتی ہے......؟؟ اس سوال سے قطع نظر میرا موٴقف یہ ہے کہ بڑی اور عظیم شاعری ہمیشہ ''کومٹ منٹ'' سے پیدا ہوتی ہے۔ ارفع خیالات اور مناسب الفاظ سے شاعری تو وجود میں آسکتی ہے تاہم عظیم شاعری ہرگز طلوع نہیں ہو سکتی۔ آپ دنیا کی عظیم شاعری کا مطالعہ فرما لیجیے آپ خود دیکھیں گے کہ چشمِ معنی آشنا میں وہی شاعری جگہ پائے گی جو اعلیٰ و ارفع مقاصد سے مالا مال ہوگی۔ ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے تخلیق کار انفرادیت کے چکر میں پڑ کر یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کی شہرت و عظمت کا مدار اعلیٰ و ارفع مقاصد کی پیش کش پر ہے، انفرادیت پر ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ جو شعرا اس نکتہ پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہ ایوان شاعری میں بلند مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ **نذیر۔ اے۔ قمر** ان چنیدہ شعرا میں شامل ہیں جن کی شاعری لفظی اُلٹ پھیر کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی سنجیدگی سے معاشرے کی تبدیلی کے خواہاں ہیں اور ان کا واضح موقف یہ ہے کہ معاشرے کی مذموم رسوم کی بیخ کنی کے لیے شعروادب کو وسیلہ بلکہ موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ عمیق نگاہی سے ان کے شعری مجموعوں کا مطالعہ فرما لیجیے تو

آپ کو ان کا یہ واضح پیغام مل جائے گا کہ ''بہار آنے تک'' چاند اکیلا ہے۔'' اگر آپ چاہتے ہیں کہ کامیابی کا چاند اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر ہو تو آپ معاشرے سے خزاؤں کے خاتمے کا اہتمام کیجیے۔ نذیر اے قمر کی شاعری کا یہی مرکزی نقطہ ہے اور ہمیں اسی حوالے سے ان کی کُل شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نذیر۔ اے۔ قمر ربع صدی سے شعر و ادب کے ایوان کو اپنے زرّیں افکار و نظریات سے سجا رہے ہیں۔ ان کی صناعانہ کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے اور ہر صاحبِ دل کو خبر ہے کہ ان کی شاعری میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ وہ سطحی اور عامیانہ باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری اور خصوصاً ماہیوں میں سوچ اور فکر کی گہرائیاں ہویدا ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل صرف تین ماہیے ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ نذیر اے قمر کی شاعری میں معنی کی کتنی سطحیں پوشیدہ ہیں۔

اشکوں کی کہانی کا
اب راز نہ کھل جائے
دریا کی روانی کا

....

بس نام کے میلے ہیں
انسانوں کی دھرتی میں
انسان اکیلے ہیں

....

پلکوں کو بھگوتے ہیں
جو سامنے ہنستے ہوں
وہ بعد میں روتے ہیں

یہ بات عام مشاہدے کی ہے کہ صرف وہی درخت چھتناور بن پاتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں گہری پیوست ہوتی ہیں۔ اس راز سے آگاہ ہو جانے کے بعد نذیر۔ اے۔ قمر نے اپنی شعری روایات سے گہرا ربط قائم کر رکھا ہے۔ وہ پردیس میں رہ کر بھی اپنے دیس کی سہانی اور مہک دار مٹی سے محبت کرتے ہیں اور یہاں کی جملہ روایات کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ آپ ان کے اُردو ماہیوں کے تازہ ترین مجموعے ''چاند اکیلا ہے'' کا مطالعہ فرما لیجیے آپ دیکھیں گے کہ اس مجموعے میں وطن سے والہانہ محبت کے مظاہر جلوہ گر ہیں۔ وہ اپنے وطن کی زمین، آسمان، چاند، ستارے، پہاڑ، صحرا، جنگل، دریا غرض ہر چیز سے محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل ماہیے ملاحظہ فرمائیے اور اس میں وطن سے محبت کی سوندھی سوندھی مہک محسوس کیجیے۔

دو رنگوں کی کلیاں ہیں
اسپین سے بھی اچھی
ترے گاؤں کی گلیاں ہیں

....

خدشات نہیں رکھنا
میں لوٹ کے آؤں گا
تم میرا یقیں رکھنا

نذیر۔ اے۔ قمر کے ماہیوں میں خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں حیرت انگیز نکات پوشیدہ ہیں، جنہیں صاحبانِ بصیرت ہی دریافت کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نذیر۔ اے قمر کی شاعری کا عموماً اور ماہیوں کا خصوصاً عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا جائے تاکہ اس کے جملہ اسرار کھل کر ہمارے سامنے آ سکیں۔ اب تو یہ بات بلاشک و

بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ ایک معتبر شاعر اپنی شاعری کو خدا، انسان اور کائنات کی مثلث سے مزین کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے اور اس مثلث کے تینوں سروں کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے کی مشکور سعی کرتا ہے۔ نذیر۔ اے قمر کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ماہیوں میں جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت وسطوت بیان کی ہے وہاں دوسری جانب انسان کی بے پایاں خدمات پر روشنی ڈالی ہے اور کائنات کے سربستہ رازوں کو کھولنے کی تدابیر بیان کی ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل ماہیوں کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے خدا، انسان اور کائنات کی مثلث کو کتنے سلیقے سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

مت پوچھ خدا کیا ہے
ہر چیز پہ لکھا ہے
خالق کے سوا کیا ہے

....

خالق کو مناتا ہوں
دربار الٰہی میں
جب سر کو جھکاتا ہوں

....

دو رنگوں کا پیار ملا
دنیا کے فسانے کا
مشکل کردار ملا

....

یہ عہد جفا کا ہے
جلاؤ تو دنیا میں
کیا نام وفا کا ہے

دنیا کو جان لیا
بھیڑ میں بھی ہم نے
اس کو پہچان لیا

....

دن رات بھٹکتی ہیں
کچھ تشنہ تمنائیں
سولی پہ لٹکتی ہیں

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عظیم شاعری اسی وقت وجود میں آ سکتی ہے جب شاعر کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کو پیشِ نگاہ رکھے۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ نذیر۔ اے قمر نے اپنی شاعری اور خصوصاً ماہیوں میں زندگی کی سچائیوں اور محبت کی رعنائیوں کو پیشِ نگاہ رکھا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ معاشرے میں مثبت قدروں کے فروغ کے لیے ہمیں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ چلتے چلتے نذیر اے قمر کا ماہیا سن لیجیے جس میں وہ اپنا منشورِ حیات اور شاعری کا مَنی فیسٹو پیش کر رہے ہیں۔

یوں وقت گزاریں گے
ہم لوگ محبت ہیں
منزل کو پکاریں گے

◆◆◆

◆◆◆

عرفی ہاشمی کے جدید مختصر مرثیے

◆◆

اُردو مرثیہ ایک مرکب صنف سخن ہے۔ یہی سبب ہے کہ مرثیے کے میدان میں صرف وہی شاعر قدم رکھ سکتا ہے جسے ایک جانب توفیق ایزدی ہو اور دوسری جانب اسے جملہ اصناف سخن پر مہارت حاصل ہو۔ ہمارے قدیم ناقدین کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے صنف مرثیہ پر تنقید کرتے ہوئے اسے انیس و دبیر پر ختم کر دیا اور شعرا میں یہ احساس اُجاگر کر دیا کہ اب مرثیے کے لیے کوئی موضوع باقی نہیں رہا۔ اس طرز عمل کا منفی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جدید شاعروں نے مرثیے سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور نوجوان شعرا تو اس صنف شاعری سے احتراز کرنے لگے۔ یہ امر باعث امتنان ہے کہ جدید مختصر مرثیے کے پیش رو اُستادالشعرا سیّد وحیدالحسن ہاشمی نے نوجوان شعرا کو اس صنف سے رغبت دلائی۔ ان کی تحریک پر جن نوجوان شعرا نے اس کوچے میں قدم رکھا ان میں عرفی ہاشمی بھی شامل ہیں۔

عرفی ہاشمی جدید لب ولہجے کے شاعر ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے شعبے سے انسلاک کے باعث وہ شعروادب کو جدید تناظر میں سمجھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں۔ آپ ان کی غزلوں، نظموں، سلاموں اور مرثیوں کا مطالعہ فرمالیجیے، آپ دیکھیں گے کہ

وہ ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور انہوں نے شاعری میں اپنا ایک الگ نظام فکر وضع کیا ہے۔ ان کی شاعری میں روحِ عصر بھی موجود ہے اور ان کے افکار و نظریات اکیسویں صدی کے تناظر میں ایک خاص معنی مرتب کرتے ہیں۔ یہ امر انتہائی حیرت انگیز ہے کہ انہوں نے کم عمری میں صنفِ مرثیہ سے تعلقِ خاطر جوڑا ہے۔ آپ ان کے مرثیوں کا مطالعہ فرمالیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان مرثیوں میں کلاسیکی ہیئت تو موجود ہے لیکن ان کا مجموعی مزاج و مذاق جدید شاعری کی دین ہے۔ عرفی ہاشمی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کے پرانے سبو میں تازہ مے ڈال دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیے علم و ادب کے شیدائیوں کے لیے دعوتِ فکر کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

سید عرفی ہاشمی محض ایک روایتی مرثیہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے عصر حاضر میں رثائی ادب کی اہمیت اور افادیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"—— اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ عالمی ادب، پاکستانی ادب اور پاکستانی ادب میں رثائی ادب کے قارئین کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہمارے تہذیبی تشخص کی بنیاد اب شعر و ادب پر نہیں بلکہ معیشت اور ٹیکنالوجی پر استوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک طرف بین الاقوامی، قومی اور علاقائی کلچر اور دوسری جانب شخصیت کو تشکیل دینے والے بنیادی رجحانات کے پیچھے بھی یہی دو عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ نوے فیصد سے زیادہ افراد پہلے ہی اس بات کے قائل ہیں کہ معیشت و ٹیکنالوجی سے تعلق خاطر نہ رکھنے پر انہیں سماجی حیثیت اور مادی فوائد کے حصول میں شدید رکاوٹیں درپیش ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستانی ادب اور پاکستانی ادب میں رثائی ادب

کس کے لیے تخلیق کیا جائے؟ ''ادب برائے زندگی'' کا فلسفہ اچھا ہے
مگر روزمرہ کاروبارِ حیات میں کہیں اس کی عملی شکل نظر نہیں آتی۔
''ادب برائے ادب'' کا نظریہ بھی مشکل سے دوچار ہے کہ قارئین
آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور نئی نسل ان کے اس عمل کو احسن گردان
رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورتحال میں ہم ''ادب برائے
ادیب'' کے نظریے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں------''

(عرفی ہاشمی بجھے چراغوں کی روشنی' لاہور الحسن پبلی کیشنز بار دوم ۲۰۰۵ ص ۸)

عصرِ حاضر میں ادب پر ایک زبوں حالی کی کیفیت طاری ہے۔ دوسرے اصناف کی طرح مرثیہ بھی ناقدین و قارئین کی بے حسی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح مرثیے کے زندہ رہنے کے اسباب فراہم کریں۔ اس سلسلے میں عرفی ہاشمی کا موقف بھی سنتے چلیے جو ان کے جدید طرزِ احساس کا علمبردار ہے:۔

''------ مرثیہ بنیادی طور پر ایک Message ہے۔ ہر Message کے اپنے سامعین (Audience) ہوتے ہیں جن کے لیے اُسے تخلیق کیا جاتا ہے۔ آپ کے اس Message (مرثیہ) کے سامعین میں اگر کمی واقع ہو رہی ہو تو مرثیے کو زندہ رکھنے کیلئے درج ذیل اقدامات کی ضرورت ہے۔ اولاً میڈیا کے ذریعے اپنے سامعین کو اپنے Message (مرثیہ) کی اہمیت کا احساس دلا کر ان کا ذوق و شوق بڑھانے کی سعی کی جائے۔ ثانیاً تکنیکی مہارت اور تربیت کے ذریعے ان میں Message (مرثیہ) کو سمجھنے اور اُس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بیدار کی جائے۔ ثالثاً Message (مرثیہ) کی ساخت اور اسلوب کو

Audience کے عہد کے مطابق تبدیل کر دیا جائے۔ یہ نکتہ مرثیے میں جدّت اور اختصار کا جواز بھی ہے۔ ربعا مرثیے میں کربلا کو اکیسویں صدی کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی شعوری سطح پر کوشش کی جائے۔ Message یا Audience Development Diversification کے بغیر جدید مرثیے کی نمود ناممکن ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرثیے کے احیا اور فروغ واشاعت کی اس نسبتاً پیچیدہ صورتحال کو سمجھا جائے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کو مربوط اور بامقصد کر کے کسی جدید پلیٹ فارم یا تحریک کی تشکیل کی جائے ورنہ ان مشکل حالات کے تناظر میں اگلے پچاس سال تک عوامی اور حکومتی سطح پر پاکستانی ادب کو بالعموم اور رثائی ادب کو بالخصوص کوئی پذیرائی ملتی نظر نہیں آتی ــــــ"

(عرفی ہاشمی بجھے چراغوں کی روشنی؛ لاہور الحسن پبلی کیشنز بار دوم ۲۰۰۵ ص ۹)

سید عرفی ہاشمی نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے طبعی جوہر کا بھرپور اظہار مرثیوں میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر ابھی تک درج ذیل چار مرثیے تخلیق کیے ہیں تاہم ان کا مرثیاتی سفر جاری ہے۔

پہلا مرثیہ

ا)	نام مرثیہ	میزان خرد
ب)	سن تخلیق	۱۹۹۹ء
ج)	کل بند	۵۹
د)	مطلع	محو حیرت ہوں خرد کے ارتقا کو دیکھ کر

ر) موضوع — عقل و دانش کے ارتقائی سفر کا حال اور حضرت حرؑ کی شہادتِ عظمیٰ

دوسرا مرثیہ

ا) نام مرثیہ — سیاستِ تبسّم

ب) سن تخلیق — ۲۰۰۱ء

ج) کل بند — ۵۳

د) مطلع — باغ افکار کے پھولوں کی مہک زخمی ہے

ر) موضوع — عصر حاضر کی ابتر کیفیات کا ذکر اور شہادت حضرت علی اصغر کے اثرات

تیسرا مرثیہ

ا) نام مرثیہ — محنت اور ادیب

ب) سن تخلیق — ۲۰۰۲ء

ج) کل بند — ۵۲

د) مطلع — اکیسویں صدی کا تعارف عجیب ہے

ر) موضوع — اکیسویں صدی میں ادب اور ادیبوں کی حالت زار اور شہدائے کربلا کی بے مثال قربانیوں کا ذکر

چوتھا مرثیہ

ا) نام مرثیہ — اکیسویں صدی اور کربلا

ب) سن تخلیق — ۲۰۰۳

ج) کل بند ۴۷

د) مطلع محورِ تشکیک سے ہٹ کر یقیں کی بات ہو

ز) موضوع اکیسویں صدی میں معاشرتی مسائل و معاملات اور احوال شبِ عاشور

عرفی ہاشمی کے درج بالا چاروں مرثیوں کے عنوانات پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ شعر و ادب کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کے یہ چاروں مرثیے ''بجھے چراغوں کی روشنی'' کے علامتی عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب ان چاروں مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

(ا) میزان خرد

''میزان خرد'' نامی مرثیہ ۱۹۹۹ء میں معرض وجود میں آیا اور ۲۰۰۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس مرثیے میں کل ۵۹ بند ہیں۔

''میزان خرد'' حضرت امام حسینؑ کے ایک جاں نثار ساتھی حضرت حرؓ کی شہادت عظمیٰ کے حوالے سے معرض تخلیق میں آیا ہے۔ مرثیے کے آغاز میں شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ عصر حاضر میں انسان جس ترقی کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں پڑ گیا ہے وہ تو ابھی انسانی ترقی کا آغاز ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان آئندہ زندگی کے تمام امکانات کو دانش و برہان کے ذریعہ پرکھے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عقل کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے کیونکہ عقل مستقبل پر نظر کرتی ہوئی' پر ضیا تہذیب کی ہر رہگذر پر سفر کرتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ عقل کتنی صدیوں سے رواں ہے اور پھر بھی اس کے ماتھے پر کوئی شکن موجود نہیں ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ آنے والے زمانے میں عقل کے ذریعہ ہر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکے گا۔

سینۂ مہتاب پہ نقش قدم انسان کا
ہو کے سرشار تفاخر دے رہا ہے یہ صدا
اک قمر کافی نہیں ہے میری محنت کا صلہ
جتنے اجرام فلک ہیں اب یہ سن لیں برملا
عین ممکن ہے خلا ہو فتح شہروں کی طرح
سارے سیارے گنوں میں گھر کے کمروں کی طرح

عرفی ھاشمی کا موقف یہ ہے کہ عقل نے زمین و آسمان کو فتح تو کر لیا ہے لیکن اگر عقل کو علم کا عرفان حاصل نہ ہو تو بے مقصد ہے۔ انہوں نے گریز کرتے ہوئے اپنے موقف کو اس طرح اُجاگر کیا ہے۔

علم کا عرفان ہی حاصل نہ ہو تو عقل کیا
ظلمت فکر بشر زائل نہ ہو تو عقل کیا
شخصیت انسان کی کامل نہ ہو تو عقل کیا
علم و تمیز حق و باطل نہ ہو تو عقل کیا
خیر و شر ہوں سامنے جب خاک اور دُر کی طرح
عقل کی میزاں پہ کیجے فیصلہ حرؓ کی طرح

شاعر نے حضرت حرؓ کے فضائل و محاسن بیان کرتے ہوئے انہیں شجاعت کی تجلی' صداقت کا سراغ' زمین حریت پر فکر شبیریؑ کا باغ' ایوان منزل کا چراغ' آدمیت کے اُجالوں کا شرف' خادم ابن شہنشاہ نجف' حریت فکر کا بے مثال صدف' کربلا کا منفرد کردار' حریت کا ایزدی معیار' باعث بیداری ادوار اور شہید اولین کربلا قرار دیا ہے۔
شاعر نے کرب و بلا کے میدان میں حضرت حرؓ کی بے مثال شہادت قلمبند کر کے اپنے

اسی موقف کو اُجاگر کیا ہے کہ عقل و دانش اگر علم کے سائے میں پروان چڑھے گی تو کامیاب و کامران ہو جائے گی۔ اسی طرح موت مردانِ حق پرست کا راستہ ہرگز ہرگز نہیں روک سکتی ہے۔ اس مرثیے کا آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

زندگانی کی رمق تو حرؔ میں پہلے ہی نہ تھی
بات جب بنتِ علیؑ کی بے ردائی کی سنی
بن گیا سینے میں رُک کر سانس ہچکی موت کی
جسم کے زنداں سے آخر روح نے پرواز کی
موت سے کب نکہتِ اہلِ وفا مسدود ہے
حرؔ نہیں موجود لیکن حریّت موجود ہے

اس مرثیے کے بارے میں معروف ناقد **ڈاکٹر آغا سہیل** کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''—— سیّد آلِ رضا اور جوشؔ ملیح آبادی جدید اُردو مرثیے کے بانی مبانی ہیں۔ ان دونوں شعراء نے اس وقت کے عصری تقاضوں کو مدنظر رکھ کر صنفِ مرثیہ کو مادی جدلیت کے تفکر و تعقل سے ہم آہنگ کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک جدید مرثیہ نگاری اسی ڈگر پر گامزن ہے۔ عرفی ہاشمی سلمہٗ کے والد ماجد حضرت سیّد وحید الحسن ہاشمی اُردو کے رثائی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور عرفی سلمہٗ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے بموجب ان کے نقشِ قدم پر بھی چل رہے ہیں اور عصری حسیت سے بحمد اللہ نہ صرف واقف و آگاہ ہیں بلکہ مستقبل کے امکانات کے بھی عارف ہیں۔ میں نے ان کے تازہ مراثی میں ''میزانِ خرد'' کا بطورِ خاص مطالعہ کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ

خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے وہ صنفِ مرثیہ کو سرمایہ دار بنا رہے ہیں۔ ہماری موجودہ اکیسویں صدی اُردو کی جملہ اصناف میں جن شعرا سے بجا طور پر ارتقا کی اُمید رکھتی ہے' عرفی ہاشمی سلمہٗ ان میں نمایاں نظر آ رہے ہیں------''

("آغا سہیل ڈاکٹر (رائے) بجھے چراغوں کی روشنی الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۵ بار دوم ص ۱۲)

(ب) سیاستِ تبسم

''سیاستِ تبسم'' نامی مرثیہ ترپن (۵۳) بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ ۲۰۰۱ء میں تخلیق ہو کر ۲۰۰۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

سیاستِ تبسم نامی مرثیہ حضرت علی اصغر علیہ السلام کی بے مثال قربانی کے حوالے سے معرضِ تخلیق میں آیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں باغ افکار کے پھولوں کی مہک اس لیے زخمی ہے کہ گردن ذہن رسا پنجۂ طاغوت میں آ چکی ہے اور جسم کے تابوت میں روح ایک لاش بن چکی ہے۔ ہر ذی ہوش اپنے لبوں پر تالا لگائے خاموش بیٹھا ہے۔ حالاتِ حاضرہ کے ستائے ہوئے افسردہ و غم زدہ افراد بھی ''سب اچھا ہے'' کے منافقانہ نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اس طرزِ عمل کا منفی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ منافقانہ سیاست' بے راہ روی' بے ضمیری' تنگ نظری' کم ظرفی' ریا کیشی اور علم دشمنی ہمارے رگ و پے میں جاری و ساری ہو گئی۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم آج بھی کربلا سے ربط قائم کر لیں تو دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

کربلا جانتی ہے دورِ ستم کاری ہے
وحشت و دہشت و تخریب و دلآزاری ہے
درد ہے' زخم ہے' افلاس ہے خونباری ہے
پھر بھی اک قافلہ ہے جس کا سفر جاری ہے

یہ درِ فکر سجائیں گے کہ تعمیری ہیں
کربلا منتظر ان کی ہے جو شبیریؔ ہیں

شاعر احساس دلاتا ہے کہ جو قومیں اپنے دل میں حبِ حسینؑ کی شمعیں روشن کر لیتی ہیں ان کے لیے راہوں کی مشکلیں سہل ہو جاتی ہیں۔ شاعر کے نزدیک حسینؑ "جذبہ انسان کے لیے توانائی کا باعث ہے۔ یہ جذبہ پیغام وفا' درسِ خودداری وایثار و وفا' نقشۂ جادہ تسلیم ورضا اور آدمی میں چھپا انسان بیدار کرنے کا موجب بنتا ہے۔ بقول شاعر۔

اسی جذبے سے نمو پاتا ہے ارمانِ جہاد
کبھی دنیا تو کبھی خود سے ہے اعلان جہاد
کوئی دیکھے تو ذرا وسعتِ امکانِ جہاد
باپ کی گود کا بستر بھی ہے میدان جہاد

تیرگی شام کی جب روبہ اثر ہوتی ہے
ایک بچے کے تبسم سے سحر ہوتی ہے

عرفی ہاشمی کے نزدیک حضرت علی اصغر علیہ السلام کا تبسم حیات جاوداں' تحریکِ انسانیت' محافظ کعبہ' رمز شہادت' پیان وفا' بقائے ہستی' صبائے گلشن امن اور فضائے قدس کا ترانہ ہے۔ بقول شاعر۔

اس تبسم میں محمدؐ کی فراست بھی ملی
فاتحِ خیبر و خندق کی شجاعت بھی ملی
بانیٔ فلسفۂ امن کی سیرت بھی ملی
دستِ شبیرؑ پہ فردوسِ شہادت بھی ملی

چشمِ تحقیق اگر ذوقِ ہنر لائے گی
کربلا ایک تبسم میں نظر آئے گی

عرفی ہاشمی نے اس مرثیے کے آخر میں کرب و بلا کے میدان میں حضرت علی اصغر علیہ السلام کی شہادت کے مختلف رُخ بیان کیے ہیں اور احساس دلایا ہے کہ ان کے تبسم نے کس طرح کربلا کی جنگ کو فتح و کامرانی سے ہم کنار کیا ہے۔ شاعر نے شہادت حضرت علی اصغرؑ کے دردناک مناظر کو بڑے سلیقے سے اُجاگر کیا ہے۔ خاص طور پر اس معصوم بچے کی شہادت کے حوالے سے شاعر نے ماں اور بیٹی کے جذبات بڑی ہنرمندی سے پیش کیے ہیں۔ اس تمام المناک صورت حال میں بھی شاعر اپنے مقصد اور موضوع سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ اس مرثیے کا آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

حال دل ماں کا جو اشکوں کی زباں نے کھولا
خشک ہونٹوں سے تبسم کے اُجالوں نے کہا
نہیں کچھ اس کے سوا جہد وفا کا قصہ
کفر سے جنگ تھی اس جنگ میں حق جیت گیا
اک صدا ہونٹوں سے تا دیدۂ بیدار گئی
ایک بچے کے تبسم سے اَجل ہار گئی

اس مرثیے کے حوالے سے معروف دانشور اور نقاد **ڈاکٹر سلیم اختر** کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"۔۔۔۔ مرثیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں متعدد اصناف سخن کے ذائقوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اسی لیے مرثیہ کہنا آسان نہیں کہ مرثیہ نگار کو مرثیے کی تشکیل کرنے والے فنی محاسن سے وابستہ ہیئت اور

اسلوب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے تاہم دیگر مرثیہ نگاروں کی طرح سید عرفی ہاشمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیوں میں کسی طرح بھی مرثیے کی ہیئت اور اسلوب کی جمالیات سے وابستہ تقاضوں کو مجروح نہ ہونے دیا اور یہ احساس دلایا کہ

ع راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں

عرفی ہاشمی جیسے نوجوان مرثیہ نگار کی تخلیقی کاوشیں ان کی شاعرانہ ہنرمندیوں کا احساس دلاتی ہیں۔ حضرت علی اصغرؑ کے تیر کھانے کے بعد آخری تبسم کے حوالے سے جب وہ مرثیہ بعنوان ''سیاستِ تبسم'' رقم کرتے ہیں تو ایک بچے کی المناک شہادت کے حوالے سے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ انہوں نے اس مرثیے کو آہ و بکا کی سطح سے بلند کر کے عصر حاضر کے لیے ایک آئینہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس مرثیے میں جو فنی پختگی نظر آتی ہے وہ عرفی ہاشمی کے کامیاب مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ مجھے ان سے اسی طرح کے اور بھی اچھے مرثیوں کی توقع ہے

''______

(ڈاکٹر سلیم اختر سیاستِ تبسم (رائے) بجھے چراغوں کی روشنی الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۵ ص ۷۳)

(ج) محنت اور ادیب

''محنت اور ادیب'' عرفی ہاشمی کا ایک منفرد مرثیہ ہے جو ۲۰۰۲ء میں کہا گیا اور ۲۰۰۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ باون بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ فکری اور فنی ہر اعتبار سے قابل قدر اور لائق صد تحسین ہے۔

''محنت اور ادیب'' میں شاعر نے اکیسویں صدی کو ہوس کا نقیب قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اب مفاد ذات کا سایہ اتنا مہیب ہو گیا ہے کہ پہلے بشر

غریب ہوتا تھا لیکن اس صدی میں بشریت غریب ہو گئی ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ انسان کا چراغِ ضمیر بجھ چکا ہے۔ ملکِ ادب کو ثقافت کے نام پر لوٹ لیا گیا ہے اور تہذیب مدرسے کے دریچوں میں کہیں سو گئی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا مدِ مقابل بنا لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عصرِ حاضر کا ادب جدید زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اسی لیے معاشرے میں ادب اور ادیب کی حیثیت کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ عرفی ہاشمی نے اس صورتِ حال کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

دلچسپ کس قدر ہے تماشائے زندگی
راہِ عمل سے کٹ کے کہاں جائے زندگی
ایسے ادب سے خود کو جو بہلائے زندگی
عبرت کے مدفنوں میں نظر آئے زندگی
کیا زندگی کا ایسے ادب سے نباہ ہو
فٹ پاتھ جس کی آخری آرام گاہ ہو

عرفی ہاشمی کا موقف یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے ادب کو پیامِ عمل سے مالا مال ہونا چاہیے اور جب تک ادب میں عہدِ جدید کے مسائل کا حل نہیں ہو گا وہ قارئین کے لیے قابلِ قبول نہ ہو گا۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بند بھی ملاحظہ فرمائیے:

جب منزلِ عمل سے ہوا دور یہ ادب
ہر زاویے سے ہو گیا مقہور یہ ادب
بھٹکے ہوئے شعور کا منشور یہ ادب
اجرت عذابِ زیست ہے، مزدور یہ ادب

اجڑا ہوا ہے مصر کے بازار کی طرح
تاریک ہے یزید کے کردار کی طرح

شاعر کا موقف یہ ہے کہ عصر حاضر کے ادب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اسے انسان کے مسائل و معاملات کا نگہدار ہونا چاہیے۔ اسی طرح شاعروں اور ادیبوں کو بھی چاہیے کہ وہ قول وفعل کے تضادات کو ختم کرنے کی سعی کریں اور دوش فن پر پڑی ہوئی تصنع کی شال اُتار کر پھینک دیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ شہرت اور داد و دہش کا خیال دل سے نکال کر حق و صداقت کی ایسی شمع روشن کریں جو گیسوئے ملک وقوم سنوار دے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اگر تخلیق کار شعروادب کی معراج حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرح محنت و مشقت کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ شاعر نے محنت و مشقت کی عظمتیں بیان کر کے اہل دانش پر یہ نکتہ باور کرایا ہے کہ کرب وبلا کے میدان میں امام عالی مقام اور ان کے انصار و اقربا نے محنت کے ساتھ جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ صفحۂ ہستی پر ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔ اس مرثیے کا آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

اس حشر میں بھی عظمت کعبہ کا پاسباں
اپنے بدن پہ اوڑھ کے زخموں کی کہکشاں
ہاتھوں میں ہتھکڑی لیے، پیروں میں بیڑیاں
محنت کی شاہراہ پہ دیتا رہا اذاں
سرمایۂ پیامِ اب و جد بچا لیا
محنت سے اپنی، دینِ محمدؐ بچا لیا

عرفی ہاشمی کے اس یگانہ مرثیے کے حوالے سے معروف نقاد، دانشور اور محقق

ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

''——— مرثیہ کی تخلیق شہدائے کربلا کی عزاداری سے وابستہ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ ان شہیدوں کی عزاداری ہے جنھوں نے باطل کی یزیدی قوتوں کے سامنے حق کا پرچم زندگی کے آخری لمحات تک سربلند رکھا اور ایسی قدروں کی پاسداری کی جو مستقبل کے عالمی انسان کو دائمی راہنمائی فراہم کریں اور ایک مستحکم اخلاقی نظام کی تبلیغ عام کردیں' اہم بات یہ کہ مرثیہ کی بیانیہ شاعری میں مرورِ ایام میں جو وسعتیں پیدا کی گئیں' ان کا مرکز و محور تو امامِ کربلا کی شہادت ہی تھی لیکن زمانے کے تقاضے کے مطابق اخلاقی' ادبی اور فنی روایات کے علاوہ سماجی اور تہذیبی اقدار کی پیشکش کو بھی اہمیت دی جانے لگی' چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ مرثیہ کے فنی فروغ میں اعلیٰ ترین خدمات برصغیر ہند میں میر انیس اور مرزا دبیر نے انجام دی تھیں اور آزادی کے بعد پاکستان میں مرثیہ کو جدیدیت کی راہ پر گامزن کرنے اور نئے امکانات منور کرنے میں یہ خدمات سیّد وحید الحسن ہاشمی نے ادا کیں' چنانچہ اب جو مرثیہ لکھا جارہا ہے' اس نے موضوع کی بنیادی مرکزیت کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی تمام جہات میں قلم آرائی کی ہے۔

عرفی ہاشمی ''دبستانِ وحید الحسن ہاشمی'' کے ایک ایسے فرد ہیں' جن کی تربیت ہی جدید مرثیے کے گہوارے میں ہوئی ہے۔ میں نے ان کی چند تخلیقات رسالہ ''شام وسحر'' میں پڑھیں تو احساس ہوا کہ وہ حالیہ دور کے زوال پذیر معاشرے کو نہ صرف غائر نظروں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اس معاشرے کی ''یزیدیت'' پر تلخ وترش ردعمل بھی ظاہر کررہے ہیں' ان کے تخلیقی عمل کی مثبت جہت یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے مضبوط

معاشرے کی تعمیر کے لیے ان کے سامنے شہید کربلا کی سیرت اور عمل مثالی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کا اساسی موضوع اس عہد کی معاشرتی' اخلاقی' ادبی اور تہذیبی زندگی ہے جو زوال کی زد میں ہے۔ عرفی ہاشمی کا مختصر مرثیہ ''محنت اور ادیب'' اکیسویں صدی کے آغاز کے برسوں میں اس وقت لکھا گیا جب اردو معاشرے کا ادیب قعرِ مذلت میں ڈوب چکا تھا' خودداریوں کا کھیل ہوس کا نقیب بن چکا تھا' مفاداتِ ذات کی چوہا دوڑ میں ادیب اپنا آفاقی مقام کھو چکا تھا اور ''سگِ دنیا'' بن کر ادب سے بے بہرہ سرکار دولت مدار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کر رہا تھا۔ عرفی ہاشمی کا تاثر یہ ہے کہ پہلے بشر غریب تھا لیکن وہ غیور تھا' خوددار تھا اور اپنی خودی کا محافظ و پاسبان تھا لیکن اب بشریت غریب ہو چکی ہے اور احساسِ زیاں تک جاتا رہا ہے حتیٰ کہ آج کا مشہور اور مقبول ادیب اپنی شہرت کے تحفظ کے لیے ایسے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے جہاں انصاف کے نام پر بے انصافی کا سکہ چل رہا ہے۔ عرفی ہاشمی کا یہ مرثیہ مختصر ہے لیکن یہ وسیع المعانی اور وسیع الجہات ہے۔ ادب کے وسیع تناظر میں مرثیے کی ''ٹیپ'' ایسی مجسم حقیقت ہے جس کا درد محسوس کرتے کرتے نرگس بے نور ہو جاتی ہے اور ٹیپ ضرب المثل بن جاتی ہے۔ ان کا روئے سخن کسی مخصوص شخصیت کی طرف نہیں بلکہ سب کی طرف ہے

اک داغ ہے وہ دامنِ افکار کے لیے
تخلیق جس ادب کی ہو بازار کے لیے

....

کیا اس ادب کا سلسلہ معیار سے ملے
معیار کی سند جسے اخبار سے ملے

عرفی ہاشمی کا یہ مرثیہ معنوی طور پر ایک ''ادب آشوب'' ہے لیکن وہ جب
ذکرِ امام کربلا کی طرف آتے ہیں تو ان کی رجائیت ہویدا ہوتی چلی جاتی
ہے اور ان کا صحت مند مقصد قاری کے ذہنی اُفق پر محبت کے چراغ
روشن کر دیتا ہے۔ میں اس مرثیے کی اشاعت کا منتظر ہوں اور یہ دیکھنے
کا آرزو مند ہوں کہ ہمارا بیمار معاشرہ اور بدنصیب ادیب اس مرثیے
سے عملی طور پر کس طرح استفادہ کرتا ہے۔''

(انور سدید/ڈاکٹر عرض سدید (رائے) مملوکہ راقم الحروف الرقومہ ۳۰ جنوری ۲۰۰۵ء، لاہور)

(۵) اکیسویں صدی اور کربلا

''اکیسویں صدی اور کربلا'' نامی مرثیہ سینتالیس (۴۷) بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ ۲۰۰۳ء میں تخلیق ہو کر ۲۰۰۵ء میں طبع ہوا۔

''اکیسویں صدی اور کربلا'' میں عرفی ہاشمی نے محورِ تکنیک سے ہٹ کر یقین کی بات کرنے کا عزم کیا ہے۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ اب ہمیں گزری ہوئی بیس صدیوں کے بجائے اکیسویں صدی کی بات کرنا چاہیے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اکیسویں صدی بیس صدیوں کا خون پی کر جوان ہوئی ہے اور اسی باعث یہ صدی کوفی و شامی کے وعدوں کی طرح بے اثر ہے اور اس کے کاندھوں پر کئی اقدار کا جنازہ دھرا ہے۔ اس سلسلے میں ایک فکر انگیز بند آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

اس کی پیشانی کا جھومر مادّے کا ارتقا
اس کی آنکھوں کی کشش ایجادِ پیہم کی ضیا
اس کے رخساروں کی تابش تابکاری جابجا
اس کے دل کی دھڑکنیں سرمایہ داری کی بقا

حُسن اسکا عارضی ہے دارِ فانی کی طرح
یہ صدی بھی ہے زلیخا کی جوانی کی طرح

شاعر احساس دلاتا ہے کہ یہ صدی محض تجربوں کی برتری کا دور ہے اور اب یہ قوموں کا نہیں بلکہ ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صدی مستقل کرب و بلا سے کم نہیں ہے۔ اس صدی میں نسل انسانی رو بہ زوال ہو گئی ہے۔ کئی ممالک زوال آمادہ ہو جائیں گے اور سینکڑوں قد آور شجر زمیں بوس ہو جائیں گے۔ اس صدی کو ایک اور مسئلے سے بھی دو چار ہونا ہوگا۔ ملاحظہ فرمایئے:

یہ صدی ازخود مسائل کا بڑا انبار ہے
روٹی، کپڑے اور مکاں کا ہر طرف اصرار ہے
نفسیاتی طور پر اتنا بشر بیمار ہے
جسم کے نیزے پہ سر ہے، سانس اک تلوار ہے
غربت و بیماری و ناخواندگی کا غم بھی ہے
ان میں شامل بڑھتی آبادی کا ایٹم بم بھی ہے

عرفی ہاشمی کے نزدیک اس صدی نے جہاں بہت سے ضرر رساں پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے وہاں اس نے دہر کو آسائشوں کی کہکشاں سے بھی بھر دیا ہے۔ تاہم ایک بات طے ہے کہ اس صدی نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دولت عطا کرنے کے باوجود بھری دنیا میں انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ شاعر کو اس بات کا بے حد قلق ہے کہ وہ اس صدی میں نارسائی کا زہر پی رہا ہے اور اس بھری دنیا میں بھی خود کو تلاش کر رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ الم انگیز بات یہ ہے کہ

جب سے ان تنہائیوں کا زہر پینا آ گیا
بے حسی سے بزدلی کا زخم سینا آ گیا
ذہن میں بدبختی' سوچوں میں کینہ آ گیا
اس صدی میں مجھ کو جینے کا قرینہ آ گیا
اعتبارِ ذات کھو کر مصلحت کے گھر میں ہوں
کلمہ گو ہوں اور یزید وقت کے لشکر میں ہوں

شاعر احساس دلاتا ہے کہ یہ صدی بے ضمیر آدمی کی شمر سازی میں مدد کرتی ہے۔اس صورتِ حال میں کربلا طلوع ہوتی ہے اور اپنا مثبت کردار ادا کرتی ہے۔شاعر کے نزدیک کربلا ایک حادثاتی واقعہ نہیں ہے اور نہ یہ ذاتی مفادات کی معرکہ آرائی کا نام ہے۔شاعر کے نزدیک کربلا کیا ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

منفعل بے روح پیکر ہی نہیں ہے کربلا
جنگ میں سامان لشکر ہی نہیں ہے کربلا
خاک و خوں ریزی کا منظر ہی نہیں ہے کربلا
اشتہارِ صبحِ محشر ہی نہیں ہے کربلا
موت سینے سے لگا کر زندگی کرنے کا نام
کربلا ہے دل جلا کر روشنی کرنے کا نام

شاعر احساس دلاتا ہے کہ کرب و بلا کے ریگزار میں امام عالی مقام نے خود احتسابی کے لیے شب عاشور میں چراغوں کو گل کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔اصحاب حسینؑ نے اپنے طرزِ عمل سے اہل محبت پر یہ راز آشکار کر دیا ہے کہ باطل کے سامنے سینہ سپر رہنا ہی حق شناسی ہے۔شاعر نے کمال مہارت سے شب عاشور کے فضائل

اُجاگر کیے ہیں اور آخری بندوں میں ایک المیاتی فضا قائم کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔اس مرثیے کے آخری بند کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیئے کہ شاعر نے کس طرح حزنیہ کیفیت پیش کی ہے۔

شدت احساس غم سے نیم جاں ہیں بیبیاں
اپنے پیاروں کے لیے گریہ کناں ہیں بیبیاں
ضبط کی حد رہ گئی پیچھے جہاں ہیں بیبیاں
دیکھ لیں عباسؑ و اکبرؑ اب کہاں ہیں بیبیاں
راہِ احساسات میں اک درد کا موسم بھی ہے
شام کے بازار میں بے پردگی کا غم بھی ہے

اس مرثیے کے حوالے سے معروف شاعر اور دانشور **شہزاد احمد** کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"—— اس کو بھی ایک ایسے ہی سمجھئے کہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری دور میں "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی۔ وہ بھی کئی لحاظ سے مرثیے ہی کی ایک شکل کہی جاسکتی ہے۔ اگرچہ اسے مثنوی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ عرفی ہاشمی نے اس سرے کو وہاں سے پکڑا ہے جہاں اقبال نے اسے چھوڑا تھا۔ فردا کے بارے میں پیش گوئی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی غیر معمولی وژن کے بغیر ایسا کرنا ممکن بھی نہیں ہوتا۔ عرفی ہاشمی نے لمحۂ حال کے حوالے سے ماضی و مستقبل دونوں کو ایک ہی لمحے میں گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے متناقضات (Paradoxes) اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ ہم عصر صورتِ حال کی طرح اس مرثیے کو بھی بہت سے زاویوں سے دیکھا

جا سکتا ہے۔ فلکیات والے کہتے ہیں کہ آسمان کو آپ کہیں سے بھی دیکھیں وہ ایک جیسا نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس مقولے کا اطلاق زیرِ نظر مرثیے پر بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کریں اس کی صورت گری میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ______"

(شہزاد احمد اکیسویں صدی اور کربلا بجھے چراغوں کی روشنی الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء ص ۱۸۴)

سید عرفی ہاشمی کے مرثیوں کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ صنفِ مرثیہ سے طبعی رغبت رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے جدید اور مختصر مرثیوں کے ذریعہ اس صنف کی آبیاری کی بلکہ اس کے تحفظ اور فروغ کے لیے جدید تر نظریات بھی وضع کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفی ہاشمی کی پیش کردہ تجاویز سے استفادہ کر کے ہم اس کلاسیکی صنف کو جدید رویوں کا علمبردار بنا سکتے ہیں۔

عرفی ہاشمی کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مرثیہ نگاری کی دو خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ا) جدید سائنسی اور ٹیکنالوجی کے نظریات کا اظہار

ب) جدت اور کلاسیکیت کا حسین شعری امتزاج

اب ذیل میں ان دونوں خصوصیات کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

عرفی ہاشمی سائنس، ٹیکنالوجی اور بزنس کے آدمی ہیں اور وہ شعر و ادب اور خصوصاً مرثیے کو بھی اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی اپنی رائے ملاحظہ فرمالیجیے:

"______ میں بنیادی طور پر بزنس اور ٹیکنالوجی کی فیلڈ سے متعلق ہوں۔ جدت اور Innovation میرا سرمایہ اور شناخت ہونے کے ساتھ

ساتھ میری مجبوری بھی ہیں۔ اپنے احساسات اور خیالات کے اظہار کا حق مجھے بہترین ذریعۂ اظہار کی تلاش پر مجبور کرتا ہے۔ میرا یہ حق اظہار کسی صنفِ سخن کا مرہونِ منت نہیں بلکہ ہر صنفِ سخن اس حق اظہار کی بدولت ہے' یہی استحقاق میری مرثیہ گوئی کا جواز ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کیلئے مجھے مرثیے سے زیادہ کشادہ کوئی اور صنف محسوس نہیں ہوئی۔ سو میں مرثیہ لکھتا ہوں' مرثیے میں بولتا ہوں' اپنے اور معاشرے کے تشخص کو مرثیے کی میزان پر تولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس شعوری تجزیے کے بعد اپنے احساسات و خیالات کو مصرعوں کی شکل میں صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اس سے آگے کا کام میرا نہیں ہے ——"

(عرفی ہاشمی بجھے چراغوں کی روشنی لاہور: الحسن پبلی کیشنز بار دوم ۲۰۰۵)

درج بالا معروضے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ عرفی ہاشمی نے اپنے مرثیوں میں جدید سائنسی افکار و نظریات کو جگہ دی ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی بھی مقام پر شعریت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کا اسلوب شعر خیال کا تابع دکھائی دیتا ہے۔ آپ ان کے مرثیوں کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان میں جدید تر سائنسی افکار موجزن ہیں یا نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ تمام بندوں میں شعریت بھی موجود ہے۔

منزلِ انجام پر ہے بیس صدیوں کا سفر
بیس صدیاں اپنے دامن میں لئے ہیں وہ گہر
جن سے روشن ہے تمدّن کی شعوری رہگزر
زندگی جن کی بدولت آج ہے معراج پر

زندگی اس راہ پر رفتار اپنی دیکھ کر
ہنس رہی ہے چاند تاروں کی بلندی دیکھ کر

....

عقل انسانی کا یہ مربوط دورِ ارتقا
تجربوں کی یہ فلک بوسی یہ تسخیرِ خلا
یہ لگن، یہ دھن، یہ کاوش، یہ طلب، یہ تجربہ
تجربوں کی حد میں پروازِ خرد کا سلسلہ
کیا خبر کل تجربہ کوئی معاون ہو سکے
دھوپ اپنے پاؤں پر دنیا میں ساکن ہو سکے

....

عقلِ انساں عازمِ تسخیرِ کل افلاک ہے
ہر عروجِ کن فکاں پر ثبت اس کی دھاک ہے
ہر بلندی اس کی نظروں میں قدم کی خاک ہے
برق سے بھی تیز اس کا توسنِ بے باک ہے
عقلِ انساں فتح کا پرچم قمر پر گاڑ کر
آسماں کو تک رہی ہے گردِ دامن جھاڑ کر

....

زندگی کی اس بلندی کو پرکھیے عقل سے
عقل سے روشن ہیں انساں کی بقا کے راستے
راستوں کے پیچ و خم میں جستجو کے قافلے
مستقل طے کر رہے ہیں ارتقائی مرحلے

مرحلے جن کو نظر انداز کرنا موت ہے
اس سفر میں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا موت ہے

....

بحرِ ایجادات کی بڑھتی ہوئی طغیانیاں
طبعِ انسانی کی ندرت آفریں جولانیاں
اپنے ذہنوں میں سجائے بے شمار آسانیاں
خم کیے ہیں مشکلاتِ دہر کی پیشانیاں
کیا خبر پہنچے یہاں تک عالمِ ایجاد بھی
موم ہو جائے نظر کی ضرب سے فولاد بھی

....

موجزن عقلِ بشر میں آرزوئے ارتقا
آرزوئے ارتقا میں محنتوں کی ابتدا
محنتوں کے زیرِ سایہ تجربوں کا سلسلہ
تجربوں سے ضوفشاں دریافتوں کا راستہ
کیا خبر منظر ہو کل یہ چشمِ حیرت کیلئے
چل کے آئے خود کنواں پیاسے کی خدمت کیلئے

....

عرفی ہاشمی ''دبستان وحیدالحسن ہاشمی'' سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا مرثیے کی کلاسیکی روایت سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ وہ دراصل اس حقیقت سے کما حقہٗ آگاہ ہیں کہ جدت ہمیشہ روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جدید

مرثیوں میں بھی کلاسیکل اساتذہ کے مصرعوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ بات کو سلیقے سے پیش کرنے کے عادی ہیں یہی سبب ہے کہ وہ جدید شعر میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا لفظ ضرور رکھ دیتے ہیں جو قدیم کلاسیکی روایت سے ان کا ناتہ جوڑ دیتا ہے۔ عرفی ہاشمی کی یہی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں سے ممتاز کرنے کا سبب ہے۔ آپ مختلف مرثیوں کے منتخب درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمالیجئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کتنی مہارت اور سلیقے سے جدت وقدامت کا حسین امتزاج پیش کردیا ہے۔

سینۂ مہتاب پر نقشِ قدم انسان کا
ہو کے سرشارِ تفاخر دے رہا ہے یہ صدا
اک قمر کافی نہیں ہے میری محنت کا صلہ
جتنے اجرامِ فلک ہیں اب یہ سن لیں برملا
عین ممکن ہے خلا ہو فتح شہروں کی طرح
سارے سیارے گنوں میں گھر کے کمروں کی طرح

....

حالتِ غیظ و غضب دیکھی جو موجِ تند کی
عقلِ انساں لے کے اوزارِ ہنر آگے بڑھی
جب غرورِ بحر پر تدبیر کی ضربت لگی
شرمساری کی شفق سرخ آنسوؤں میں ڈھل گئی
یہ حبابوں کے گہر جو موج کی چلمن پہ ہیں
اشک کے قطرے لباسِ بحر کے دامن پہ ہیں

....

عقل کا اصرار تھا شبیرؑ وہ انسان ہے
جس کی قندیلِ سخن کی روشنی قرآن ہے
جس کے منشورِ عمل کا برملا اعلان ہے
کربلا اسلام کے دستور کا عنوان ہے
قوتِ شبیرؑ کی منہ بولتی تصویر ہے
کربلا مظلوم کی سب سے بڑی جاگیر ہے

....

حرملہ تو نے بڑے جوش سے پھینکا تھا جو تیر
پہلا مقتول تھا اس تیر کا خود تیرا ضمیر
چاند بن جائے جہاں صبح کی عصمت کا سفیر
چاندنی کیا ہو وہاں شام کی بانہوں میں اسیر
وہ عمل حرملہ تو جس کو ہنسی سمجھا ہے
بے بسی پر تری اِک قہقہہ تاریخ کا ہے

....

اکیسویں صدی کا تعارف عجیب ہے
خودداریوں کا کھیل ہوس کا نقیب ہے
اتنا مفادِ ذات کا سایہ مہیب ہے
پہلے بشر تھا اب بشریت غریب ہے
یہ خارِ غم بھی فکر کی پھلواریوں میں ہے
وَرثہ ہمارا شیشے کی الماریوں میں ہے

شورشِ تخریب بھی ہے منظرِ تعمیر بھی
انتشارِ فکر بھی ہے حرمتِ تدبیر بھی
ظلم کی ضربِ گراں بھی، صبر کی تاثیر بھی
یہ یزیدی ظلم بھی ہے عصمتِ شبیرؑ بھی
وسعتِ احساس میں شہرِ تصور کی طرح
یہ صدی بھی ہے فضائے خیمۂ حُرؑ کی طرح

....

اس قدر معکوس ہے اس کے ادب کا ارتقا
وہ ادیبِ وقت ہے جسکو نوازے میڈیا
کیا فن، کیا ہنر، معیار سے کیا رابطہ
لوگ اب کہنے لگے شعر و ادب کو سانحہ
عنقریب اس سانحے پر تبصرہ آ جائے گا
شاعری پر شاعروں کا مرثیہ آ جائے گا

....

کیا فقط اک حادثاتی واقعہ ہے کربلا
کیا مفادِ ذات کا اک معرکہ ہے کربلا
کیا کسی املاک کا جغرافیہ ہے کربلا
کیا مجالس میں خطیبوں کی ادا ہے کربلا
روحِ دیں، فرشِ عزا پر ہی نہ سو جائے کہیں
کربلا جلسے جلوسوں میں نہ کھو جائے کہیں

کتنے مہ پارے تھے جو راہِ سفر میں کھو گئے
گر گئے اونٹوں سے اور پیوندِ صحرا ہو گئے
شام تک کی رہگزر اپنے لہو سے دھو گئے
گودیوں میں سونے والے راستوں میں سو گئے
دفن کچھ دل میں ہوئے کچھ آنسوؤں میں بہہ گئے
ماؤں کے سب خواب صحرا میں بکھر کر رہ گئے

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں صنفِ مرثیہ کے کوچے میں وہی قدم رکھ سکتا ہے جسے جملہ اصنافِ سخن پر عبور حاصل ہو۔ سیّد عرفی ہاشمی نوجوان شعرا کی اس صف میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنہوں نے بہت کم عرصہ میں چار جدید مرثیہ تخلیق کر کے صاحبانِ فہم و ذکا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد بلا خوف و تردد کہا جا سکتا ہے کہ اب پاکستان میں اُردو مرثیے کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

◆◆◆

maablib.org

◆◆◆

'شامِ شہرِ وصال' کا شاعر۔ احمد شہزاد

◆◆

ایک سوال ناقدین کے درمیان باعثِ نزاع رہا ہے کہ کیا شاعری محض اظہارِ صداقت کا نام ہے؟؟ اردو میں مولوی حالی نے پہلی مرتبہ سچائی اور صداقت کو شاعری کا جزوِ اعظم قرار دیتے ہوئے اصلیت پر بے پناہ زور دیا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ جس خیال پر شعر کی بنیاد رکھی جائے وہ اصلیت پر مبنی ہونا چاہیے۔ مولوی حالی کے نزدیک مبالغہ اصلیت کی بربادی کا موجب بنتا ہے لہٰذا انہوں نے شاعری میں مبالغہ کو گردن زدنی قرار دے دیا۔ حالی کے اس مؤقف نے اخلاقیات کو تو فروغ دیا تاہم شعر کو شعریت سے محروم کر دیا۔ **احمد شہزاد** بھی حالی کے قبیل کے شریف شاعر ہیں۔ وہ محبت میں اخلاص کے قائل ہیں اور اس زر پرست معاشرے میں وہ محبت و اخوت کے چراغ روشن کرنے کے متمنی ہیں۔ یہ طرزِ احساس احمد شہزاد کے دل میں استغنا پیدا کرتا ہے اور وہ معاشرے کے دیگر لوگوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔

ہر شخص کو جس بات پہ اصرار بہت ہے
اس دل کو اسی بات سے انکار بہت ہے
اک وہ کہ اسے قصرِ فلک بوس بھی کم ہے
اک میں کہ مجھے سایۂ دیوار بہت ہے

آیئے سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ احمد شہزاد کا شاعری کے بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے اور وہ اپنی شاعری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟؟

''شاعری لفظ و معنی کا وہ باب ہے جو ایک بار اسے وا کر کے اقلیمِ ادب میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اسی کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔ ایک طرف شامِ شہرِ وصال کی رعنائیاں حاصل ہوتی ہیں تو دوسری طرف سرِ شہرِ فراق کی کٹھنائیاں یعنی کبھی وصل کی بارشوں کی پھوار سے بھیگتا ہے تو کبھی ہجر و فراق کی تپتی لُو کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں محبتوں کے گل رنگ سائے نظر آتے ہیں تو کہیں نفرتوں کے کانٹے بھرے دشوار راستے، انہی راستوں پر چلتے ہوئے کبھی دوست اپنی دوستی کو معراج پر پہنچاتے ہیں تو کبھی عدو کے وار بھی سہنا پڑتے ہیں۔
کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ خوشی پھولوں کی مانند کھل کر سارے عالم کو مہکا دیتی ہے اور کبھی غم کے آنسو رم جھم پھوار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ موسمِ کرب جب شدت اختیار کر جاتا ہے تو پھر درد کے گلاب کھل اٹھتے ہیں اور لہو دہائی دیتا ہے تو ایسے میں کہیں کوئی حرفِ حق کی صدا بلند کرتا ہے تو کہیں کوئی لب بستہ دکھائی دیتا ہے...... سو...... یہی میرے خواب ہیں اور یہی میرے خیال...... اور میں نے اپنی شاعری انہیں خوابوں اور خیالوں سے کشید کی ہے...... میں پیرائیہ اظہار سے زیادہ قوتِ اظہار کا قائل ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ تکنیکی موشگافیوں میں پڑے بغیر اپنی بات ضرور کہہ دینی چاہیے کیونکہ ابلاغ سب سے اہم شے ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ احمد شہزد بھی مولوی حالی کی طرح شعر میں حقیقت کے متلاشی ہیں لیکن ان کے نزدیک بڑی شاعری میں زود اثر ہونے کی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے

کہ شعر میں تاثیر اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کا لہو لفظوں میں سرایت کر جائے۔

جس شعر کی خصلت میں نہیں کچھ بھی حقیقت
اس شعر کو پھر زود اثر کون کہے گا

شاعری ایک ایسی خوشبو کی مانند ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اُسے چھونا محال ہے۔ شاعر محض اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا کو ہی اپنی شاعری میں محفوظ کرنے کا فریضہ ادا نہیں کرتا بلکہ وہ تخن سے ماورا بھی جھانکنے کی سعی کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک جیسی چیز مختلف شاعروں کے ہاں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ باکمال شاعر ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے پر قدرت رکھتا ہے۔ احمد شہزاد اس لحاظ سے منفرد شاعر ہیں کہ انہوں نے کائنات کو ایک نئے تناظر میں دیکھا ہے اور ان کی دیرینہ حسرت ہے کہ وہ اس نادیدہ کائنات کے اسرار و رموز سے پردہ اُٹھا دیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں ایک نیا جہان سانس لے رہا ہے۔ اگر آپ اس جہان کی سیر کے متمنی ہیں تو 'شامِ شہرِ وصال' کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے، آپ کو خود محسوس ہوگا کہ آپ کی نگاہوں کے سامنے جہانِ تازہ میں افکارِ تازہ کی نمود ہو رہی ہے۔

نیا سفر ہے کوئی پرانی یہاں حکایت نہیں چلے گی
گلاب شہروں میں کوئی کانٹوں بھری روایت نہیں چلے گی

احمد شہزاد کی شاعری میں تیقن کی ایک فضا بھی موجزن ہے۔ وہ اس بگڑتے ہوئے معاشرے کو سنوارنے کے متمنی ہیں اور انہیں یقین واثق ہے کہ آئندہ آنے والے زمانے میں حالات یکسر بدل جائیں گے۔ وہ احساس دلاتے ہیں کہ اب ہمیں نئے سفر کی جانب روانہ ہونا ہے لہٰذا ہمیں ایک نئے عزم سے سفر شروع کرنا چاہیے اور بدباطنوں اور بدخصلتوں کے مذموم مقاصد و عزائم سے باخبر رہنا چاہیے۔ آپ ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور اس میں موجزن یقین دیکھیے:

نیا سفر ہے پرانی کوشش نہیں چلے گی
گلوں میں خاروں کی کوئی سازش نہیں چلے گی
ملا ہے اذنِ کلام اہلِ وطن کو آخر
یہاں زبان و قلم کی بندش نہیں چلے گی
وہ اعتراض اور حرف گیری کا دور گزرا
وہ مخبروں پہ جو تھی نوازش نہیں چلے گی
اگر ہے دشمن تو دوستی کا لباس کیوں ہے
تری بناوٹ تری نمائش نہیں چلے گی
یہ تیری پرواز تیرے رستے کی ہے رکاوٹ
فضاؤں میں تیری کوئی لغزش نہیں چلے گی

احمد شہزاد کی شاعری میں ناصحانہ فکر اور اخلاقی موعظت تو نہیں ہے تاہم وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے پرچارک ضرور ہیں۔ وہ ناصح یا واعظ بن کر معاشرے کے تمام افراد کو ایک چھڑی سے ہانکنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ ایک صلح جُو عاشق کی طرح معاشرے میں محبت اور اخوت کے فروغ کے لیے مستعد نظر آتے ہیں تاہم اس موقع پر بھی ان کا لہجہ پر تیقن ہوتا ہے۔ دیکھیے کہ وہ اس زر پرست معاشرے میں بھی شعر و ادب کے چراغ فکر روشن کرنے کے طلب گار ہیں۔

سخنوری کے سوا نہیں کوئی اور دولت
ہے پیار ہم سے تو زر کی خواہش نہیں چلے گی

احمد شہزاد ایک طویل عرصے سے مسقط میں مقیم ہیں اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں خوب جانے پہچانے جاتے ہیں تاہم وطن سے دوری کا احساس انہیں ہر لمحہ بے کل کیے رہتا ہے۔ وطن کی روشن صبحیں اور نشاط پرور شامیں ان کے دل کو بے قرار کر دیتی

ہیں اور وہ وطن کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

عذابِ دربدری نے ذرا سکوں نہ دیا
جو اپنا گھر کہیں ہوتا تو گھر گئے ہوتے
ایک بار دیکھ کر عمر بھر نہ دیکھ پائے
عمر سب گزر گئی اور گھر نہ دیکھ پائے

احمد شہزاد کا شعری مجموعہ 'شامِ شہرِ وصال' موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کے منفرد اسلوب کا ضامن بھی ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرما لیجیے اور دیکھیے کہ احمد شہزاد نے کس طرح انفرادی لب و لہجے کے اشعار تخلیق کیے ہیں۔

اُس کی ہر گفتگو میرے دل میں
ابتدا میں ہے انتہا کی طرح

....

جلا گئی ہے چلی دھوپ ہجر کی
رقم تھے وصل میں جو باب شام کے

....

بہار اب انہیں کہاں تلاش کرنے جائے گی
وہ تتلیاں جو اُڑ گئی ہیں خشک گھاس دیکھ کر

....

باہر سے میں اک محل نما ہوں
اندر اندر سے شکستہ پا ہوں

....

یہ آرزو تھی کہ لشکر لیے اُجالوں کا
تمہاری بزم میں مثلِ سحر گئے ہوتے

طاق میں رکھے دیے کو یہ بجھایا کس نے
اب یہ الزام ہواؤں ہی کے سر جاتا ہے

....

ہم کو دیکھیں کہ ڈوبے تو ڈوبے کہاں
جس سمندر کا کوئی کنارا نہ تھا

....

بارگاہِ عشق میں وہ جگہ نہ پا سکے
جو کہ اپنے سر کو خود نیزے پر نہ دیکھ پائے

....

کسی افسانے کے کردار کی صورت شہزاد
زیست کی حسرتِ تکمیل میں مر جاتا ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ شاعری محض صداقتِ اظہار کا نام ہی نہیں بلکہ شاعر اس میں اپنا خونِ جگر بھی صرف کرتا ہے۔ احمد شہزاد اس اعتبار سے قابلِ توجہ شاعر ہیں کہ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ 'شامِ شہرِ وصال' میں اپنے مطہر جذبوں کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ وہ مسقط میں رہ کر بھی اپنی متاعِ سخن کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اہلِ وطن سے شکوہ سنج ہیں کہ۔

سوائے ہجرت کے اب متاعِ سخن بچانا ہے غیر ممکن
کہ شہرِ آہن گراں میں شیشہ گروں کی محنت نہیں چلے گی

◆◆◆

صادق جذبوں کی شاعرہ۔ سائرہ بتول

اس حقیقت سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا کہ شاعری ہمارے صادق جذبوں کے بھرپور اظہار کا نام ہے۔ معروف نقاد لونجائنس نے شاعری کو شدید جذبات کا شدید اظہار قرار دیا تھا جبکہ حالی نے شاعری کی خصوصیات میں سادگی اور اصلیت کے ساتھ جوش کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔ دراصل ان دونوں ناقدین کا بنیادی مؤقف یہی تھا کہ جذبے سے تہی انسان اچھا شعر نہیں کہہ سکتا ہے۔ برطانیہ میں مقیم سائرہ بتول صادق جذبوں سے بھرپور شاعرہ ہیں۔ وہ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار تو بھرپور طریقے سے کرتی ہیں لیکن ان میں سطحیت یا عامیانہ پن نہیں پایا جاتا۔ ان کی شاعری پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دریائے کوثر کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں۔ ہر شعر کا خیال پاکیزہ اور سوچ مطہر محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اشعار میں یہ فکری طہارت دراصل ان کے خانوادے کی عطا ہے۔ جہاں صبر و توکل میراث میں نصیب ہو جائے وہاں جاہ واقتدار کی ہوس کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔

میرے دشمن سے کہو صبر ہے میراث مری
اب جو آئے تو نیا زخم لگانے آئے

دنیا میں رہتے ہوئے لذائذِ حیات کو ترک کرنا کوئی معمولی عمل نہیں اور اگر سائرہ بانو نے یہ طرزِ عمل اختیار کرلیا ہے تو اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ سائرہ اہلِ دنیا سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں۔

اس عالمِ امکاں سے نکل کر بھی دیکھو
حالات کے سانچے میں بھی ڈھل کر بھی دیکھو
ظاہر کی سجاوٹ نہیں باطن کو سجاتی
ملبوس نہیں خود کو بدل کر بھی دیکھو
کہتا ہے شبِ ظلم کا یہ گھور اندھیرا
تم شمع بنو خود بھی تو جل کر بھی دیکھو
خواہش ہے بتولؔ اب تو یہی دل کی ہماری
دن رات کے چکر سے نکل کر بھی دیکھو

دانش مند کہتے ہیں کہ انسان اپنی جنم بھومی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اسے اپنے وطن کے رنگ، پھول، ذائقے، تتلیاں، سمندر، کوہسار اور مٹی کی سوندھی خوشبو سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ سائرہ بتول پردیس میں رہ کر بھی اپنے دیس سے بے پناہ محبت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے وطن کے مقابلے میں جنت کو بھی ہیچ سمجھتی ہیں۔

مجھے کیا آرزو جنت کی ہو گی
زمیں ہی جب مری جنت نشاں ہو

اپنے وطن کے حالات و واقعات اُن کے دل پر ہمہ وقت اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ دن تو دیارِ غیر میں بسر کردیتی ہیں تاہم رات میں وہ روحانی طور پر تمام راستوں کو چشمِ زدن میں طے کر کے اپنے دیس میں پہنچ جاتی ہیں۔ وہ اپنے دیس کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی حالات سے دل گرفتہ ہو کر کہتی ہیں۔

نفرتوں کی دھوپ ہے اور سائباں کوئی نہیں
کارواں گمراہ، میرِ کارواں کوئی نہیں
وقت کی گردش مجھے کس موڑ پر لائی بتولؔ
لوٹنے والوں نے گھیرا پاسباں کوئی نہیں

وہ اپنے وطن کی حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتی ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے میں اگر رہبر ہی رہزن بن جائیں تو ایسا معاشرہ رسوا ہو جاتا ہے تاہم اگر معاشرے سے اعلیٰ اخلاقی اقدار ناپید ہو جائیں تو معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس معاشرتی زبوں حالی پر وہ خون کے آنسو روتے ہوئے کہتی ہیں۔

وفا بے گھر، محبت بے اماں ہے
وطن میں آج یہ کیسا سماں ہے
لٹیرے ہی نظر آتے ہیں ہر سو
نہ جانے پاسباں میرا کہاں ہے
بتولؔ انسانیت ہے اب یہ پوش
یہاں نوعِ بشر نوحہ کناں ہے

سائرہ بتول محض حالات کی ستم ظریفیوں پر طنز کے تیر ہی نہیں برساتیں بلکہ وہ اہلِ وطن کو احساس دلاتی ہیں کہ اگر انہوں نے صدقِ دل کے ساتھ تعمیرِ وطن کا عہد کر لیا تو بہت جلد ان کا وطن جنت نظیر بن جائے گا۔

کرو اس کی حفاظت ہم نشینو
کہ مشکل سے بنا یہ آشیاں ہے

سائرہ بتول کومل جذبات و احساسات سے مالا مال شاعرہ ہیں۔ ان کی

شاعری میں ہجر و وصال کے قصے بھی موجزن ہیں تاہم وہ میر تقی میر کی طرح خود سپردگی کی قائل نہیں غالب کی طرح ہرجائی محبوب کو احساس دلانے کی متمنی ہیں۔

یہ دھوپ جلا دیتی ہے ہر رشتۂ جاں کو
فرقت کی تمازت میں پگھل کر بھی دیکھو
آدابِ محبت بھلا اب کون سکھائے
پروانے کی مانند بھی جل کر بھی دیکھو

سائرہ بتول کی شاعری میں علامہ اقبال کی طرح کوئی مرتب فلسفیانہ نظام موجود نہیں ہے اور نہ وہ ملت کے لیے کسی پاسبان کا فریضہ انجام دینے کی متمنی ہیں بلکہ وہ تو محض اپنے دل کی نرم گرم باتیں اپنے جیسے قارئین کے دلوں تک پہنچانے کا عزم رکھتی ہیں۔ ان کی حسرت ہے کہ ان کی بات صاحبانِ فہم و ذکا کے دلوں پر اثرات مرتب کر دے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے مردانہ معاشرے میں نسائی جذبات کی قدر کرنے والے معدوم ہوتے جا رہے ہیں تاہم سائرہ بتول اپنی شاعری میں عورت کی عظمت کے گیت گائے جا رہی ہیں۔ آپ ان کی ایک نظم ''عورت'' ملاحظہ کیجیے اور سوچیے کہ کیا کوئی مرد شاعر اتنے بسیط اور عمیق جذبات پیش کر سکتا تھا......؟؟

وہ جو خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، معبود بھی ہے
وہ جو رازق بھی ہے، ہادی بھی ہے، مسجود بھی ہے
اپنے بندوں کو وہ جنت کی خبر دیتا ہے
شامِ ظلمات کی قسمت میں سحر دیتا ہے
اُس نے ہر گھر میں بھی جنت کا وسیلہ بھیجا
اپنے بندوں کے لیے خُلد کا نقشہ بھیجا
جس کی آغوش میں نبیوں نے بھی کھولیں آنکھیں
دیکھ کے جس کو ستاروں نے جھکا لیں آنکھیں

وہ جو ماں ہے تو دعاؤں کی ردا ہو جیسے
وہ جو بیوی ہے تو ساون کی گھٹا ہو جیسے
وہ بہن ہے تو محبت کی صدا ہو جیسے
وہ جو بیٹی ہے تو جینے کی دعا ہو جیسے
نسلِ آدم کی امیں بھی تو یہی عورت ہے
روزِ فردا کا یقیں بھی تو یہی عورت ہے
اُس نے قوموں کو زمانے میں بقا بخشی ہے
اُس نے ہر دور کی ظلمت کو ضیا بخشی ہے
اُس کو اسلام نے عصمت کی ردا بخشی ہے
میرے معبود نے خود اُس کو حیا بخشی ہے
اُس کی توقیر زمانے کو بھی کرنی ہو گی
اُس کو خود اپنی یہ تقدیر بدلنی ہو گی
زیورِ شرم و حیا سے ہی سنورنا ہو گا
اُس کو خود وادیٔ ظلمت سے نکلنا ہو گا

اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی ایک ایسی عورت ہمارے سامنے آتی ہے جو حصولِ انصاف اور معاشرے میں اپنے جائز مقام کے حصول کے لیے عزم و استقلال کا کوہ گراں بن کر سامنے آتی ہے۔

میں نے آواز اٹھائی تو مرے سب ساتھی
مجھ کو دنیا کے رواجوں سے ڈرانے آئے

سائرہ بتول کی شاعری میں انفرادیت پائی جاتی ہے تاہم یہ انفرادیت روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ وہ ہم عصر شاعرات کی نسبت اپنے انفرادی تجربے کو بھی

روایت کی بھٹی میں پکا کر پیش کرتی ہیں اس صورت میں ان کی شاعری میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جو مستقبل کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر آپ سائرہ بانو کی قوتِ اختراع کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو ان کی محض درج ذیل ایک نظم کا مطالعہ کر لیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے اپنے موضوع اور اسلوب سے کتنے چراغ فکر روشن کیے ہیں۔

مجھے دیکھو یہ میں ہوں
نہیں پہچان پائے تم بھی مجھ کو؟
مجھے دیکھو یہ میں ہوں
مجھے دیکھو مری آنکھوں میں
اس بے رنگ موسم کے
ہر اک عکسِ پریشاں میں
تم اپنا آپ دیکھو گے
مجھے دیکھو

مرے چہرے پہ پھیلی
ان خزاں منظر لکیروں میں
تمہارا نام لکھا ہے
مجھے دیکھو

مرے بالوں کی سیاہی کے اندھیرے میں
تمہارے منتظر لمحوں کے سب احوال
تمہاری ہی جدائی کے وہ ماہ و سال
اب چاندی سے لکھے ہیں
مجھے دیکھو

مرے لب جن کو تم کل پھول کہتے تھے
زمانے کی ہوائے گرم نے پتھر بنا ڈالے
بس اب پہچان بھی جاؤ
مجھے دیکھو یہ میں ہوں
جس کی جھولی میں فقط بے رنگ خوابوں کے
تمہاری چند یادوں کے
بس اب کچھ بھی نہیں باقی

سائرہ بتول انفرادیت پسند ہیں اور شاہراہِ عام پر چلنا انہیں پسند نہیں ہے۔ وہ عام بات کو خاص بنانے کا ہنر جانتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں ہم عصر شعری روایت میں ایک نیا در کھولنے کا مستحکم عزم ملتا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں موضوع کو اس طرح سے پیش کرتی ہیں کہ ان میں نئے نئے جہانِ معنی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ آپ ان کی غزلوں کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے اور سائرہ بتول کی جدت پسندی کی تعریف کیجیے:

مجھ کو حسرت ہے کبھی کوئی سہانا سپنا
میری آنکھوں سے مری نیند چرانے آئے

....

چلو دشتِ وفا میں پا برہنہ
یہ صحرا جانے کتنا بے کراں ہے

....

سورج کی طرح روز نکل آتے ہو گھر سے
اک روز یہ معمول بدل کر بھی دیکھو

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ پر عظمت شاعری اسی وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جب شاعر اپنے شدید جذبات کا اظہار انتہائی سلیقے سے کرے۔ سارہ بتول خوش بخت ہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے شاعری کا سہارا لیا اور اپنے جذبات کو اتنے سلیقے اور طریقے سے اُجاگر کیا کہ اردو شعری روایت کو ایک نئی جہت عطا کر دی۔ انہوں نے ارفع خیالات کو شیریں زبان میں پیش کر کے اپنے لیے ایک معتبر مقام بنا لیا ہے اور جب تک اردو کی شعری روایت زندہ ہے سارہ بتول کا نام اور کام زندہ رہے گا اور وہ صاحبانِ دانش سے داد و تحسین حاصل کرتی رہیں گی۔

بتول اہلِ سخن ہیں تو بہت سے
کوئی تجھ سا کہاں شیریں زباں ہو

◆◆◆

افکار

اردو شعروادب کے سفیروں کے بارے میں

ملکی اور بین الاقوامی دانشوروں کی آرا

◆◆◆

اُردو شعر و ادب کے سفیروں کے بارے میں دانشوروں کی آرا

◆◆

اُردو شعر و ادب کو اپنے افکارِ عالیات سے سیراب کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان سے باہر بھی سرگرمِ عمل ہے۔ اپنے دیس سے دور ہونے کے باوجود ان کی جملہ تخلیقات میں وطن سے محبت کی مہک محسوس کی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف نے پاکستان اور بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں سے استفسار کیا تھا کہ

(۱) کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

(۲) کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

(۳) ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

(۴) کیا آپ بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

(۵) آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ پاکستان، جرمنی، دبئی، کینیڈا، سری لنکا، ہالینڈ، امریکہ، آئر لینڈ، ایران، اور آسٹریلیا کے معروف دانشوروں نے راقم الحروف کے سوالات کے نہ صرف جوابات عطا فرمائے بلکہ اس موضوع کے حوالے سے اپنے بیش قیمت افکار بھی عطا کیے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دانشوروں کی آرا کی روشنی میں بیرون ملک تخلیق کرنے والے شعر و ادب کے حوالے سے چند نئے مباحث بھی جنم لیں گے اور یہی اس کتاب کی تسوید کا بنیادی مقصد ہے۔ آپ ذیل میں ایک سو بیس سے زیادہ دانشوروں کی آرا کا مطالعہ فرمائیے اور بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کی خدمات کا احاطہ کیجیے۔

(ل)

(پاکستان کے معروف نقادوں، محققوں اور دانشوروں کی آرا)

◆◆

ڈاکٹر محمد علی صدیقی (کراچی)

سوال۔ کیا بیرون ملک پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ کیوں نہیں۔ لیکن بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں میں چند مستثنیات کے ساتھ قدر اول کے تخلیق کار نہیں ہیں اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ بیرون ملک تنقید کے لئے پیش کی جانے والی تنظیموں کی کمی ہے۔ اکثر تخلیق کاروں میں فنی پختگی کی کمی نظر آتی ہے۔

سوال۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے؟

جواب۔ اکثر فنکاروں میں "وطن کی خوشبو" بنیادی محرک کے طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

سوال۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب۔ میں نے آپ کے پہلے سوال کے جواب ہی میں عرض کیا تھا کہ قدر اول کے فنکاروں کی غیر موجودگی اور قدر دوم کے فنکاروں کی تخلیقات غیر مسطح (Uneven) نظر آتی ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں۔

جواب۔ کینیڈا کے اشفاق حسین، امریکی فنکاروں میں حمیرا رحمان، انگلستان میں ساقی فاروقی، مقصود الٰہی شیخ، سعید اختر درانی، خالد یوسف، حیدر طباطبائی، صفیہ صدیقی،

ڈنمارک میں نصر ملک، سویڈن میں احمد فقیہہ، مسعود منور اور فیصل ہاشمی، فرانس میں اسد رضوی اور جرمنی میں منیر الدین احمد لائق مبارکباد ہیں کہ وہ اپنے اپنے شعبہ میں قابلِ ستائش کام کر رہے ہیں۔ آپ نے پاکستانی تخلیق کاروں کا ذکر کیا ہے ورنہ ہندوستانی تخلیق کاروں کے بھی نام نوکِ قلم پر آ رہے ہیں۔ آخر اکبر حیدر آبادی، سوہن راہی، جتیندر بلو اور ستیہ پال آنند کے نام کیوں نہ لیے جائیں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب۔ اس مشورہ کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش بہر صورت ضروری ہے۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

ماہنامہ 'شام و سحر' کے مدیر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اس انفرادی خوبی کا اعتراف اس مضمون کی ابتدا میں ہی ضروری ہے کہ وہ ادب کے پیش پا افتادہ مضامین اور گھسے پٹے موضوعات پر کام کرنے کے برعکس ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہیں اور اچانک سب کو حیران کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ اردو کی بے لوث خدمت کرنے والے بعض مخلص ترین ادیبوں کو "ادبی مافیا" نظر انداز کر رہا ہے اور "دولے شاہ کے چوہوں" کے سر پر تاجِ زرنگار سجایا جا رہا ہے۔ وہ ملول ہو گئے کہ حق دار ادیب کو اس کا جائز حق بھی نہیں دیا جا رہا ہے۔ کئی دوستوں کو انہوں نے اس ناانصافی اور غلط بخشی کی طرف متوجہ کرایا لیکن جب کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا تو ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کمرِ ہمت خود باندھ لی۔ متذکرہ ناانصافی کے ازالے کے لیے انہوں نے دو کام خلوص مندانہ خصوصیت سے کیے۔

اوّل۔ معروف ادیبوں پر رسالہ "شام و سحر" خصوصی گوشے چھاپے اور فوقیت ان ادیبوں کو دی جو شہرت عطا کرنے والے کسی ادبی بھیکے کی جبیں سائی نہیں کرتے تھے بلکہ

اپنی تخلیق کو ہی اپنا انعام تصور کرتے تھے۔

دوم۔ بعض بڑے ادیبوں پر کتابیں تالیف کیں، تصنیف کیں، گم شدہ کلام کو مجتمع کیا اور پھر اپنے اہتمام سے انہیں طباعت و اشاعت کی منزل پر پہنچایا۔ یہاں بھی ان کی ترجیحات میں وہ ادبا شامل تھے جنہوں نے تخلیق کاری اپنے کنج خلوت میں کی اور داد و تحسین سے بے نیاز رہے۔ مجھے علم ہے کہ ان میں چند ایسے ادیب بھی شامل تھے جن کے ضخیم دیوان بن بیاہی بیٹیوں کی طرح گھر میں پڑے رہے اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس نوع کے متعدد دیوان ڈاکٹر شبیہ الحسن نے زیور طبع سے آراستہ کیے، ان کی اشاعت وسیع پیمانے پر کی اور اب میری اطلاع کے مطابق اس قسم کے گم گشتہ ادیبوں پر ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھے جا رہے ہیں تو ان سکالروں کی بنیادی مواد کی فراہمی ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کی شائع کی ہوئی کتابوں سے ہوئی ہے۔ (میں یہاں متذکرہ دوشتوں کے ادیبوں کے نام دانستہ نہیں لکھ رہا کیونکہ اب ان کی محرومی کا ازالہ ڈاکٹر صاحب نے کر دیا ہے اور مجھے احساس ہے کہ آپ ان سب کے ناموں سے واقف ہیں)۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مضافات کے بہت سے ادیبوں کے تخلیقی اعتماد کو بحال کیا، ان کے فکر و فن پر خود مضامین لکھے اور پھر ایک "مذاکرہ" کرایا جس میں ملک کے معروف دانشوروں سے مضافاتی ادب کے بارے میں استفسار کیا گیا۔ قریباً چار سو صفحات پر یہ کتاب "مضافاتی شعر و ادب" کے نام سے چھپ چکی ہے اور اسے اپنے منفرد موضوع پر اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

اردو ادب پر مردوں کی اجارہ داری اور خواتین کی اعلیٰ تخلیقات سے نقادوں کی بے اعتنائی شکوہ بھی اب معمول کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ میں یہاں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کا ذکر نہیں کر رہا کیوں کہ ان کی شہرت عام میں ان کے فن کے علاوہ ترقی پسند تحریک کا حصہ بھی شامل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں مرد مصنفین

کے ساتھ خواتین کی شرکت کو ثابت کرنے کے لیے ان کے نام سے فائدہ اٹھایا گیا اور یہ ترقی پسند ادیبوں کا اپنی تحریک کو قبولِ عام دینے کا ایک سیاسی حربہ تھا۔ جبکہ عصمت چغتائی کے افسانے ان کے اپنے تخلیقی جوہر کا ثمر ہیں اور یہ ترقی پسند فارمولے پر پورے نہیں اُترتے۔ نقصان یہ ہوا کہ متعدد خواتین نے مرد نقادوں کی عدم پذیرائی کی وجہ سے ادبی تخلیق کاری ترک کر دی۔ میں یہاں تسنیم نسیم چھتاری، زینت ساجدہ، کوشلیا اشک، پروین سور، جاویدہ جعفری...... کے چند نام پیش کر سکتا ہوں۔ قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، فرخندہ لودھی اور بانو قدسیہ کو اپنے فن کی اساس پر شہرت ملی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے "شہرتیں عطا کرنے والے" کسی تکیے تک رسائی ضروری نہیں سمجھی اور مرد نقادوں کی بے اعتنائی کی پروا بھی نہیں کی۔ معاشرے کی حقیقت کو کھلی آنکھ سے دیکھا اور اپنے اندر اُٹھنے والے جوار بھاٹے کو تخلیق کاری سے مائل بہ سکون کیا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس شکایت کا بھی نوٹس لیا اور "شام وسحر" میں خواتین کی اس محرومی کا ازالہ کرنے کی کوشش اپنے مقدور سے بڑھ کر کی۔

اب اگر آپ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت کا صرف ایک منفرد گوشہ مجھ سے دریافت کریں تو میں بلا توقف کہوں گا کہ وہ محروم اور گم نام ادیبوں کو بامِ شہرت پر قطبی ستارے کی طرح قائم کرنے والے مردِ فرید ہیں اور ان کا نیا منصوبہ "اردو ادب کے سفیر" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی قرار دی جا سکتی ہے۔ اس نئی کتاب میں انہوں نے بیرونِ ملک مقیم منتخب پاکستانی شعرا و ادبا کی خدمات کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے کہ ان تارکینِ وطن کو یہ احساس ہو جائے کہ ان کے کام کو اردو کے ایک بڑے مرکز میں تحسین کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس کتاب کے مسودے کی تکمیل کے بعد انہوں نے اس حوالے سے پاکستان کے ادیبوں کو ایک سوالنامہ بھیج کر اپنے منصوبے کو وسعت دینے کی کاوش کی۔ میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے اس وسیع الحیثیت منصوبے میں مجھے بھی شامل کیا

میں ان کے سوالات کی طرف آتا ہوں :

سوال ۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب ۔ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی معاشی اور اقتصادی جبر کے تحت ارضِ وطن سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان کی نقلِ مکانی کسی تہذیبی، ادبی اور علمی منصوبے کے تحت عمل میں نہیں آئی، انہیں اگر اپنے وطن میں باوقار روزگار مل جاتا تو وہ اپنے وطن کی سرزمین سے کبھی جدا نہ ہوتے۔ ان تارکینِ وطن میں متعدد ادبا اور شعرا بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے معاشی حالات کو بیرونی ممالک میں بہتر کرنے کی کوشش کی۔ تو گوناگوں مشکلات، مصائب اور آلام کا سامنا کیا لیکن ادبی ذوق کو ان صعوبتوں میں مرنے نہ دیا۔ مجھے ان تارکینِ وطن کی تخلیقی کاوشیں ادبی رسائل میں پڑھنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ بیشتر لوگ اپنا ادبی فریضہ خوبی اور خوبصورتی سے ادا کر رہے ہیں اور شعر و ادب کی ترویج میں نہ صرف اہم کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ اردو زبان و ادب کی نئی بستیاں بھی آباد کر چکے ہیں اور یہ بستیاں نہ صرف خلیجی ممالک کے نئے صنعتی ماحول میں قائم ہیں بلکہ برطانیہ، امریکہ، جرمنی، کینیڈا اور ناروے جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی موجود ہیں اور ادب کی خدمت میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ ادب کی ان نئی بستیوں میں ادیب نجی سطح پر ادبی محفلیں بھی برپا کرتے اور اجتماعی سطح پر مشاعروں اور کانفرنسوں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے اور ان میں چونکہ پوری دنیا سے منتخب ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے، اس لیے انہیں بین الاقوامی درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ترقی پسند تحریک کی پچاسویں سالگرہ لندن میں منعقد کی گئی تھی۔ سلیم جعفری نے خلیجی ممالک میں بین الاقوامی اردو مشاعروں کی داغ بیل ڈالی اور کئی انعامات کا اجرا کیا۔ اردو ادب کی ترویج کے لیے رسائل اور اخبارات جاری کیے جن کی تعداد میں اب اضافہ ہو رہا ہے۔ فوری طور پر مجھے

اخبار ''مشرق'' یاد آ رہا ہے۔ جس کی ادارت لندن میں محمود ہاشمی صاحب کرتے تھے۔ مقصود الٰہی شیخ نے ایک طویل عرصے تک ''راوی'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری رکھا اور اب ہر سال ''مخزن'' کے نام سے ایک ضخیم ادبی پرچہ چھاپتے ہیں جرمنی سے حیدر قریشی نے ''جدید ادب'' جاری کر رکھا ہے جو ہر چھ ماہ کے بعد چھپتا ہے اور انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جرمنی سے ہی اسحاق ساجد ''سمندر'' کے نام سے ایک ماہنامہ چھاپتے ہیں۔ صابر ارشاد عثمانی صاحب کا ماہنامہ ''پرواز'' اور ساحر شیوی صاحب کا سہ ماہی ''سفیر ادب'' پوری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔ ولی عالم شاہین نے سہ ماہی رسالہ ''اردو'' کینیڈا سے جاری کیا تھا جو اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ شعر و ادب کی ترویج کے لیے یہ مثبت کاموں کا اجمال ہے۔ تاہم اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ بیرونی ممالک کی اردو بستیوں کی سب خبریں اور مطبوعات پاکستان کے قارئین تک نہیں پہنچتیں۔ حیدر طباطبائی صاحب نے ایک دفعہ برطانیہ کا ''خبرنامہ'' دہلی کے رسالہ ''کتاب نما'' میں شائع کیا تھا جسے پڑھ کر احساس ہوا کہ انگلستان میں آباد اردو کے ادیب اور شاعر کتنے فعال ہیں۔ اور کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے کتنا اچھا کام کر رہے ہیں۔ حیدر قریشی جرمنی سے ادب کی ایسی تحریکیں چلا رہے ہیں، جن کے اثرات برعظیم ہندو پاک کے ادبی حلقے بھی محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے ''اردو ماہیا'' کو جرمنی میں قیام کے دوران ایک ادبی تحریک بنا دیا جو بنیادی طور پر پنجاب کی صنف ادب ہے۔ حال ہی میں انہوں نے ''سرقہ نگاری'' کو منکشف کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور حیرت انگیز انکشافات کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں رسالہ ''تخلیق'' میں ایک رپورٹ چھپی تھی کہ امریکہ میں محترمہ منیر جہاں نے ایک ''اردو مرکز'' (انٹرنیشنل) قائم کر رکھا ہے جو تارکینِ وطن کی مطبوعہ کتابوں پر ہر سال بہترین کتاب کو احمد ادایا ایوارڈ پیش کرتا ہے اور رپورٹ کی تقسیم کے موقعہ پر ایک بین الاقوامی مشاعرہ بھی منعقد کرتا ہے۔

اس مختصر سے تذکرے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو زبان کے شعرا اور

تخلیق کار بیرونی دنیا میں جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنے ادبی فریضے سے غافل نہیں ہوتے اور ادبی محفلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وقت کی گردش کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے کشادہ ماحول میں بعض ادبائے کرام اپنے ذاتی تعصبات سے آزاد نہیں ہو سکے اور کھلی اور نجی ادبی محفلوں میں اپنی فوقیت قائم کرنے اور دوسروں کو نیچا دکھانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ معمولی ادبی اختلاف ذاتی نوعیت اختیار کر جاتا ہے اور پھر کردار شکنی کی مہم جاری ہو جاتی ہے۔ بعض مقامات سے منفی قسم کی گروہ بندی اور غیر دستخطی سائیکلوسٹائل یا فوٹو کاپی خطوط کی تقسیم کی خبریں بھی ملی ہیں۔ پونڈ، ڈالر اور ریال و درہم کی افراط میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ بعض غیر ملکی شاعرات خود نہیں لکھتیں بلکہ مناسب حق الخدمت پر انہیں شاعری کا تیار مال دستیاب ہو جاتا ہے۔ انہیں اس قسم کے ''ادب فروش'' پاکستان سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر تحقیق کی جائے تو کئی ''پردہ نشینوں'' کے نام منکشف ہوں گے۔

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب ۔ میرا خیال ہے کہ تارکینِ وطن کی بیشتر تخلیقات میں بے وطنی کا احساس اور ''ناسٹلجیا'' کی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے اور یہ فطری بات ہے۔ مذہب کی طرح وطن بھی ہر شخص کے دل کے نہاں خانوں میں ہمہ وقت موجود رہتا ہے اور یہ ادیب اور شاعر کی تخلیقات میں بھی در آتے ہیں۔ میں یہاں افسانہ نگار قیصر تمکین کی مثال پیش کروں گا جو تیس چالیس سال سے برطانیہ کی شہرت اختیار کر چکے ہیں، لیکن افسانہ لکھتے ہیں تو وطن کی گلیوں سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ صفیہ صدیقی، حمدیہ معین رضوی، شکیلہ رفیق، نجمہ عثمان، سلطانہ مہر، بانو ارشد، ش، صغیر ادیب، مصطفےٰ کریم اور ڈاکٹر فیروز عالم سب صف اوّل کے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں وطن کی خوشبو موجود ہے اور جو تارکینِ وطن کے عصری مسائل پر بھی

افسانے لکھ رہے ہیں۔ مصطفیٰ کریم نے ایک معرکے کا ناول بنگال کے نواب سراج الدولہ اور پلاسی کی جنگ کے پس منظر میں لکھا تھا۔ اب ان کا ناول ''راستہ بند ہے'' شائع ہوا ہے جو معاشرتی ناول ہے لیکن اس کے پس منظر میں کشمیر کی پہلی لڑائی نمایاں ہے۔ ان کا ناول ''ڈاکٹر بنیر جی کی موت'' برطانیہ کے سماجی تناظر میں ترکِ وطن کرنے والوں کی ذہنیت کو پیش کرتا ہے۔ داخلی جذبے کا زیادہ اظہار شاعری میں ہوتا ہے اور قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جو دیارِ غیر میں پہنچے اور انہیں وطن کی یاد ستانے لگی تو ان کے اندر سے شاعر بیدار ہو گیا جو نہ جانے کب سے چھپا بیٹھا تھا لیکن اسے اظہار کا موقعہ تارکِ وطن بننے کے بعد نصیب ہوا۔ تاہم اردو کے متعدد ممتاز شعرا جنہیں اپنے وطن میں شہرت مل چکی تھی اب دیارِ غیر میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے ہیں تو ان کی شاعری سے اپنی مٹی کی خوشبو اور اپنے تہذیبی مرکز کی آواز بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان شعرا میں ساقی فاروقی، اقبال بھٹی، نصیر احمد ناصر بٹ، ڈاکٹر داؤد رہبر، غزل انصاری، خالد یوسف، مامون ایمن، باقر نقوی، افتخار نسیم، عاشور کاظمی، محمد سرور رجا، نسیم شمائل پوری، عاصی کاشمیری، گلشن کھنہ، اشفاق حسین، سلیم الٰہی زلفی، صفوت علی صفوت، عشرت معین سیما، ناصر سلطان کاظمی، صوفیہ انجم تاج کے نام ذہن پر زور ڈالے بغیر یاد آ رہے ہیں جن کی شاعری میں وطن ایک بنیادی حوالہ ہے اور دیارِ غیر میں وہ اس سکون کے متلاشی بھی نظر آتے ہیں جو انہیں وطنِ عزیز میں نصیب تھا۔ چند تازہ رسائل میں سے یہاں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ بیرونِ ملک مقیم شاعروں کے اندر کی حقیقی آواز ہے جو علامتی انداز میں سنائی دے رہی ہے۔

یہ بستیاں ہیں، خرابے یہ بختوں کے
اب آفتاب تمنا انہیں کرن بھی دے

(افتخار نسیم۔ شکاگو)

پوچھتے ہو پتہ مرے گھر کا
بے وطن کا تو گھر نہیں ہوتا

(نصیر احمد ناصر بٹ۔لندن)

وہ لمبی ڈالیاں سرسوں کی، پھول سرسوں کے
جب آئے گاؤں سے، برسوں انہیں بھلا نہ سکے

(صفیہ انجم تاج۔کینیڈا)

دیارِ غیر سے آواز دے دے کر پریشاں تھا
بنا کر گھر کو صحرا سا، کہاں صاحب! تھے غائب، آپ

(محمد سالم۔امریکہ)

اسی دیار کو ہم اب بھی یاد کرتے ہیں
اُدھورے خواب جہاں سب ترے حوالے ہوئے

(غزل انصاری۔لندن)

نیند ٹوٹی ہے شب گزاروں کی
یاد آتی ہے اپنے پیاروں کی

(عشرت معین سیما۔جرمنی)

اب میں ممتاز شاعر ناصر کاظمی کے صاحبزادے باصر سلطان کاظمی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن میں وطن کی یادیں اور ان کا تاثر نمایاں ہے:

یہ شہر تمہارا، مری بستی کے مقابل
اچھا ہے مگر صرف عمارات کی حد تک

....

لاکھ آسائشیں پردیس مہیا کر دے
ہے غریب الوطنی، پھر بھی غریب الوطنی

....

کرتے جو ہم نہ اہلِ وطن اپنا گھر خراب
ہوتے نہ یوں ہمارے جواں دربدر ہلاک

....

باغ اک ہم کو ملا تھا مگر اس کو افسوس
ہم نے جی بھر کے بگاڑا ہے، سنوارا کم ہے

(باصر سلطان کاظمی)

اور یہ اشعار اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ دیارِ غیر میں مقیم شاعر کو بحرانوں میں گھرے ہوئے وطن کے بارے میں کتنی تشویش ہے اور حب الوطنی کا جذبہ اس کے اشعار میں کس شدت سے رونما ہو رہا ہے۔

سوال ۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ یہ سوال اتنا عمومی ہے کہ میرے جیسے ایک عام قاری کے لیے جسے بیرون ملک مقیم منتخب پاکستانی شعرا و ادبا کی سب تخلیقات اور تصنیفات تک رسائی حاصل نہیں ہے، جواب دینا مشکل ہے۔ بیرونی دنیا سے اردو کی بہت کم کتابیں پاکستان میں پہنچتی ہیں۔ پاکستان کے معروف ادبی رسائل میں بھی ملکی اور غیر ملکی ادبا کی شناخت اور امتیاز ممکن نہیں کیوں کہ پاکستانی رسائل میں تخلیقات کے ساتھ مصنفین کے کوائف اور پتے وغیرہ شائع نہیں کیے جاتے۔ اس قسم کی معلومات کا وسیلہ ذاتی رابطے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں سے چھپنے والے رسائل اور اخبارات بھی پاکستان میں کم کم آتے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ اور صابر ارشاد عثمانی صاحب کو تحسین کا استحقاق حاصل ہے کہ ان کے رسائل ''مخزن'' اور ''پروانہ''

(علی الترتیب) پاکستان میں زیادہ تقسیم ہوتے ہیں اور ان میں ادیبوں کے نام کے ساتھ مقام بھی درج کر دیا جاتا ہے۔ "مخزن" میں مختصر حالات حیات بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ شاعری اور افسانے میں اوّل درجے کے ادیبوں کے چند نام جو میرے حافظے میں اب تک قائم ہیں اوپر لکھ چکا ہوں۔ (یہ فہرست حتمی نہیں ہے) اور شاید یہ کہنا بھی مناسب ہو کہ جس معیار کا ادب پاکستان میں تخلیق ہو رہا ہے، اس معیار سے (ساوری ادیبوں کو کم تر قرار دینا مناسب نہیں۔ مجھے ہندو پاک کے بعض وسائل میں غیر ملکی ادیبوں کے خصوصی گوشے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے اور ان میں تعریف و تحسین کا زاویہ غالب نظر آیا۔ غنیمت بات یہ ہے کہ معاشی مثلث میں بہت سے تارکینِ وطن نے ادب سے اپنا ناتہ مضبوطی سے قائم رکھا اور وہ اردو کی فہرست میں اب بھی پیش پیش ہیں، جبکہ پاکستان میں اردو کو اس کا آئینی درجہ تا حال نہیں دیا گیا اور انگریزی کی حکمرانی روز افزوں ہے۔

سوال ۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں تک اپنی عدم رسائی کا اظہار میں اوپر کر چکا ہوں۔ تاہم دستیاب معلومات کی اساس پر یہ کہنا درست ہے کہ اردو کی بیرونی بستیوں میں اردو کو مشاعرہ کلچر سے فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دن بھر کی محنت اور مشقت سے تھکے مارے لوگ مشاعرہ کو ادب کی خدمت کے برعکس تفریح کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مشاعرہ کلچر میں بھی متعدد اقسام کی برائیاں در آئی ہیں اور بعض لوگ تو وطن عزیز سے آنے والے شاعروں سے بھی گلوکاری کی توقع کرتے ہیں اور ترنم سے پڑھنے والی بنی سنوری شاعرات کی زیادہ پذیرائی ہوتی ہے) تاہم ان مشاعروں سے بیرونِ ملک کام کرنے والوں کا اردو سے ناتہ قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف نثر لکھنے والوں کو "مشاعرہ کلچر" کی معاونت حاصل نہیں۔ ان کا تخلیقی، تنقیدی اور اس کے ساتھ ترجمہ نگاری کا کام زیادہ

یکسوئی اور محنت کا طلبگار ہے۔ ان نثر نگاروں کو پاکستان کے ادبی حلقوں سے عدم پذیرائی کی شکایت زیادہ ہے اور یہ شکایت حق بجانب بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر ممالک میں مقیم ادیبوں کے اچھے کام کی پذیرائی بروقت اور وسیع پیمانے پر کی جائے۔ ان کے ادبی کام پر پاکستانی ادیبوں سے زیادہ ان تخلیق کاروں میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ انہیں پاکستان میں توجہ سے پڑھا جارہا ہے اور وہ ادب میں اپنا نقش قائم کر رہے ہیں اور وہ شعر و ادب کی جو سفارت کر رہے ہیں اس کا اعتراف ان کے اپنے ملک میں بھی کیا جارہا ہے۔ اردو زبان و ادب کو مغربی ممالک میں سنجیدگی سے متعارف کرانے کے لیے ڈاکٹر محمد عمر مبین، سی ایم نعیم، ڈاکٹر اختر احسن، محمود ہاشمی، سائیں سچا، نیر جہاں، حیدر قریشی، صابر ارشاد عثمانی، عاشور کاظمی، مقصود الہی شیخ، صفیہ صدیقی، ڈاکٹر تقی عابدی، داؤد رہبر، اور منیر الدین احمد جیسے لوگ گراں قدر کام کر رہے ہیں۔

سوال ۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب ۔ پاکستان میں بالعموم یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اردو کی بیرونی بستیوں میں اردو زبان و ادب کا فروغ وارتقا اردو کے موجودہ تخلیق کاروں کی نسل تک محدود ہے۔ یہ مسئلہ ہندوستان میں بھی پیدا ہو چکا ہے جہاں اردو کی خواندگی محدود ہوتی جارہی ہے۔ عصمت چغتائی نے کراچی میں اپنی زندگی میں یہ بیان دیا تھا کہ ان کے بچے اردو سے نابلد ہیں۔ مغربی ممالک میں اردو نجی زبان ہے اور پاکستانی گھرانوں کے بچے بھی انگریزی کلچر میں ہی پرورش پارہے ہیں۔ اردو زبان سے دور ہوتے ہوئے جارہے ہیں۔ اب یہ فرض تخلیق کاروں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشرقی کلچر کی نمائندہ زبان اردو کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور انہیں اپنے تخلیقی کاموں کی تفہیم کا شعور بھی عطا کریں۔ کچھ عرصہ قبل اردو کی تدریس کے لیے محمود ہاشمی (مصنف ''کشمیر اداس ہے'') نے ...... اردو قاعدہ، اردو ورک بک (لکھائی سکھانے کے لیے) اور ''اردو کیسے پڑھائی جائے'' تیار کی تھیں۔ ان

کتابوں میں اردو کو نظری انداز میں سیکھنے کے طریق بتائے گئے ہیں۔ اگر سکولوں میں جہاں انگریزی پڑھائی جاتی ہے، پاکستانی بچوں کے لئے یہ کتابیں بھی پڑھائی جائیں تو اردو کو فروغ دار ارتقا مل سکے گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان کتابوں کی تدریس پاکستانی کمیونٹی اپنی سطح پر بھی کر سکتی ہے۔ اس طرح غیر ممالک میں مقیم تخلیق کاروں کا اپنا ادب بھی زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور)

اپنا یار شبیہ الحسن بھی عجب شخص ہے۔ نہ چین سے بیٹھتا ہے اور نہ ہمیں چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ اُسے ہر وقت نئی سوجھتی ہے اور خوب سوجھتی ہے۔ ابھی 'مضافاتی شعر و ادب' نامی کتاب طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں بھی نہ آئی تھی کہ اُس نے نئی کتاب کا ڈول ڈال دیا ہے اور یہ ہے 'اُردو شعر و ادب کے سفیر'۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ شبیہ الحسن نے صحیح وقت پر اس موضوع کے بارے میں پاکستانی بلکہ بین الاقوامی اہلِ قلم کو متوجہ کیا ہے۔ اس لیے کہ امریکہ اور یورپ میں بسنے والے اہلِ قلم کی کثیر تعداد اب بہت کچھ لکھ چکی ہے۔ اتنا کہ اب یورپ میں اُردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کی جداگانہ روایت تشکیل پاتی نظر آ رہی ہے اور اب جبکہ اُن کی کتابیں عام دستیاب ہیں تو یہی موقع اُن کی تحریروں اور شاعری کی اہمیت کے تعین اور فنی قدر و قیمت طے کرنے کا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ شبیہ الحسن کی یہ کتاب فکر و نظر کے نئے دریچے وا کرتے ہوئے دیارِ غیر میں آباد اہلِ قلم کی تخلیقی کاوشوں کی اہمیت کا احساس کرائے گی اور اُن لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرے گی جو اگرچہ ہمارے ساتھ تو نہیں رہتے لیکن اپنی تخلیقات کے ذریعے سے ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس لحاظ سے واقعی وہ شاعر و ادیب اُردو زبان و ادب کے سفیر کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر سارا نہیں تو کم از کم آدھا پاکستان مغربی ممالک میں آباد ہو چکا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس کا ایک آدھ عورت یا مرد روزگار یا شادی کی وجہ سے دیارِ غیر میں آباد نہ ہو گیا ہو۔ وطن سے محبت اپنی جگہ اور ماضی کا ناسٹلیجیا بھی سر آنکھوں پر، لیکن کیا یہ تارکینِ وطن اچھے معیارِ زیست، آسودہ حالی اور مقامی لڑکیوں سے شادی کے باوجود بھی قلب مطمئن رکھتے ہیں؟؟ یہ امر اس لیے قابلِ غور ہے کہ اپنی عادات و اطوار، اخلاقی اقدار اور مذہبی رویوں کی وجہ سے ہمارے لیے مغرب کی زندگی کو کلیتاً اپنا لینا آسان نہیں ہوتا۔ غالباً اسی لیے یورپ میں پلنے بڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے لڑکیوں کے لیے پاکستان ہی سے رشتے حاصل کیے جاتے ہیں۔

اس تناظر میں جب ہم اُن اہلِ قلم کی تخلیقی مساعی کا جائزہ لیتے ہیں جو وطن سے دور ہونے کے باوجود بھی وطن کی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور ادب تخلیق کرتے ہیں تو اس ضمن میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے اس سے انہیں کیا یا کیسی نفسی تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ تخلیقی عمل زبان و مکان کا پابند نہیں ہوتا۔ ہر تہذیب اور کلچر میں اُس کا اظہار ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ دیارِ غیر میں اُردو میں لکھنے والا لکھ کر، تخلیق کر کے، شعر کہہ کر، دراصل جذباتی طور پر اپنے وطن سے والہانہ وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ میں نے جن غیر ممالک میں آباد شعرا کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اُن سب کی شاعری میں ایک عنصر مشترک تھا کہ اُنھوں نے وطن کے بارے میں ویسے ہی جذبات کا اظہار کیا جیسا کہ ہم یہاں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔ شاعر ناروے کا ہو یا سویڈن کا، وہ امریکہ میں آباد ہو یا برطانیہ میں، وہ اسپین میں زندگی بسر کر رہا ہو یا جرمنی میں بنیادی طور پر ان سب کا طرزِ احساس پاکستانی ہی قرار پاتا ہے۔ یوں تخلیقی طور پر یہ لکھاری گویا اپنے وطن اور ہم

وطنوں سے جذباتی رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ اسی لیے بھی کسی بھی شاعر کی شاعری میں وہ چیز نہ ملے گی جسے اصطلاح میں مقامی رنگ کہا جاتا ہے۔ وہ جس ملک کے جغرافیہ، لینڈ اسکیپ، تہذیب و کلچر میں زندگی بسر کر رہے ہیں اُس کی کوئی واضح جھلک اُن کی شاعری میں نہیں ملتی۔ بالفاظ دیگر وہ جسمانی طور پر یورپ کے کسی ملک میں ہونے کے باوجود بھی روحانی طور پر پاکستان ہی میں آباد ہوتے ہیں۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے شعرا کی شاعری کا مطالعہ غیر ملکی شاعر کے طور پر نہیں بلکہ پاکستانی شاعر کے طور پر ہونا چاہیے کہ ان کی تحسین کا یہی مناسب طریقہ ہے۔

میں شاعر نہیں اس لیے مشاعرے پڑھنے یورپ کے کسی ملک میں نہیں گیا لیکن وہاں جانے والے احباب بتاتے ہیں کہ ایک شہر میں رہنے والے اہلِ قلم باہمی رابطہ رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی تخلیقات سناتے ہیں اور باقاعدہ مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں۔ جن میں بعض اوقات بیرون شہر کے شعرا بھی شرکت کرتے ہیں۔ ہم کیوں کہ اردو کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس لیے کسی سینئر یا مشہور شاعر سے ملنا اور اُن کا کلام سننا ہمارے لیے عام سی بات ہے۔ ہمیں کسی بڑے شاعر سے ہاتھ ملا کر کسی 'تھرل' کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس یہاں سے جو شعرا بیرون ملک تشریف لے جاتے ہیں اُن کی آمد وہاں ایک بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔ اسی لیے اُن کے مشاعرے خواہ وہ ڈرائنگ روم تک ہی محدود کیوں نہ ہوں سامعین کا جوش ہمارے جوش کے مقابلے میں زیادہ پر جوش ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ مہمان شعرا کو لفافوں کے علاوہ تحائف سے بھی لاد دیتے ہیں جو محبت کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔

اس ضمن میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیرون ملک میں کی گئی شاعری کی قدر و قیمت کیا ہے؟؟ میں نے بہت سے شعرا کے شعری مجموعے بھی پڑھے ہیں، اُن کی کتابوں کی تقریب رونمائی میں تنقیدی گفتگو بھی کی ہے، اُن کے دیدہ زیب

مجموعوں پر دیباچے اور فلیپ بھی تحریر کیے ہیں اور اپنی وضع داری کے باوجود بعض شعری مجموعوں پر گفتگو کرنے یا کچھ لکھنے سے صاف انکار بھی کر دیا ہے۔..... کیوں ......؟ اس لیے کہ تمام تو نہیں لیکن خاصے شعرا (ان میں شاعرات بھی شامل ہیں) کی شاعری فنی اعتبار سے خاصی مشکوک نظر آتی ہے حتیٰ کہ بعض کو تو قافیوں اور ردیفوں کا درست ادراک بھی نہیں ہوتا۔ ورڈز ورتھ کے بقول شاعری بھی جذبات کے بے ساختہ چھلک جانے کا نام ہی سہی لیکن نالہ پابندِ لے ہو تو ہی اچھا لگتا ہے۔ فن سے بے بہرہ شاعری اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن شاعری نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض پبلشرز غیر ملکی شعرا کی کتابوں کی اشاعت سے پل رہے ہیں۔ شاعر نے امریکہ سے ایک ہزار ڈالر بھیجے جو ہماری کرنسی میں تبدیل ہو کر مبلغ اسی ہزار روپے بن گئے۔ ناشر نے تیس ہزار روپے میں دیدہ زیب مجموعہ شائع کر دیا۔ شاعر لاہور آیا تو پانچ ہزار روپے میں اُس کی تقریبِ پذیرائی منعقد کرادی جس میں ہم جیسوں نے بربنائے مروت کبھی مدلل مداحی اور یا غیر مدلل مداحی سے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اس سارے عمل کے بعد جو پینتالیس ہزار روپے کی جو رقم بچی وہ ناشر کی جیب میں۔ ناشر بھی خوش، شاعر بھی خوش البتہ نقاد مجوب۔ تاہم تمام شعرا ایسے نہیں ہیں۔ بعض کی شاعری بہت اچھی ہوتی ہے دل پر اثر کرتی ہے اور شاعر کے جذبات کی مؤثر ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی شعرا ہیں جو وطن سے دور رہ کر اُردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں لہٰذا ہر لحاظ سے اُن کی ہمت افزائی بلکہ قدر افزائی ہونی چاہیے۔

میں نے اب تک صرف شعرا کا ذکر ہی کیا ہے لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ دیارِ غیر میں صرف شاعری ہی ہو رہی ہے بلکہ نثر کی مختلف اصناف جیسے ناول، افسانہ، تنقید، رپورتاژ، آپ بیتی، سفرنامہ وغیرہ کے ضمن میں بھی اچھا اور قابل توجہ کام ہو رہا ہے اور اب تو یورپ بعض ممالک سے اردو کے پرچے بھی شائع ہو رہے ہیں۔

جن میں مقصود الٰہی شیخ کا مجلہ 'مخزن' بہت اچھا اور معیاری تحریروں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یورپ میں آباد اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے معروف اہلِ قلم کی نگارشات بھی طبع کی جاتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پاکستان میں رہنے والے غیر ممالک میں آباد اہلِ قلم کی تخلیقی کاوشوں کو سنجیدگی سے لیں اور تنقیدی سطح پر اُن کی بھی ویسی ہی تحسین کریں جیسی کہ ہم اپنے وطن کے ادیبوں کی کرتے ہیں۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر یورپ کے کسی ملک میں آباد کسی تخلیق کار کی ہم تھوڑی سی بھی تعریف کریں تو وہ نہ صرف اُس کے لیے خوشی کا باعث ہوگی بلکہ اُسے مزید تخلیقات کے لیے تحریک بھی دے گی۔ ہم اُن کے لیے اور تو کچھ نہیں کر سکتے مگر ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اُنہیں حرفِ سپاس سے نوازتے رہیں۔ ہمارا کچھ نہیں جاتا لیکن اس سے اُن کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور)

پاکستان سترہ کروڑ افراد کا ملک ہے۔ اس کی قومی زبان اُردو ہے اور کئی علاقائی اور مقامی زبانوں کے بولنے والے جب کسی دیگر علاقائی زبان کے بولنے والوں کو اپنی بات سمجھانا چاہیں تو اردو کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی وغیرہ وغیرہ بول چال کی حد تک غیر رسمی زبانیں ہیں لیکن تحریر و تقریر میں جب مختلف زبانیں بولنے والوں سے تخاطب ہو تو اردو بولی اور لکھی جاتی ہے اس لحاظ سے اردو پاکستان کی رسمی زبان ہے۔

بھارت میں بھی اردو بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور ہندی بولنے والے بھی دراصل اردو بولتے ہیں کیونکہ بنیادی سطح پر ہندی اور اردو بول چال میں بہت کم فرق ہے۔ اصل فرق رسم الخط کا ہے۔

چونکہ پاکستان اور بھارت کے ان گنت لوگ دنیا کے بے شمار ملکوں میں آباد ہو چکے ہیں اور اتنی ہی بڑی تعداد میں ان کے عزیز و اقارب ان سے ملنے جاتے رہتے ہیں اس لیے دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہوگا جہاں اردو بولنے والے موجود نہ ہوں۔ اور جہاں کہیں اردو کی کم یا زیادہ ضرورت پیش آتی ہے وہاں ادبی محافل و مجالس کا انعقاد بھی ضروری ہوتا ہے جن کے ذریعے ہم اپنی جڑوں سے پیوستگی کا سچا یا جھوٹا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

امریکہ اور یورپ میں اردو دنیا کے بہت سے جزائر موجود ہیں لیکن مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، چین، جاپان، انڈونیشیا، ملائیشیا، روس، افریقہ، لاطینی امریکہ...... غرض ہر جگہ اردو بولنے اور سمجھنے والے مل جائیں گے اور چونکہ ہم بڑے جذباتی لوگ ہیں اور شعر و ادب کا ذوق یا کم از کم شوق رکھتے ہیں اس لیے پاکستان و بھارت کی طرح بہت سے دیگر ممالک میں مشاعرے، مذاکرے، مجالس، محافل، مباحثے وغیرہ برپا ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں پاکستانی اور بھارتی لوگ ہوں وہاں شعر و ادب لامحالہ ''تخلیق'' ہوگا چنانچہ بیرونی ملکوں سے اردو شاعری، افسانوی ادب، سفرنامے، آپ بیتیاں اور بہت سی دیگر اصناف میں ادبی کتابیں بڑی تعداد میں لکھی جا رہی ہیں اور اشاعت پذیر ہو رہی ہیں۔ موضوعات کچھ تو ازلی، ابدی انسانی مسائل کے بارے میں ہیں مثلاً عشق و عاشقی، کائنات اور انسان کے بارے میں فکر، کچھ نئے کلچر میں رہنے سہنے کے مسائل، کچھ اپنی جڑوں سے کٹنے کا دکھ، کچھ افسردگی و تنہائی وغیرہ وغیرہ۔

ادب اور علوم و فنون میں ہمیشہ مقدار زیادہ ہوتی ہے اور اسی سے معیاری نمونے بھی تخلیق ہوتے ہیں۔ بیرونِ وطن مستقل یا عارضی سکونت رکھنے والوں کی تخلیقات بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں، بہت سی کتابوں کے ڈھیر میں، سے معیاری کتابیں بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔

ضرورت ہے کہ بیرونِ وطن تخلیق ہونے والے ادب کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا رہے تاکہ "دانہ" "کاہ" سے الگ کیا جا سکے۔ معیاری تخلیقات کو اردو ادب کی تاریخ میں مستقل جگہ دلائی جائے۔ مصنفین و شعراء کی حوصلہ افزائی کی جائے اور جو لوگ محض دیکھا دیکھی "صاحبِ تصنیف" بن گئے ہیں اور خوشحال ہونے کی بنا پر ان کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے یا جو دوسروں کی محنت خرید کر نام کما رہے ہیں ان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بیرون وطن تخلیق ہونے والے ادب کے باذوق قاری اور پارکھ ہیں چنانچہ وہ اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعے بیرون وطن لکھے جانے والے اس ادب کو متعارف کرانے اور اس کی صحیح درجہ بندی کرنے کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے اس کام سے وسیع استفادہ کیا جائے گا۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی (لاہور)

بیرونِ ملک مقیم شعراء اور ادبا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ پردیس میں رہ کر بھی دیس کو یاد کرتے ہیں اور یہاں کی خوشی اور غمی میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ جس خطے میں مقیم ہوتے ہیں وہاں کی شعری و ادبی روایت کو اپنی شاعری میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں مقامی عناصر کی خوشبو بھی شامل ہو جاتی ہے۔

بیرونِ ملک مقیم ادبا اور شعرا نے ہمیشہ اچھا ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان کے سامنے معیاری ادب کا پیمانہ موجود نہیں ہوتا۔ ان تک جو شعری مجموعے پہنچتے ہیں وہ معیاری نہیں ہوتے۔ انہیں چاہیے کہ وہ معیاری تنقیدی کتب حاصل کریں اور ان سے رہنمائی لیں۔ اچھا شعر اور ادب اسی وقت تخلیق ہوتا ہے جب اس کے پیچھے دانش مندی کی روایت موجود ہو۔

یہ بات بہرحال خوش آئند ہے کہ بیرونِ ملک مقیم شعرا اور ادبا اپنی زبان اردو

اور اپنی کلاسیکی روایت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ان ادبا اور شعرا کی تخلیقات کی قدر افزائی اور پذیرائی کی جائے گی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے اس مستحسن سلسلے کا آغاز کر دیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری (لاہور)

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بیرونِ ملک پاکستانی تخلیق کاروں کا مقصدِ حیات ادب کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے خاندانوں اور اپنی ذات کی بہتری کے لیے دور دراز ملکوں میں نہایت محنت و مشقت سے کام کرتے ہیں اور اپنی محنت کے ثمرات زرِ نقد کی شکل میں وطن کو ارسال کر دیتے ہیں۔ صرف کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں شعر و ادب سے محبت ہوتی ہے اور اگر ممکن ہو سکے تو وہ اپنے فارغ اوقات میں مطالعہ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کبھی کوئی ادبی مجلس ہو تو ادھر کا رُخ کر لیتے ہیں۔ ان کا مقصدِ حیات سو فی صد 'کمائی' ہوتا ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی مثبت کردار ترویجِ ادب کے لیے ادا کر دیں گے درست معلوم نہیں ہوتا۔ شعر و ادب کی ترویج ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو اپنا وقت بہتر طور پر گزارنے کے لیے ادبیات میں ہلکی پھلکی دل چسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے لیے ادب ''تفریحِ طبع'' کا ذریعہ ہے اور بس۔

بیرونِ ملک پاکستانی ادیبوں کی تحریروں میں وطن کی یاد ایک قدرتی تجربے کے طور پر ضرور ملتی ہے۔ میں یہاں اپنے ایک دوست سعید انجم کی مثال دوں گا جو ناروے میں رہتے تھے اور دو ہیں تقریباً دس برس پیشتر ان کا انتقال ہوا تھا۔ وہ افسانہ نگار بھی تھے اور فلم ساز بھی۔ ان کی ایک فلم پاکستان اور ناروے میں فلمائی گئی۔ اس کا نام ''سات سمندر پار'' تھا۔ یہ فلم تارکینِ وطن کے مسائل پر تھی۔ فلم کا ہیرو ایک لڑکا تھا بارہ تیرہ سال کا وہ ناسٹلجیا کا شکار تھا۔ وہ جب بھی کسی مسئلہ کا حل سوچا کرتا اس کے ذہنی اُفق پر لاہور شہر کا آسمان نظر آنے لگتا

تھا جو پتنگوں سے بھرا ہوتا تھا یا اس کے ادا کا ہاتھ ہلاتا ہوا چہرہ ابھرتا تھا۔ سعید انجم کی لکھی ہوئی فلمی کہانی وطن کی خوشبو سے بوجھل ملتی ہے۔ مسعود منور بھی ناروے میں رہتے ہیں ان کے ہاں بھی یادِ وطن کی مہک دیکھی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں تقریباً تمام پاکستانی ادیبوں کی تحریروں میں ان کا ماضی نظر آتا ہے جو اُن کے وطن کی یادوں سے سرشار ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ماضی کو یاد نہیں کرتے۔ میں یہاں خود اپنی مثال بھی پیش کر سکتا ہوں۔ میں پچیس برس کے قریب جاپان میں رہا اور جو شاعری میں نے جاپان کے عرصۂ قیام کے دوران میں لکھی اس کا ایک اہم فیچر ناسٹلجیا ہے مثلاً نظموں میں ایک نظم "آم کے پیڑ سے باتیں" تھی۔ یہ ناسٹلجیا ہی کی ایک مخصوص مثال تھی۔ یہ بات میرے ذاتی تجربہ کا حصہ ہے کہ ناسٹلجیا کس طرح سے ایک تخلیقی تجربے کی طاقت بن جاتا ہے۔ ناسٹلجیا کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ لکھا نہیں گیا ہے، سوچا نہیں گیا ہے مگر کبھی غور کیجیے اور غزل کو دیکھیے تو ہماری کلاسیکی غزل کی روح میں ناسٹلجیا ملتا ہے۔ ایران وسط ایشیا سے آئے خاندان ہندوستان کی سرزمین پر صدیوں تک اپنے وطنوں کے گل و لالہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، جیحوں و سیحوں دریاؤں اور وسط ایشیائی پہاڑوں اور پرندوں کی یاد ملتی ہے۔ ہجرت کا سلسلہ اب دنیا میں ہر طرف پھیلتا چلا گیا ہے اور تارکین وطن کی تحریریں یادِ وطن سے ہمیشہ معمور رہتی ہیں۔

تارکینِ وطن کی تحریروں میں معیار کا سوال کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے اصل چیز حصولِ زر ہے۔ ان کی دل چسپی اسی میں ہوتی ہے۔ ادب اور ادبی معیارات کے لیے سوچنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ادب ان کی تھکی ماندہ ذات کے اظہار کا ایک ذریعہ نظر آتا ہے۔ ادبی تخلیق کے لیے توجہ اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں باہر کے ادیبوں کو حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ زندگی میں شدید دوڑ دھوپ کے بعد ادب کے لیے وہ وقت کہاں سے لائیں گے۔ اس لیے ان لوگوں سے معیار کی توقع نہ کیجیے۔

بیرونِ ملک ادیب جو کچھ کر رہے ہیں وہ غنیمت ہے۔ مشاعروں کے ذریعے

انہوں نے وطن کی تہذیبی روایات کو زندہ رکھا ہوا ہے اور ہلکے پھلکے وسائل کی اشاعت سے ادب کے ساتھ ان کی دل چسپی قرار دی جاتی ہے۔

بیرون ملک پاکستانی ادیبوں کو ملک میں زیادہ زرمبادلہ بھیجنا چاہیے جن جن ممالک میں وہ قیام پذیر ہیں وہاں کے ادب کے تراجم پاکستان میں چھپوانے چاہئیں تاکہ پاکستانی ادیبوں کے ذہنی اُفق میں وسعت پیدا ہو۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار، اردو شعروادب کے سفیر ہیں اور کسی ملک کے سفیروں میں، آپ بخوبی جانتے ہیں، ہر صلاحیت اور ہر قابلیت اور ہر مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ اپنے ملک کی بہترین اور کامیاب نمائندگی کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ قدرے کمزور اور آہستہ رو، اور کوئی کوئی ایسا نا اہل ثابت ہوتا ہے کہ اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہوئے، اپنے ملک کے لیے بدنامی کا باعث بن جاتا ہے۔

شعروادب کے سفیروں کی تخلیقات کچھ تو پاکستانی رسائل میں چھپتی ہیں اور کچھ بیرون ملک سے شائع ہونے والے رسالوں میں۔ یہ رسائل کبھی کبھار ہی نظر سے گزرتے ہیں اور ایسے سارے رسالوں تک میری رسائی بھی نہیں ہے، اس لیے جہاں تک پہلے چار سوالوں کا تعلق ہے، یقیناً بعض تخلیق کاروں کا کام بہت مثبت ہے اور ایسے تخلیق کاروں کے ہاں ملک وملت اور اپنی زمین کی بوباس کی خوش بو موجود ہے اور جس شخص کی تخلیق فنی لحاظ سے معیاری اور اس میں وطن کی خوش بو بھی ہو تو ایسے تخلیق کاروں کی سرگرمیوں کو یقیناً اطمینان بخش قرار دیا جائے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ ان تخلیق کاروں کو کیا کرنا چاہیے؟ جواباً عرض ہے کہ انھیں ہر دم یہ احساس تازہ رکھنا چاہیے کہ وہ وطنِ عزیز پاکستان کے نمائندے اور سفیر ہیں۔ مزید یہ

کہ اُمتِ وسط یعنی ملتِ اسلامیہ کے نمائندے بھی ہیں۔ دنیا ان کے ہر قول و فعل کو جس میں ان کی تخلیقات اور شعروادب بھی شامل ہے، اسی نظر اور اسی زاویے سے دیکھتی ہے اور اسی سے اُن تخلیق کاروں کا بلکہ پاکستان کا اور اُمت کا مقام و مرتبہ بھی متعین ہوتا ہے۔

مرتضیٰ برلاس (لاہور)

سوالنامہ کا ترتیب وار جواب تحریر کرنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دریں بارہ کچھ حقائق نذرِ قارئین کر دیئے جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بیرون ملک شعروادب سے متعلق وہی لوگ ہیں جو بسلسلہ روزگار برصغیر سے ترکِ سکونت کر کے کسی غیر ملک میں رہائش پذیر ہیں۔ اور یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ان تارکین وطن کی نئی نسل شعروادب تو کجا اردو لکھنے پڑھنے اور بول چال سے بھی نابلد ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تارکین وطن نے اپنی نئی نسل کو اردو زبان و تہذیب سے وابستہ رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ برصغیر ہی سے ترکِ سکونت کرنے والی کئی قوموں نے اپنی علاقائی لسانی شناخت کو قائم رکھنے میں زیادہ دلچسپی لی ہے۔ دنیا کے کسی کونے میں چلے جایئے سکھ بچے، افغان بچے، بنگالی بچے اپنی اپنی زبان بولتے ملیں گے لیکن وہ جو خود کو پاکستانی سمجھتے ہیں اپنے بچوں سے اپنی قومی زبان میں بات کرنے کی بجائے غیر ملکی زبان میں بات کرنے کو ترجیح دیں گے۔

آپ کے منسلکہ سوال نامے میں جو بات آپ جاننا چاہتے ہیں کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی شعراء اور ادبا کس حد تک پاکستانی تہذیب و تمدن کی ترویج و ترقی میں دلچسپی لے رہے ہیں تو اس سلسلے میں میرا مشاہدہ بڑا مایوس کن ہے۔ حالانکہ جو رپورٹیں ہمارے اخبار و رسائل میں شائع ہوتی ہیں اس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے تخلیق کاروں نے بیرون ملک اپنے علم و ادب سے علاقے تسخیر کر کے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک دو کو چھوڑ کر سب نے اپنی ذاتی تشہیر کے علاوہ پاکستانی علم و ادب

کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ان تخلیق کاروں میں کچھ تو وہ لوگ ہیں جو ترکِ سکونت سے قبل اپنی ادبی شناخت پیدا کر چکے تھے اور ترکِ سکونت کے بعد فکرِ معاش میں ایسے الجھے کہ ادب کی مجلسی زندگی کا ہوش ہی نہیں رہا۔ بس یہ ہوا کہ کبھی کبھار دو چار پرانے دوست مل گئے تو انھوں نے کسی گھریلو قسم کی مختصر سی محفل میں کچھ سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ انگلستان میں ساقی فاروقی، باصر کاظمی، مقصود الٰہی شیخ، اکبر حیدر آبادی، عاشور کاظمی، امریکہ میں حنیف اخگر، صبیحہ صبا، رابعہ نہاں، کینیڈا میں رضیہ فصیح احمد، بحرین میں سعید قیس وغیرہ کو اس زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے ان لوگوں کو کوئی دوش نہیں دیا جا سکتا کہ یہ لوگ جس زمانے میں منتقل ہوئے اس وقت اردو بولنے والے کم ہی لوگ تھے مگر اس کے بعد کافی آبادی وہاں منتقل ہوئی اور ادبی تقاریب بھی منعقد ہونا شروع ہوئیں لیکن ہوا یوں کہ کچھ ایسے لوگ اردو سرپرستی کے نام پر سامنے آگئے جن کا بنیادی مقصد پاکستانی اخبارات میں ذاتی تشہیر تھا انھوں نے پاکستان کے اخبار نویسوں اور کالم نگاروں سے راہ و رسم پیدا کر کے ایک حلقہ، توصیف پسنداں بنا لیا شروع شروع میں پاکستان کے صفِ اول کے شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا کہ جن کی محفلوں میں 'جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر' احساس ہوتا تھا مگر آہستہ آہستہ شاعری کے نام پر ایسے ایسے تک بندوں کو مدعو کیا جانے لگا کہ جنھوں نے پاکستانی ادب اور ادیب کو توقیر دینے کی بجائے محض تضیع اوقات کا مشغلہ سمجھا۔ اردو سے محبت کرنے والے بھی ان تقاریب میں شرکت کرنے سے گریز کرنے لگے۔

پھر یوں ہوا یہاں سے مشاعروں میں شرکت کرنے والے کچھ شاعروں نے وہاں کے لوگوں میں ایسے لوگ تلاش کرنے شروع کر دیئے جو خود کو تخلیق کار کہلوانے کے آرزومند تھے۔ ان خواہشمند لوگوں کے الٹے سیدھے مسودے لے کر یہاں آتے اور ان کے نام سے نیا شعری مجموعہ ترتیب دیتے اصلاح کا معاوضہ لیتے اور پھر ہزار نسخوں کی اشاعت کا خرچہ ڈالر، پونڈ میں وصول کرتے اور زیادہ سے زیادہ سو نسخے ان کو پہنچانے کے

لئے یہ امید رکھتے کہ تخلیق کاران کو بلا کر کتاب کی تعارفی تقریب کی صدارت کروائے گا۔

اس قسم کے لوگوں نے اردو کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچایا۔ بہرحال جن لوگوں نے سنجیدگی سے اردو کے لئے کچھ کام کیا ان میں کینیڈا کے اشفاق حسین، قطر کے مصیب الرحمان مرحوم، دبئی کے سلیم جعفری مرحوم، بحرین کے ارباب ثقافہ، امریکہ کی نیر آپا، زاہد سعید، عشرت آفرین بھارت کے آنجہانی راجندر ملہوترہ، برطانیہ بررضا رفیقان عارف اور ناروے کے جمشید سرمد نام لئے جاسکتے ہیں ان تمام لوگوں نے تقاریب کا ضرور اہتمام کیا لیکن کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے نسل نو میں اردو سے محبت پیدا ہو۔ اور پاکستانی تہذیب و ادب کی ترویج و ترقی ہو پاکستان کے ڈاکٹروں کی نمائندہ تنظیم ''اپنا'' جو ہر سال مشاعرہ منعقد کرتی ہے اس میں بھی محض یاری دوستی کی بنیاد پر شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے اور جو کلام وہاں پیش کیا جاتا ہے وہ کسی طور بھی پاکستان کی عصری آگہی یا خوشبو کا ترجمان نہیں کہا جاسکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ادب سے کہیں زیادہ پاکستانی کھلاڑیوں اور گلوکاروں نے پاکستان کلچر کو متعارف کرایا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی (سرگودھا)

سرگودھا سے لالہ موسیٰ تک ایک ریل کار مسافروں کو لانے اور لے جانے کا کارنامہ سرانجام دیتی ہے اور اس کا نام دھماکہ ایکسپریس ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہوتی کہ اس درمیان آنے والے تمام دیہاتوں اور چکوک کے مسافر اُترتے اور چڑھتے رہتے ہیں اور یہ ٹرین مستحسن طریق سے اپنا کام کرتی رہتی ہے کہ ریل آتی ہے ریل جاتی ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بھی ایک ایسا وسیلہ اور واسطہ ہیں جو موضوعات کے تنوع کے حوالے سے ادب اور قاری کے درمیان تسلسل سے ایک تعلق پیدا کئے ہوئے ہیں وہ کبھی مضافات کی طرف نکل جاتے ہیں تو کبھی بیرون ملک

سفر کرنے کے راستے نکالتے ہیں اور اس طرح وہ ادبی دھماکے کرتے رہتے ہیں جو فائدہ مند بھی ہیں اور سود مند بھی اور اس سے جو اثرات اہلِ قلم پر مرتب ہوتے ہیں وہ نہایت ہی خوشگوار اور ادبی مستقبل پر خوش آئند صورتِ حال واحوال کا منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں۔ اس منظر نامے کو اُجاگر کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنی نئی کتاب ''اُردو شعروادب کے سفیر'' کا اعلان نامہ جاری کیا ہے اور حسبِ روایت اہلِ دانش و بینش سے سوال پوچھے ہیں اور ان کے فوری جوابات کا تقاضا بھی کیا ہے اور پھر ''ٹائم از اوور'' کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ہمیں چونکہ ان کی خوشنودی درکار ہے اور پھر ان سے محبت اور اخوت و بھائی چارے کا رشتہ ہے اس لئے تعمیلِ حکم کے لئے جوابی پرچہ ارسال ہے۔

سوال ۔ کیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب ۔ اس کا جواب ہاں میں ہے اس لئے کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار بطریقِ احسن ادا کر رہے ہیں اور پوری دنیا کے ادبی دھارے میں بالعموم اور پاکستانی ادب کے بحرِ ذخار میں اُردو شعروادب کی ہر صنف میں اپنی تخلیقات کے حوالے سے شناخت اور پہچان رکھتے ہیں اس وقت مجھے جو نام یاد آ رہے ہیں ان میں حضرت شاہ، عاشور کاظمی، ساقی فاروقی، منصور آفاق، فیضان عارف اور بخش لائل پوری کے نام اور کام نمایاں ہیں۔ کینیڈا میں عزیز احمد طویل عرصے تک مقیم رہے اور ادب کے فروغ کے لئے بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی کتاب ''اقبال اور نئی تشکیل'' اقبالیات میں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے سلسلے میں مَیں نے ان کے مضامین کا مجموعہ ''اقبال اور پاکستانی ادب'' کے نام سے ترتیب دیا تھا جو اب حوالے کا کام دیتا ہے۔ اسی طرح کینیڈا میں مقیم اشفاق حسین نے فیض اور فراز پر بڑا کام کیا ہے اور خود ان کی شاعری کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

امریکہ میں ریحانہ قمر اور افتخار نسیم کے علاوہ بہت سے شعراء اور ادباء اپنے تخلیقی سفر میں سرگرم عمل ہیں۔ جرمنی میں ڈاکٹر سعید اختر درانی، اقبال حیدر اور حیدر قریشی بھی اپنا ادبی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ناروے کا خیال آتے ہی جمشید مسرور کا خیال آتا ہے اور پھر معروف مزاح نگار، طنز نگار، کالم نگار اور ڈراما نگار عطاالحق قاسمی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ جو وہاں سفیر رہے ہیں اور سفارت کے قیام کے دوران ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ع۔ س۔ مسلم حمد و نعت اور اسلامی فکر کے حوالے سے اہم نام ہیں وہ پہلے شارجہ میں مقیم رہے آج کل دوبئی میں ہیں اور وہاں بھی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اسی طرح دیگر ممالک میں بھی پاکستانی اہلِ قلم ادب کی تخلیق کے تناظر میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور اس کا گراف بہت اونچا ہے۔

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب ۔ یقینی طور پر ان کی تخلیقات میں وطن کی مٹی کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے اور ان کے ہاں ہجرت کا تجربہ، وطن کی یادیں، پردیس میں ثقافتی مسائل کا سامنا کرتے ہوئے جو صورتِ حال پیش آتی ہے اس کا اظہار ان کی غزل اور نظم دونوں سے ہوتا ہے، خاص طور پر وطن سے دوری کا احساس اور دیارِ وطن کا حوالہ موجود دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے تجربات کو بھی اپنی تخلیق کے ذریعے سامنے لاتے ہیں اور ایک طرح ادب کو نئے مضامین سے روشناس کراتے ہیں۔

سوال ۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ بیرونِ ملک مقیم ادباء اور شعراء اپنے اپنے انداز میں جرائد بھی نکالتے ہیں اور ادبی پرچے بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سے نکلنے والے ادبی رسائل میں بھی ان کی تخلیقات برابر شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان کا مطالعہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ اور معیاری ادب تخلیق کر رہے ہیں اور جو کتابیں یہاں پہنچتی ہیں وہ ہر اعتبار سے

پاکستان میں شائع ہونے والی کتب سے کسی طرح کم نہیں اور میں نے پہلے سوال کے جواب میں جو نام لکھے ہیں اُن سے وہاں کے معیاری ادب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہاں رہ کر بھی پاکستانی ادب اور تخلیق ہونے والے ادب کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں اور مکمل طور پر رابطے میں رہتے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب ۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی اہلِ قلم جس محنت اور ریاضت سے خود کو ادبی دھارے میں شامل کئے ہوئے ہیں اور ادب میں آنے والے نئے رجحانات سے بھی واقف ہیں اور اُن تجربات سے بھی شناسائی رکھتے ہیں جو لمحۂ موجود میں عالمی نظام میں نت نئی تبدیلیوں کا عکاس ہے تو وہاں کے لکھنے والے جو ادب تخلیق کر رہے ہیں اور جن اصناف میں اپنی تخلیقی فعالیت کا بھرپور اظہاریہ پیش کر رہے ہیں وہ ہر لحاظ سے ادبی معیارات پر پورا اُترتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں کی جو صورتِ حال ہے اس سے یہاں کا ادیب بھی مطمئن نہیں تو پردیسیوں کی بھی تو یہی سوچ ہوگی تاہم جہاں تک ادب اور اس کی رفتار کا تعلق ہے میں اس سے مطمئن ہوں۔

سوال ۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب ۔ آپ کے علم میں ہے کہ پاکستانی دنیا اور باہر کی دنیا میں بہت فرق ہے۔ بیرونی ممالک میں ادب کے حوالے سے جو کچھ لکھا جا رہا ہے اور گلوبلائزیشن کے دور میں دنیا جس طرح بدلتی جا رہی ہے اس صورتِ حال کا عکس ان کی ادبی تخلیقات میں ہونا چاہیے اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے ادیبوں، قلم کاروں اور لکھنے والوں کی تحریروں کے تراجم کرنے چاہئیں تاکہ یہاں کے بسنے والے ادیب اُن کے تخلیقی تجربات، موضوعات اور جذبات واحساسات سے آگاہ ہوسکیں اور پھر چونکہ وہ پاکستانی سفیر ہیں اس لئے انہیں اپنے ملک کے امیج کو بہتر بنانے اور پاکستان کی اہمیت اور خطے میں اس کی ضرورت اور جواز

کے بارے میں بھی ادب کے ذریعے معلومات بہم پہنچانی چاہئیں اور ایسا کرنا ان کا فرض بھی ہے اور ان پر قرض بھی! کہ اس سے ادب اور اس کے ذریعے تعلقات، سوچ وفکر میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے اور یوں عوامی سطح پر بھی ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے اور یہ کام صرف ادیب اور شاعر ہی کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی (سرگودھا)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اردو ادب کی نامور شخصیت، سچی انسانی قدروں کے ترجمان اور ایک مستند نقاد ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی کتاب 'مضافاتی شعروادب' میرے سامنے ہے۔ یہ تحقیق کے لحاظ سے ایک عمدہ کام ہے۔ آپ وہ خوش آہنگ ادیب ہیں جو بقول پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی:

''اپنے کاروانِ شوق کو صحراؤں کی دھوپ اور کڑی آزمائشوں میں لے کر نکلتے ہیں اور کارِ سخن طرازی کرتے ہیں۔''

محترم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے چند ماہ پہلے مجھے بتایا کہ ان کی اگلی تصنیف بیرون ملک پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی کارکردگی کے بارے میں ہوگی۔ سمندر پار رہنے والے متعدد پاکستانی ادبا و شعرا پاکستانی ادب کی تخلیق میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

نہ صرف پاکستانی دانشور اور اہلِ قلم نے بیرونی ممالک کی طرف ہجرت کی اور وہاں طویل عرصہ تک قیام کیا بلکہ دیگر ممالک کے ادیبوں کی بھی مثالیں ہمیں ملتی ہیں مثلاً عرب ممالک سے بے شمار شعرا و ادبا شمالی امریکہ گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا۔ ان ادیبوں نے عربی ادب وصحافت کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے ادب سے رشتہ نہیں توڑا۔ ۱۹۸۰ء تک امریکہ اور کینیڈا میں ۱۳۵ اخبارات عربی زبان میں

چھپے۔ اعلیٰ معیار کے ادبی مجلے بھی شائع کیے گئے جو عربی زبان میں تھے مثلاً 'الفنون' جو امریکہ میں ۱۹۱۸ء۔ ۱۹۱۳ء کے درمیان شائع ہوتا رہا۔ دنیائے عرب کے دانشوروں نے ۱۹۲۰ء میں ایک ادبی کلب بھی تشکیل دیا جسے الرابطہ القلمیہ کا نام دیا گیا۔ اسی طرح لاطینی امریکہ میں بھی عرب ادیبوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور اعلیٰ معیار کا عربی ادب تخلیق کیا۔ لاطینی امریکہ میں ان سکالرز نے ۴۹ عربی اخبارات اور ۳۵ مجلے شائع کیے۔ لاطینی امریکہ کے صرف ایک شہر Sao Paulo میں عربی زبان و ادب پر ۲۰۰ اعلیٰ معیار کی کتب شائع ہوئیں۔ سمندر پار عرب ممالک سے ہجرت کرنے والے دانشوروں میں میخائل نعیمہ، خلیل جبران اور امین الریحانی بہت مشہور ہیں۔ ان ادیبوں نے جو قیمتی لٹریچر امریکہ وغیرہ میں شائع کیا اُسے الادب المہجر (Mahjar Literature) کا نام دیا جاتا ہے۔

عرب سکالرز نے مغربی ممالک میں رہ کر اپنی شاعری، نثر اور صحافت سے تعلق نہیں توڑا۔ یہ اُن کے کارناموں کی ایک روشن مثال ہے۔ سمندر پار پاکستانی دانشوروں کو بھی چاہیے کہ وہ اس روشن مثال کی تقلید کریں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی خدمت میں حسب ذیل گزارشات پیش کرتا ہوں یا بالفاظ دیگر میرا یہ پیغام ہے سمندر پار پاکستانی ادیبوں کے نام جو میں ڈاکٹر صاحب کی وساطت سے ان تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

(۱) سمندر پار پاکستانی 'الرابطہ القلمیہ' کی طرز پر ایک ادبی کلب بنائیں۔ یہ کلب شعر و ادب پر معیاری کتب جو سمندر پار پاکستانیوں کی تخلیق ہیں، شائع کرے۔

(۲) پاکستان اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے وہ کون سی نعمت ہے جو ہمارے پاس نہیں لیکن امن کا فقدان ہے۔ پاکستانی

ادب بیرونِ ملک رہتے ہوئے پاکستان کے بارے میں اچھا تاثر دیں اور اسے شائع کریں۔

(۳) یہ دانشور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کریں۔ ان کی تحریروں سے نوجوان پاکستانی نسل اپنی کردار سازی کر سکتی ہے۔ یہ دانشور دینِ اسلام کی سرفرازی اور اس کے آفاقی پیغام کو بھی پھیلائیں کیونکہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم ہے۔

(۴) مستشرقین نے اسلامی دنیا کے لئے بہترین لٹریچر تخلیق کیا مثلاً E.G. Brown نے Literary History of Persia لکھی جو فارسی ادب پر شہرۂ آفاق کتاب "A Literary History of the Arabs" امریکہ سے P.H. Himi نے "History of the Arabs" تحریر کی اور پاک و ہند میں ایک انگریز بیوروکریٹ رولف کوریو نے پختونخواہ کی تاریخ لکھی جو The Pathan کے نام سے معروف ہے۔ سمندر پار پاکستانی ادیبوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسا معیاری اور تخلیقی کام کریں جس سے پاکستانی طلباء اور ریسرچ سکالرز استفادہ کر سکیں۔ سمندر پار پاکستانی ادیبوں کی معیاری کتب کو ہمارے تعلیمی سلیبس میں بھی شامل کیا جائے۔

آج دنیائے عرب الادب المھجر پر فخر کرتی ہے۔ خدا کرے وہ وقت آئے کہ ہم بھی سمندر پار پاکستانی ادیبوں کے تخلیق شدہ ادب پر فخر کریں۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی یہ تازہ تصنیف جو بیرونِ ملک پاکستانی ادیبوں کے بارے میں، اُردو نثر میں انشاء اللہ ایک اہم اور خوشگوار اضافہ اور سنگِ میل ثابت ہوگی۔

پروفیسر احمد عقیل روبی (لاہور)

کام کرنا اور اچھا کام کرنا کوئی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سے سیکھے۔ دل کو شامل کار کر کے وہ جس کام کی داغ بیل ڈالتے ہیں اُسے انجام تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن تنقید اور تحقیق کا وہ اسپ خوش خرام ہے جو جس سمت کا رُخ کرتا ہے کامیابی کے جھنڈے گاڑھ کر واپس لوٹتا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ہر کام ادب کے قارئین سے داد طلب ہے۔ اُس نے بے شمار شاعروں، نثر نگاروں اور نقادوں کو گمنامی کی دُھند سے نکال کر نا موری کے تخت پر بٹھایا اور اُن کے کام کو سراہا اور قارئین کی توجہ اُن کی طرف دلائی۔ قصیدہ، مرثیہ، سلام، غزل، نظم، ناول، افسانہ ادب کی وہ کون سی صنفِ سخن ہے جس پر شبیہ الحسن نے نہیں لکھا۔ کالم نگاری، ادارت، ریڈیو، ٹی وی پروگرام، ادبی تقریبات، تجزیاتی اجلاس، ٹاک شوز، شبیہ الحسن ہر قول میں پورا اُترتا ہے۔ دن رات تخلیقی کام، تھکن کا نام نہیں، ایک جنون ہے جو اُسے کارِ دشوار میں آسانیاں فراہم کرتا ہے اور وہ بال کی طرح مکھن سے کام سے فراغت حاصل کر کے باہر نکل جاتا ہے۔

ہم اُڑے پھرتے ہیں مثل خوشبو
دیکھتا رہتا ہے رستہ کو کو

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ایک تحقیقی کام پچھلے دنوں سامنے آیا ہے۔ وہ مضافاتی شعرا کو یک جا کر کے اُن کی پذیرائی کا کام ہے۔ شبیہ الحسن نے مرکز سے دُور بسنے والے اُن شعرا اور ادیبوں کو نمایاں حیثیت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے جن میں بڑے گن گیان تھے مگر دور دراز علاقوں میں اپنی چمک دکھا رہے تھے اور بڑے شہروں میں رہنے والے اُن سے بے خبر تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ کارنامہ انجام دے کر قارئین پر بڑا احسان کیا ہے۔ جنگل میں

مور ناچ رہے تھے اور بہت سے لوگوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اُن کے ناچ میں اتنی رعنائی، کشش اور نیا پن ہے۔

اب ڈاکٹر شبیہ الحسن جس کام کا بیڑا اُٹھا رہے ہیں وہ بھی اُتنا ہی اہم ہے جتنے اہم کام اُنہوں نے پہلے سرانجام دیئے ہیں۔ وہ اس بار ملک سے باہر رہنے والے اُن لوگوں پر کام کر رہے ہیں جو اردو زبان کے فروغ کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔ شاعری اور نثر سے اردو کے دامن کو وسیع کر رہے ہیں اور اس زبان کی نزاکتوں اور خوبصورتیوں کو چشمِ غیر میں نمایاں حیثیت دلا رہے ہیں۔

شبیہ الحسن کا کام ہمیشہ ذاتی مفاد سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کچھ لوگوں نے کام کیا مگر یہ کام کرتے ہوئے اُن کے نزدیک تخلیقی معیار کچھ اور تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن جس جذبے کے تحت یہ کام کر رہے ہیں وہ خالص تخلیقی اور تحقیقی جذبہ ہے۔ اس کام میں اُنہیں نہ ذاتی ناموری درکار ہے اور نہ ہی غیر ملکی دورے کی اُمید اور خواہش وہ تو اہلِ وطن کو یہ جتلانا چاہتے ہیں کہ گھر میں جو ہو رہا ہے وہ تو آپ نے دیکھ لیا وہ بھی دیکھ لیجئے جو سمندر پار ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا جنون اور تخلیقی دیوانہ پن اِس کام کو جس احتیاط اور سلیقے سے کرے گا اُس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ یہ کام بھی دادطلب ہوگا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک ادبی جن ہے۔ دس آدمیوں کا کام اکیلے کرتا ہے اور ہر کام پر اُس کے سلیقے اور ہنر کی مہر ہوتی ہے...... آخر یہ سعادت اُسے کیوں نہ حاصل ہو۔ یہ بیٹا اُس نامور دانشور، شاعر اور تخلیق کار کا ہے جس نے چلتے گدھے کے سر پر اگر ہاتھ رکھا تو وہ شاعر ہو گیا۔ سارے ملک میں اُن کے شاگردوں کے طوطی بولتا ہے اور سب اُن کے نام کی مالا جپتے ہیں۔ بیٹا باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ مجھے یقین ہے جو منزلیں وحید الحسن ہاشمی سَر نہ کر سکے اُنہیں ڈاکٹر شبیہ الحسن سَر کرے گا۔

ناصر زیدی (لاہور)

محترم ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب ایک نامور باپ کے ہونہار بیٹے ہیں۔ مکرم و محترم جناب وحید الحسن ہاشمی کا ادبی کام اور نام نہایت معتبر ہے۔ وہ بنیادی طور پر ہمہ جہت استاد ہیں، آنے والوں کے لئے ادب کا روشن مینار ہیں۔ خصوصاً رثائی ادب میں ہر لحاظ سے بے عدیل ہیں۔ اُن کے فرزندِ ارجمند میں بھی اُن کے بہت سے خصائص منتقل ہوئے ہیں۔ انہیں بھی نئی سے نئی سوجھتی ہے۔ متنوع موضوعات پر اُن کا ادبی کام لائق تحسین ہے۔ آنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ وہ متعدد کتب کے مصنف، مؤلف، مرتب ہیں اور بہت تیزی سے درجۂ کمال کی طرف گامزن ہیں۔ ابھی تک وہ اپنا جو بھی قلمی کام کتابی صورتوں میں لا سکے ہیں اُس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ناقدینِ ادب و فن کو اک عمر چاہیئے......!

تازہ ترین کتاب "اُردو شعر و ادب کے سفیر" اُن کے کارہائے نمایاں کی ایک نئی جہت ثابت ہوگی۔ وہ نہایت استقامت، مستقل مزاجی اور تندہی سے جس کام کا آغاز کرتے ہیں اُسے انجام تک پہنچا کے ہی چھوڑتے ہیں۔ بار بار کی تاکید کسی بھی لکھنے والے کو اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتی، جلد یا بہ دیر اُن کا ہدف زیرِ دام آ کر ہی رہتا ہے۔ تازہ ترین تاکیدی مراسلے کے بعد مجھے بھی جائے فرار نظر نہیں آتی، سو حاضر ہوں......!

○ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار "حسب المقدور" ہی ادا کر پا رہے ہیں کہ اُن کے سامنے اصل مسئلہ تو حصولِ زر کا ہے، جس کے لئے اُنہوں نے نقلِ مکانی کی، وطن سے بے وطن ہوئے...... وہ وطن کی یاد میں خاصا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اُن کا بڑا مسئلہ "شعر و ادب" کی ترویج نہیں دیارِ غیر میں اپنی شناخت بنانا اور محافل میں نمایاں

ہونا بھی ہے۔ اُدب اُن کا ہمہ وقتی مسئلہ نہیں انہیں ادبی وسائل بھی ویسے میسر نہیں جیسے اپنے وطن میں ممکن تھے اس لئے جو ہے، جیسا کچھ ہے، غنیمت ہے۔

O ان کی تخلیقات میں وطن کی یادوں کی کسک بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ شاعری ہو یا افسانہ یا سفرنامہ یا رپورتاژ یا اکا دُکا ناول، وہ کھوئے ہوؤں کی جستجو کا مظہر، یادوں اور وطن کی خوبی و خوبصورتیوں کا عکاس ہے۔ "وطن کی خوشبو" نہیں وطن سے دُوری کی کراہتوں کی بُو البتہ مشامِ جاں کو متعفن ضرور کرتی ہے۔

O ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا عمومی معیار کچا پکا ہی ہے۔ البتہ جو وہاں رہتے ہوئے اپنے اپنے وطن کے ستھ، نامور، معتبر اہلِ قلم سے باقاعدہ "زرِ کثیر" کے عوض "اصلاح" لیتے رہتے ہیں اُن کی تخلیقات اُسی معیار کی ہیں جس معیار کے اصلاح دینے والے ہیں۔ اپنے زورِ قلم کے بل پر بیرونِ ملک مقیم تخلیق کار وہی معتبر ہیں جو اپنے وطن میں بھی الگ شناخت رکھتے تھے۔

O مطمئن ہونے کا کیا مطلب؟ مطمئن تو کبھی کوئی کسی سے یا اپنے آپ سے بھی نہیں ہوتا بس جو کچھ یہ کر رہے ہیں بس غنیمت ہے، کرنے دیں۔ روکو مت جانے دو!

O ان تخلیق کاروں کو تخلیقی عمل جاری رکھنا چاہیئے۔ لکھوانے والوں کی اور لکھوانے والیوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے۔ پیسے دے کر پوری پوری کتاب لکھوانے کے عمل کو روکنا چاہیئے۔ خود لکھنا چاہیئے۔ مطالعہ کرنا چاہیئے اور صحیح اُستاد پکڑنا چاہیئے......!

خیر یہ تو نو واردانِ ادب کے لئے مشورہ ہو سکتا ہے ویسے مشورہ کون، کب کسی کا مانتا ہے؟ سچی بات ہے دیارِ غیر میں رہ کر بھی جنہوں نے نام کمایا اور کام کیا وہ لائقِ احترام

ہیں۔ تحقیق کے میدان میں تقی عابدی اہم کام کرتے رہتے ہیں۔ شعراء میں عاشور کاظمی، احمد مشتاق، حسن عباس رضا، معتبر ادیبوں، افسانہ نگاروں میں ابوالحسن نغمی، مقصود الٰہی شیخ، رفعت مرتضیٰ ہیں۔ مرحومین میں بخش لائلپوری، جوہر میر ہیں۔

نام بہت سے کیا گنوانے؟ انہیں چاہیئے بار بار بلوائے گئے شعراء وادباء ہی کو نہ بلاتے رہیں نہ انہیں سُن سُن کر بور ہوں۔ ہر بار کچھ نئے لوگ، کچھ تازہ دم واردانِ ادب کو موقع دیں اور اُنسے روشنی لیں کہ بقول ظہیر کاشمیری:

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب

ہمارے بعد اندھیرا نہیں، اُجالا ہے

ڈاکٹر اجمل نیازی (لاہور)

میرے خیال میں بیرون ملک مقیم لوگوں کے روابط پاکستان کے ساتھ اس وقت باقاعدہ جاری ہوئے جب شعروادب سے اُن کا ناتہ جڑا۔ اگرچہ پاکستان سے چند مخصوص لوگوں کو بار بار بیرون ملک بلایا گیا مگر یہ بات غنیمت ہے کہ اس طرح ایک ایسے تعلق کی بنیاد پڑی جس نے پاکستان کو دنیا بھر میں متعارف کرایا۔ اس حوالے سے اگر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بیرون ملک رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کو پاکستان کا سفیر کہتے ہیں تو یہ بالکل بجا ہے۔ اس طرزِ احساس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بڑے بڑے اچھے لکھنے والے سامنے آئے ہیں۔ ایسے میں اُن لوگوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو ملک سے باہر اس طرح کی محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ محفلیں بالعموم مشاعروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پہلے صرف ثقافتی سرگرمیاں ہوتی تھیں جس میں گانے والوں اور گانے والیوں کی بہت دھوم مچتی تھی۔ اس کے مقابلے میں شعروادب کی محفلیں زیادہ کامیاب ہیں۔ یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے شاعری لکھوا کر کتابیں شائع کروائیں۔ میرے خیال میں یہ بھی کوئی

اتنی بری بات نہیں کہ امیر کبیر لوگ منفی معاملات میں پیسہ اُڑانے کے بجائے شعروادب کی اشاعت میں اپنے دل کو لگائیں۔ بیرون ملک سے بہت سے لوگ پاکستان آئے اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا کہ فاصلے ختم ہو گئے۔ یورپ، امریکہ، بھارت، عرب امارات، ایران، سعودی عرب، ناروے، کینیڈا کے علاوہ اور بھی کئی ممالک میں اس طرح کی ادبی سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بیرون ممالک پاکستانی کمیونٹی کو متحد ہونے کا موقع ملا۔ شعروادب نے لوگوں کو پاکستان سے محبت کی خوشبو عطا کیا۔ اُن کی مشکلات و مسائل کا علم ہوا۔ اس طرح ایک نئی دنیا دریافت ہوئی۔ مجھے بھی چند ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے وہاں کے لوگوں کا والہانہ پن اور وطن سے آنے والوں کے لیے اُن کی بے پایاں محبت کا اندازہ ہوا۔ ایسے موقعوں پر میلوں کا سماں دیکھنے میں آیا۔

بیرون ملک مقیم سفیرانِ شعروادب کو چاہیے کہ وہ ذوق وشوق کی تعمیر کے علاوہ تھوڑا سا تنقیدی رویہ بھی اختیار کریں اور یہ دیکھیں کہ کس آدمی کی کیا اہمیت ہے اور اُس کی خدمات کتنی ہیں؟ پاکستان سے بھی جن لوگوں کو بلایا جائے وہ جینوئن ہوں تاکہ اُن کی موجودگی سے حقیقی شعروادب کی تفہیم ہو سکے۔ نیز مختلف مزاج کے حامل لوگوں کو مدعو کیا جائے تاکہ بیرون ملک مقیم قارئین کو شعروادب کا حقیقی ادراک ہو سکے۔ اُردو کو عالمی زبان بنانے میں بھی اس طرح کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کو بطور خاص چاہیے کہ وہ اپنے بچوں میں اردو کا صحیح ذوق وشوق پیدا کریں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ وہ اُردو رسم الخط سے آشنا نہیں ہیں۔ بچوں کو اردو زبان سے آگاہی کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ جب پاکستان سے لوگ وہاں جائیں تو انہیں پاکستانی ہونے پر فخر ہو سکے اور وہاں مقیم لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ یہی حیثیت اُن کی پہچان ہے اور یہی اُن کے لیے اعزاز کا سبب ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے یہ کام کر کے پاکستان اور بیرون پاکستان کے ذوق و شوق والے لوگوں کے لیے ایک نئی اور روشن روایت قائم کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بیرون ملک رہنے والوں میں مقبول ہو گی اور پاکستان میں رہنے والوں کے لیے بھی ایک انوکھی کشش کا باعث بنے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر علی شیر طُور (ملیشیا)

آپ ترویج اردو ادب کیلئے جو کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں خدا تعالیٰ انہیں قبول و منظور فرمائے۔ (آمین) ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' کیلئے جواباً عرض ہے:

۱۔ بیرونِ ممالک مقیم پاکستانی واقعی اردو زبان و ادب کیلئے خاطر خواہ کام کر رہے ہیں۔ اخبارات اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے اکثر وہاں کی ادبی محافل و مجالس کی رودادیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات اردو زبان و ادب سے محبت کرتے ہیں اور تعمیری کردار ادا کر رہے ہیں۔

۲۔ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کی تحریروں اور تقریروں سے وطنِ عزیز کی محبت اور لگاؤ کی خوشبو آ رہی ہوتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ باہر رہتے ہوئے بھی پاکستان سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔

۳۔ بیرونِ ملک فروغ پانیوالا ادب واقعی معیاری ہے اور وہ بھی زبان و ادب کی ترقی میں برابر کے شریک ہیں۔

۴۔ بیرون ملک ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ادب کی ترقی کے تمام معیاروں پر پورے اترتے ہیں۔

۵۔ بیرونِ ملک تخلیق کاروں کو نظریہ پاکستان اور اسلام کا صحیح تشخص اُجاگر کرنا چاہیے۔ اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہو اور اندرون ملک ہونے

والے کام کے شانہ بشانہ وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی میں بھر پور حصہ لینا چاہئے۔ وہ پاکستان کے ادبی سفیر ہیں لہٰذا اُن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کی بقا و سلامتی کیلئے ادبی پارے تخلیق کریں۔ اپنے وطن کیلئے اخلاقی، مالی جس قسم کی امداد کی ضرورت ہو کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں۔

گاہے بگاہے پاکستان کے اساتذہ، شعرا اور ادبا کے وفود بلا کر ادب کے حوالے سے تخلیقی کام میں ایک دوسرے سے استفادہ کریں تاکہ ہم مل کر ثابت کر دیں کہ ہم امن و سلامتی سے رہنے والی زندہ قوم ہیں اور احترامِ باہمی پر عمل پیرا ہونا ہمارا شعار ہے۔

پروفیسر رب نواز مائل (کوئٹہ)

برادرِ عزیز ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب۔ تسلیمات

آپ کی نئی کتاب ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' تحریر کے ذریعے ایک ایسی خبر دل کو لگی کہ گویا کیا کیا اس میں نہ ہوگا۔ راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں کے مصداق۔ خیر اس بات کو یہیں چھوڑتا ہوں کہ اس سے متعلق تو سب بعد میں معلوم ہوگا۔ آپ کے پانچ سوالوں کی طرف آتا ہوں کہ سوال آپ کے کام سے یقیناً متعلق ہیں سو کچھ عرض کر ہی دوں تو ٹھیک ہوگا۔

سوال نمبر ایک کے جواب میں یہی کہتا ہوں کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کیلئے مثبت کردار ایسا ہی ادا کر رہے ہیں جس طرح کہ ہم یہاں اپنے وطن میں کہ نظم میں تو غزل سے بڑھ کر کوئی مؤثر اور بڑی صنف دوسری نہیں ہے اور پھر کتنا بھی بدلاؤ کوئی اس میں چاہے قائم چاند پوری کے بقول غزل کو غزل طور تو ہونا ہی پڑتا ہے ورنہ کیا غزل اور کیا اُس کا طمطراق اور پھر کیا اُس کی شیرینیت اور پا مضامین خوش کی نرم و تر سی نشریت۔ میر کے بہتر نشتر اگر نہیں مانے گئے تو دوسرے تو بہت سے مانے گئے۔

دوسری طرف آ کر جہاں سماں مشاعروں کے انعقاد کو اگر ذرا دیکھ میں رکھیں

تو سند حاصلِ کلام کی پگڑی کس کے سر پر رکھی جاتی ہے کب نہیں دیکھتے۔ تیسری طرف اگر داستانیں نہیں لکھی جاتیں تو افسانہ گوشت پوست سے لے کر مقاماتِ شاد و حسین سے تا مقاماتِ آہ و فغاں کیسا بڑا وہاں بھی نہیں جسے ہم بیرونِ ملک کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ سو بیرون کے اہلِ قلم شعر و ادب کی ترویج کے لئے بڑا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔

سوال ۲ کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ وطن کی خوشبو تو اُن ہی تخلیق کاروں سے زیادہ محسوس ہوگی کہ جن کے ہاں تو دل رہینِ وطن آتا ہے اور ذہن رہنِ معاش۔ یادیں یہاں سب دور پڑی ہوتی ہیں۔ اولین فطری و فطری ماحول کی تو درد کیا نہیں کہوا تا اور کون سا لفظ کسی بھی تخلیق کا یوں اپنی خوشبو محسوس نہیں کراتا۔

سوال ۳ کے تعلق سے کہوں گا کہ بیرون کے اُن تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار بالکل ہماری طرح ہی بڑے مزید بڑے اور بہت ہی مزید بڑے وژن سے متعلق ایک خاص اندازِ نظریہ ہوتا ہے۔ جس میں موضوع و اسلوب دونوں یوں گتھے ہوئے سے ملتے ہیں کہ ناخن گوشت سے جدا کیسے ہو گیا ایک اور ایک ہی ٹھہرتے ہیں۔ اور زہرہ نگاہ ساقی فاروقی، ڈاکٹر مصطفیٰ کریم، مقصود الٰہی شیخ، مامون ایمن اور منیر احمد جیسے کئی ایک اور دوسرے بھی مل سکتے ہیں سو معیار ہے اور اس کا تردد بے کار و فا کار۔

سوال ۴ سے متعلق میری زبان پر بلا شک و شبہ یہ آ سکتا ہے کہ میں بیرون ملک پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہوں کچھ ایسے بھی کہ وہ اُردو کے تعلق سے زبان اور تہذیب ہر دو کا بڑی نسل کے لوگوں کے تعلق سے پورا پورا شعور بہت پہلے سے ہی رکھتے ہیں اور پھر معاملات کو مشرقی یا ترقی یافتہ کلچر سے کم اور اپنے کلچر اور اپنی گھڑ و نچی سے کہ کہاں رکھی جائے کچھ بہت ہی زیادہ لے لیتے ہیں۔

سوال ۵ کے جواب میں مجھے یہی کہنا ہے کہ وہ باہر مقیم تخلیق کار جس طرح وطن کے جریدوں کی مالی اضافہ جات سے کافی و شافی مدد کر رہے ہیں ملک کی بھی زیادہ سے زیادہ

مدد کریں کہ ایں کار سے تو کردہ ان کے تعلق سے برابر کہا جا سکے۔

ڈاکٹر عقیلہ (بہاولپور)

فن کار دھنک رنگوں، مدھر سروں اور محبت لفظوں کی وہ روشنی ہے جو دل و ذہن میں اپنی کرنیں بکھیرتی ہے تو روحیں اُجال دیتی ہے۔ فن کار کسی زمانے یا کسی دھرتی کا ہو، سکوت لمحوں میں وہ صدائیں تحریر کرتا ہے جو دلوں کو حق اور سچ کی لے پر دھمال ڈالنا سکھاتی ہیں۔ فن کار سراپا اثبات ہے۔ سچا فن کار کسی مٹی کسی زمین کا ہو وہ انسانیت، امن، محبت، مساوات اور آزادی کا پیامبر ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جبر اور گھٹن کے ماحول میں تو پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں دَم توڑ دیتے ہیں چنانچہ ہمارے وہ تخلیق کار جو وطن سے دور ہیں اُن کے دل پر "پاکستان" اور "اردو" لکھا ہے۔ وہ نیویارک کی اردو انجمن ہو یا ٹورنٹو اور مانٹریال کی اکیڈمی آف اُردو لٹریچر، رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈینز ہو یا لندن کا اردو مرکز، ابوظہبی کی اُردو مجلس ہو یا دبئی کی ادبی بیٹھک، ان سے وابستہ بلکہ وہاں مقیم تمام پاکستانی اردو شعر و ادب کی ترویج میں نہایت مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ خاموشی کی قوت اور کلام کی توانائی دونوں سے آشنا ہیں۔ دیارِ غیر میں اُردو اور پاکستانیت کی پہچان انہی کے ہاتھوں سرانجام پائی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر انوار احمد، اشفاق حسین، عبدالرحمان عبد، رئیس وارثی، حسن چشتی، زہرہ نگاہ، رضا عابدی، خواجہ رضی حیدر، ظفر رضوی، شاہد کمال، افتخار نسیم، زاہد سعید، فرحت زاہد، نوشی گیلانی، ریحانہ قمر، رشید عیاں، حمیرا رحمان وغیرہ جنہوں نے شعری و نثری ادب بلکہ تحقیق و تنقید میں بھی ایسا معتبر کام کیا ہے جس کی پذیرائی نہ صرف وہاں ہوئی بلکہ یہاں بھی ان کا نام اعلیٰ درجے کے تخلیق کاروں میں لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر انوار احمد، اشفاق حسین کے تحقیقی و تنقیدی مضامین، ریحانہ قمر، نوشی گیلانی، رئیس وارثی، ظفر رضوی کی شاعری، فرحت

پروین اور فاروق ندیم کے افسانے اُردو کے کسی بھی کڑے انتخاب میں جگہ پاسکتے ہیں۔

وطن سے دوران تخلیق کاروں کیلئے وطن کی مٹی وہ خاکِ شفا ہے جو ہجر و فراق کے لمحوں میں درد کا درماں بنتی ہے۔ زندگی کے نامعلوم جزیروں میں معاشی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے انہیں ملکِ عزیز کی تنگ و تاریک گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، جھگیوں میں بستے حسرت زدہ چہرے یاد آتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کی آسائشیں بھول جاتے ہیں۔ وہ چکا چوند روشنیوں میں پاکستان کے اندھیروں کو یاد کرتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں آج کے پاکستان پر دُکھ و ملال کی کیفیت بھی ملتی ہے اور یہ اُمید بھی کہ اُن کا پیارا وطن دہشت گردی، غربت و افلاس اور مجبوری و حبس کی فضا سے نکل کر اُن سنہرے خوابوں کی تعبیر بنے گا جو اُس کے بنانے والوں نے دیکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے لفظ لفظ میں وطن کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنے گم شدہ چہرے اور اپنی شناخت کی تلاش میں بہت جذباتی انداز میں وطن کو تحریروں میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کے تخلیقی تجربات میں یہاں کے فن کاروں جیسی جذباتی شدت اور ارفعیت موجود ہے۔

موجودہ صورتِ حال میں ان کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پاکستان کے صحیح امیج کو اُجاگر کریں۔ وہ جہاں جہاں مقیم ہیں وہ اپنے لفظوں اور حرف حرف حقیقت سے یہ یقین دلائیں کہ پاکستان ایک پرامن ملک ہے۔ اُس میں بستے لوگ تو اُس مذہب کے ماننے والے ہیں جو سلامتی کا پیغام دیتا ہے۔ وہ تو اُن پر ایمان رکھنے والے ہیں جو کانٹے بکھیرنے والوں کے کانٹے بھی پلکوں سے چُن لیتے تھے۔ وہ یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ پاکستانی انتہائی ذہین، باصلاحیت، پرامن، محبت کرنے والی جمہوریت پسند قوم ہے۔ منفی پروپیگنڈے نے اس کا چہرہ مسخ کردیا ہے۔ اُنہیں چاہیئے کہ وہ صوفیاء کرام کی فکر اور آفاقی پیغام کو وہاں کی زبانوں میں عام کریں۔ اس یقین کے ساتھ کہ مشرق تو اُجالا پھیلاتا ہے اور ہم بابا مسعود الدین گنج شکر،

بابا جی بلھے شاہ، حضرت چَل سرمست، رحمان بابا، حضرت مست توکلی اور حضرت خواجہ غلام فرید کی علمی اور جذباتی وراثت کے امین ہیں۔ اگر وہ اِس سوچ کو سنجیدہ مقصد کے طور پر اپنی تخلیقات میں پیش کریں تو اُن کے دل کا گداز اِس یقین کو پھیلائے گا کہ پاکستانی قوم کا ہر فرد اُس کے فن کار کی طرح محبت، امن، سچ اور ابدیت کا استعارہ ہے۔

خالد اقبال یاسر (اسلام آباد)

سوال کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ پاکستانی کمیونٹی اس وقت ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا ہر کہیں موجود ہے۔ اس کا ارتکاز مشرق وسطیٰ خاص طور پر خلیجی ممالک، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور ریاست ہائے متحدہ میں زیادہ ہے۔ اس کمیونٹی میں شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس اور نقاد بھی اسی نسبت سے موجود ہیں جس نسبت سے پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جن زبانوں میں لکھتے ہیں ان کی اصل سرزمین پاکستان ہے۔ بھارت میں اردو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ انگریزی میں لکھنے والوں کے لیے پاکستان ترجیح نہیں ہے مگر وہ اپنے، اپنے فن کے اعتراف کے لیے گاہے اس طرف بھی نگاہ کر لیتے ہیں۔

ان پاکستانیوں میں سے بہت کم اہل قلم ایسے ہیں جنہیں یہاں بھی اعتبار حاصل ہے اور وہ اہلِ قلم ایسے ہیں جنہوں نے خود یہاں سے ہجرت کی ہے۔ وہ پہلی بار ہجرت کرنے والوں کی اولاد نہیں ہیں۔ ایسے لکھنے والے ادیب جانے سے پہلے بھی پاکستان کے اہم لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے مگر ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور یہ تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے کہ ان میں سے زیادہ تر ارزل عمر میں ہیں اور اپنی فعالیت کھو چکے ہیں۔ انگریزی میں نئے لکھنے والوں کی نسل البتہ سامنے آ رہی ہے مگر انہیں اردو یا کسی اور دیسی

زبان پر قدرت ہی حاصل نہیں ہے۔

اردو کے قدرے سینئر مگر قدرے کمزور لکھنے والوں نے پہلے پہل اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کی جانب سے ثقافتی سرگرمیوں کے لیے مختص رقوم سے استفادہ کرنے کے لیے مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں مذاکرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان تقریبات سے ان معاشروں میں شعروادب کا غلغلہ تھا اور ان سے انفرادی طور پر کچھ پاکستانی خاندانوں کی حیثیت اجنبی معاشرے میں مستحکم ہوئی، اس حد تک ان سرگرمیوں کو مثبت کہا جا سکتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یوں ہوا کہ ادبی تقریبات کے منتظمین نے یہ سلسلہ اپنی ذاتی آمدنی میں اضافے کے لیے، پاکستانی اخباروں کے کالموں میں اپنے ذکر سے پاکستان میں خبروں میں رہنے کے لیے اور سال میں ایک آدھ بار پاکستان آنے پر انہی شہروں میں پذیرائی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں یہاں کے منچلوں نے بھی ان کی بہت آؤ بھگت کی مگر ان کے زیرِ انتظام مشاعروں کے پاکستانی شعرا کی فہرست میں دو تین دہائیوں تک کوئی تبدیلی نہ آئی تو یہاں کے میزبانوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ چند مخصوص پاکستانی شعرا اور دانشوروں نے بیرون ملک ان تقریبات میں شرکت پر اپنے آپ کو پاکستان کے اہم ترین شعراء گردانا شروع کر دیا۔ ان میں سے کچھ نے بیرون ملک شعرا اور شاعرات کے لیے اپنی زود گوئی میں سے خمس نکالنا بھی واجب سمجھا اور اس نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی چنانچہ اس وقت پاکستان کے اندر اور باہر کئی ایسے Ghost Writers موجود ہیں جو شعرا اور شاعرات کے لیے غزلیں، نظمیں لکھنے اور کتابوں کی خوبصورت گردپوشوں کے ساتھ طباعت کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں او راس آمدنی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک مثبت تجارتی سرگرمی ہے۔ اس کاروبار سے غیر ملکی زرمبادلہ پاکستان آ رہا ہے۔

کچھ ملکوں میں خاص طور پر کینیڈا، برطانیہ اور امریکہ میں اُردو کے بے شمار ہفت

روزہ نکلتے ہیں۔ یہ اخبار بھی اردو ادب کو کسی نہ کسی حد تک ان معاشروں میں زندہ رکھے ہوئے ہیں اور ان سے وابستہ اخبار نویسوں کی روزی، روٹی کا ذریعہ بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اخبارات اور رسائل یہیں پاکستان میں مرتب ہوتے ہیں۔ ان ملکوں کے بعض مخیر حضرات نے مل کر بہت سے ادبی انعامات کا اجراء بھی کر رکھا ہے جن کی مالیت خاصی ہوتی ہے اور سال میں ایک آدھ بار کچھ ادیبوں کو ایسے ملک یا ملکوں کے دوسروں کے خرچ پر دورے کا موقع بھی مل جاتا ہے مگر اب ایسے انعامات کا سلسلہ بھی ختم ہونے کو ہے۔ ان انعامات کی توقیر بھی رفتہ رفتہ گھٹتی چلی گئی ہے کیوں کہ ان کے منصفین بھی ایک خاص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں بھی کئی دہائیوں میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ کچھ مخیر حضرات البتہ مستحق یا غیر مستحق ادیبوں کی در پردہ مالی امداد بھی کرتے رہے ہیں۔ خبر نہیں وہ کب تک جاری رہتی ہے یعنی یہ معاملہ مثبت منفی کے درمیان کہیں لٹکا ہوا ہے۔

سوال۔ کیا ان تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب۔ وطن کی خوشبو صرف ان شعرا اور افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جاتی ہے جو پہلی بار وطن سے بے وطن ہوئے۔ اگلی نسل کے لکھنے والوں میں ایک حد تک اپنی مٹی سے محبت ملتی ہے اگر ان کے ماں باپ نے پاکستان سے ان کا تعلق قائم کرنے کی کوئی حقیقی کوشش کر رکھی ہو ورنہ رفتہ رفتہ اپنی خاک کی بو باس ان کی زندگیوں اور ان کی تحریروں سے معدوم ہوتی جائے گی۔

سوال ۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ میں نے کہا تا کہ بیرون ملک ادیبوں میں اعتبار کے حامل ادیبوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور اب اور بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ ادب اب کسی بھی معاشرے میں اتنا اہم نہیں رہا البتہ یوں ہے کہ جو بیرون ملک شعرا یا شاعرات یہاں کے کسی اچھے شاعر کے ساتھ شاعری سے لے کر کتاب کی اشاعت کا ٹھیکہ کر لیتے ہیں ان کی تخلیقات

ٹھیکہ حاصل کرنے والے شاعر کی شاعری کے کم از کم معیار پر پورا اترتی ہے۔ باقی اپنے طور پر لکھنے والے اگر چھپنے سے پہلے کسی معتبر شاعر کو اپنا مجموعہ دکھالیں تو بھی کتاب بہتر ہو جاتی ہے۔ شاعری کا ذکر یوں زیادہ ہے کہ مشاعرے بھی زیادہ ہوتے ہیں اور شاعری بھی اسی لیے زیادہ ہوتی ہے کہ یہ آمدنی اور سیر وسیاحت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ نثری کتب کی تعداد نا قابل ذکر ہے بلکہ بعض فکشن اور تنقید لکھنے والے بھی مشہوری کی حسرت کرتے کرتے خود شعر کہنے یا دوسروں سے کہلوا کر مشاعرے پڑھنے پر اتر آتے ہیں کہ اس سے نام کا ذکر اذکار چلتا رہتا ہے۔ کچھ شاعروں نے سستی شہرت کے حصول کے لیے سہل نگاری سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ بعض مشاعرہ باز شعرا ایک ہی غزل یا نظم ہزاروں بار پڑھ چکے ہیں کہ ان کا باقی کلام یا تو اتنا اچھا ہے کہ سننے والوں کے سر پر سے گزر جائے یا اتنا برا کہ پڑھنے کے قابل نہیں۔ ایک آدھ شاعر نے ادب کو جنس بازاری کر دیا ہے اور غزل کے ساتھ بدکاری پر اتر آیا ہے اور اس وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک یکساں مقبول ہے۔ ایسے شاعر بیرون ملک شاعروں کو بھی اپنی شاعری کی مبتذل سطح پر لانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ بیرون ملک ادیبوں کی تخلیقات کے بارے میں اطمینان سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم کب تک بیرون ملک ادیبوں کو بیرون ملک ادیب کہتے رہیں گے۔ جواب دراصل ایک اور معاشرے کا حصہ ہیں، اسی ملک کے شہری ہیں انہیں وہیں دفن ہونا ہے اور ان کی آئندہ نسلوں نے وہیں پروان چڑھ کر فنا کے گھاٹ اترنا ہے۔ ہمیں ان کے تخلیقی یا غیر تخلیقی کاموں سے اطمینان یا عدم اطمینان کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں۔ کیا وہ ہمیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق دینے پر تیار ہیں؟ کہیں ''تو کون میں خواہ مخواہ'' کی صورت حال تو درپیش نہیں۔ اِکا دُکا یہاں وہاں ان کے پاکستان میں اپنے رابطوں کو ہمہ گیر اور مستقل نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سلسلہ بھی اب ایک آدھ دہائی سے زیادہ چلنے والا نہیں ہے۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب۔ پہلے تو ہمیں اپنی اپنی زبانوں کی فکر کرنی چاہیے۔ بیرون ملک رہنے والوں نے اپنی آئندہ نسلوں کا بندوبست کر کے ان کی راہیں متعین کر دی ہیں تاہم انہیں اول تو خود اپنی املا، اپنا روزمرہ، اپنا محاورہ اپنی ضرب الامثال درست کروانی چاہئیں۔ کیسی کیسی بھیانک غلطیاں آئے روز آپ کی اور میری نظر سے گزرتی ہیں اور بات سمجھ میں آ گئی ناں کی تحریک اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ اجتماعی زوال کے ساتھ انفرادی زوال کا یہ سفر کہیں رُکنے میں نہیں آیا۔ معیار بندی کی منزل حاصل کرنے سے پہلے ہم معیار شکنی کا حصہ بن چکے ہیں۔ مجھے ذرا ٹی وی چینلوں، روزانہ اخباروں کو روک کر تو دکھائیں جو کچھ وہ زبان وادب کے ساتھ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے غلط العوام اور غلط العام سے ہماری لغات صرف اور نحو کی واٹ لگ چکی ہے۔ مزید تو آپ یوں کہہ رہے ہیں جیسے پہلے تو انہوں نے شاہکار تخلیق کر رکھے ہیں۔ اب تو سب سے پہلے زبان و بیان کو سنبھالیں اور اگر سنبھال سکیں پھر آگے کی سوچیں۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی (لاہور)

پاکستان سے دور دیارِ غیر میں ہمارے قلم کاروں کی معقول تعداد اپنی ادبی دنیا آباد کیے بیٹھی ہے۔ ان کی خود اختیاری نقل مکانی کا بڑا سبب شکمی احتیاج، معیار زندگی کی طلب اور معاشی ناآسودگی سے گلوخلاصی حاصل کرنا ہے۔ دوسرا سبب پاکستان میں فوجی طالع آزماؤں کے جبر و تشدد سے چھٹکارہ پانے کی کوشش اور عہد بے تعبیر میں غریب الوطنی کا ذائقہ چکھنے کا خیال تھا، جو لوگ دوسرے ملکوں میں گئے انہیں اپنے پیارے وطن پاکستان کی یاد خون کے آنسو رُلاتی ہے مگر انہیں پاکستان میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ ان کا واہمہ ہے۔ ان قلم کاروں نے جو مارشل لاء کے زمانے میں ملک چھوڑ کر

دوسرے ملکوں میں آباد ہو گئے اپنے تلخ تجربوں کو صفحۂ قرطاس پر پھیلایا خصوصاً شعرا نے دل کے پھپھولے پھوڑے، اپنے وطن کے گلی کوچوں کو یاد کیا، دوستوں کے درمیان گزرے زمانوں کا مرقع کھینچا۔ اہلِ وطن کی کم نصیبی اور بساطِ جمہوریت لپیٹنے والوں کی بدبختی کو بے نقاب کیا مثلاً برمنگھم میں مقیم عاشور کاظمی نے کہا۔

ہم نے آنکھیں کھولنے میں کس قدر تاخیر کی
گھر کے دربانوں نے سارے گھر پہ قبضہ کر لیا

بے وطن ہو کر اہلِ قلم پر کیا بیتی اور انہوں نے کس طرح دیارِ غیر میں رہ کر ان حقائق کو بے نقاب کیا جنہیں شاید وہ یہاں رہتے ہوئے بیان نہ کر سکے ہوتے، وہ حقائق دنیا کے آزاد ملکوں میں کسی قدغن کے بغیر نہ صرف سامنے لائے جاتے ہیں بلکہ ان پر بے لاگ تبصرہ بھی ہوتا ہے۔

ہمارے بیشتر ادیب دوسرے ملکوں میں مستقل سکونت اختیار کر چکے ہیں مگر وہ سال دو سال بعد پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے مالی وسائل میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے وہ پاکستان سے شعرا کو اپنی تقریبات میں مدعو کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، ان میں خصوصیت کے ساتھ ایسے شاعروں کو ترجیح دی جاتی ہے جو پاکستان میں ان کے ادبی کارناموں کی تشہیر کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، ادبی جریدوں اور روزناموں میں ان کی تصاویر کی اشاعت اور مشاعرے کی روداد چھاپنے کی روایت پر قائم رہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہوں البتہ پی۔ آر شپ کے حوالے سے ان کے نام سرفہرست آتے ہیں۔

پاکستان سے کچھ اہلِ قلم دوسرے ملکوں میں گھوم پھر کر اپنے وطن واپس آ گئے، وہ کچھ عرصہ قیام کر کے اس لئے واپس آ گئے کہ وہاں رہتے ہوئے پیسہ ضرور کمایا لیکن اپنی شناخت کھو جانے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے واپس آنا پسند کیا، ان کا فیصلہ

درست نکلا ورنہ ان کی مثال ایسے درخت کی سی تھی جو اپنی جڑوں سے اکھڑ کر دوسری جگہ بارور نہ ہوتا، ایسے قلم کاروں نے پردیس میں جتنا تخلیقی کام کیا انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ صرف پیٹ کی خاطر آوارہ و سرگرداں رہے، ان کی نقل مکانی کے پیچھے کوئی بڑا مقصد نہ تھا بلکہ

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

مغربی ممالک میں اردو زبان و ادب کو متعارف کروانے میں جہاں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا کردار نظر آتا ہے وہاں ایشیائی ممالک میں مغربی اقوام کی دلچسپی کے نتیجے میں اردو کو رابطے کی زبان خیال کرتے ہوئے وہاں کی یونیورسٹیوں میں (Oriental Studies) پر زور دیا جاتا ہے۔ طلبا اور طالبات اردو زبان و ادب میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں، اسی طرح چین اور جاپان میں اردو پڑھنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے، پاکستان سے بہت سے اساتذہ اور شعبۂ اردو سے وابستہ افراد ان ملکوں میں گئے اور وہاں برس ہا برس قیام کیا، اپنی زبان سکھائی اور ان کی زبان سیکھی اور یوں اردو شاعری کے تراجم ہوئے، اسی طرح دوسری زبانوں کی شاعری اور نثر کو اردو میں منتقل کرنے کی فضا قائم ہوئی۔

خورشید بیگ میلسوی (میلسی)

''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے مقصد'' ان دو اصطلاحوں کے معنی میری سمجھ میں اس وقت کھل کر آئے جب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی صاحب کا ایک سوالنامہ مجھ تک پہنچا۔ جس میں بیرون ملک مقیم ''پاکستانی'' شاعر و ادیب کے بارے میں اہل قلم اور صائب الرائے سے استفسار کیا گیا ہے۔ ان سوالوں کو بغور پڑھنے کے بعد میں نے ڈاکٹر شبیہ الحسن

کی اپنے وطن سے بے کراں محبت کو محسوس کیا۔ کہ وہ صرف بیرون ملک اہلِ قلم سے اظہار محبت نہیں کر رہے ہیں...... ڈاکٹر صاحب نے ادب اور اردو زبان کے لئے جس قدر کام کیا ہے۔ وہ اظہر المن الشمس ہے۔ وہ نقد ونظر کے حوالے سے ہر بار ایک نئے عنوان اور ایک نئے انداز سے کتاب لکھ رہے ہیں۔ یہ خدمتِ علم وادب دنیائے ادب کو ان کی عظمت کے اعتراف پر مجبور کر رہی ہے۔ بلاشبہ وہ ''محسن اردو'' کے خطاب سے سرفراز ہونے کے اہل ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی خدمات کو اجرِ عظیم سے نوازے۔

مذکورہ بالا سوالنامہ دراصل ان کی آنے والی نئی تصنیف ''اردو شعر وادب کے سفیر'' کے بارے میں اہل قلم سے رائے طلب کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ میں نے ان سوالات کا تفصیل سے جواب لکھنے کی سعی کی ہے۔

سوال ۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر وادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب ۔ شعر وادب سے مراد یقیناً اردو ادب ہے۔ اردو زبان اس حوالے سے بے حد خوش بخت ہے کہ اس کا آشنا اس کے ارتقاء اور ترویج کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سچائی اپنی طرف ہر شے کو کھینچنے کی طاقت رکھتی ہے اسی طرح اردو زبان اپنے منفرد ذائقے سے آشنا ہر شخص کو طلسمِ فن میں اسیر رکھتی ہے۔ بیرون ملک چلے جائیے آپ کو اُردو کے قدردان ملیں گے۔ جو کاروبار کچھ بھی کر رہے ہوں مگر فکر و فن کے سرمائے میں اضافے کے لئے مغرب ومشرق میں موجود اردو ادب کی تنظیموں کی سرپرستی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر جن لوگوں نے بیرون ملک رہ کر اُردو کا نام زندہ رکھا ہے۔ یہ ان کا بلاشبہ مثبت کردار ہے کہ بیرون ملک رہ کر ''اردو زبان'' کا نام زندہ ہے۔ جس میں مرکزی کردار ان ادیب حضرات کا ہے جو ''سفرنامے'' لکھ رہے ہیں شعری مجموعے لا رہے ہیں اور ''ادبی مجلّے'' نکال رہے ہیں۔ امریکہ سے دوبئی تک محفل مشاعرہ ترویج

ادب کے لئے اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اہل فن اور اہل کمال وطن کی اور اپنی زبان کی محبت سے معمور، اردو زبان کی ترویج و ترقی کے بیرون ملک رہ کر اُردو کو "بین الاقوامی" زبان بنانے کے لئے خلوص نیت کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنوز بین الاقوامی زبان کا اعزاز انگریزی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے اہل قلم کی کاوشوں سے اردو زبان کا رواج بیرونی دنیا میں پروان چڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ جو مستقبل میں بے حد اہم اور روشن امکانات کا حامل ہے۔

بیرون ملک پاکستانی ادیب نے نثر کو اپنایا تو سفرنامہ تخلیق پایا۔ اردو ادب کے شاہکار سفرنامے ان فنی وفکری ماخذات کی نشاندہی کرتے ہیں جو اردو زبان کے ارتقا سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان ادیبوں میں ابن انشاء کا نام نمایاں ترین ہے۔ دراصل ترویج کا ایک مفہوم تو سرسری سا ہے کہ اردو شاعری اور دیگر اصناف نظم ونثر میں طبع آزمائی کی جائے۔ محافل نقد ونظر برپا کی جائیں۔ سلام ومنقبت پر مشتمل مسالموں اور مشاعروں کا اہتمام کیا جائے۔ یا نعت وسیرت کی بزم میں سجائی جائیں۔ اردو زبان کے مشاعرے ہوں یا سیمینار۔ یہ شاعری کے انفرادی رنگوں سے آگے کی بات ہے۔ جس سے اُردو کا ظہور دیگر ممالک میں یقیناً ہوگا۔ اس طرح انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں کے حامل افراد اردو کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے جن زبانوں کے حامل افراد کا ذکر کیا ہے وہ اردو زبان میں دلچسپی لے رہے ہیں یہی زبان کی ارتقاء کا بہتر عمل ہے۔ اقوام عالم اب ہماری زبان کی طرف اپنی توجہ مبذول کر رہی ہیں۔ اور یہ سہرا یقیناً۔ ان پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے سر ہے جو بیرون ملک اپنی ریاضت فن سے اردو کو ترویج دینے میں مگن ہیں۔
بیرون ملک مقیم پاکستانی عصری ادب کے نابغہ روزگار ادیبوں کے فن پاروں کا دیگر زبانوں میں تراجم بھی کرتے ہیں اور وہاں کے ادب کا اُردو میں ترجمہ کر کے شعروادب کی آفاقی سطح پر ترویج کا کام بھی کر رہے ہیں جو مثبت بھی ہے اور مستحسن بھی……

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب ۔ اگر ان کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں جو منظر نامے موجود ہیں ان کے اندر ایک ثقافتی اور تمدنی رنگ ضرور موجود ہے چین کا سفر نامہ اشرف ندیم نے لکھا ہے جس کا عنوان ''محبتوں کے درمیان'' ہے اسے ہم ایک مثال کے طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس ادیب کا قیام سفر نامہ نگار کے طور پر زیادہ سے زیادہ ایک سال پر محیط ہوگا۔ لیکن اس عرصے کے دوران جہاں ادب کی آفاقی قدروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جناب اشرف ندیم نے چین کی تہذیب وتمدن کا ذکر ہے وہاں اپنے ماحول کو بھی اُجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح یہ سفر نامہ ایک وطن دوست پاکستانی کی تحریر ہے۔ میں سمجھتا ہوں غزل، نظم، افسانہ، ناول میں ماحول۔ فضا اور کردار ان ممالک سے لئے جا سکتے ہیں انداز فن میں وہاں کا کلچر آمیز ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سب آورد کی کرامات ہے جو محض فنی شاخ تراشی ہے جو صرف مصائب کو چھپانے کے لئے ہے۔ جب بھی آمد جلوہ گر ہوگی تو یورپ کے گلاب کا لاہور کے گلاب سے موازنہ ضرور نظر آئے گا۔ اور آپ غیر ملکی ادبی مجلوں، ادبی مذاکروں اور بیرون ملک مقیم شعرائے کرام اور شاعرات کا کلام پڑھ کر دیکھ لیں۔ اس میں ایک کسک ضرور محسوس ہوگی۔ جو وطن کی مٹی کی خوشبو کی جستجو کے لئے شاعر یا اہل فن کے ہاں پائی جاتی ہے۔ بلکہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ شاعر کی غزل میں چند شعر ایسے ضرور ہوتے ہیں جو وطن کی محبت سے لبریز ہوتے ہیں۔ مرحوم فیض احمد فیض کی مثال ہمارے سامنے ہے انہیں کا ذکر نہیں آج بھی درجنوں اہل قلم اپنے اپنے انداز میں خدمت شعر و ادب کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اور ان کے شعر و ادب میں جگہ جگہ اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ وطن ہمارے ادباء اور شعراء کے لئے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ ہوں یا ان کے بعد فیض احمد فیض یہ اردو ادب کا اثاثہ ہیں۔ فیض جن کی شناخت پاکستانی رہی۔ اسی طرح عہد حاضر میں اد کی دنیا میں بہت نام ایسے ہیں جن کی شاعری میں ا حرو

استبداد کے خلاف آواز کے ساتھ ساتھ وطن پرستی کی خوشبو بھی یکساں محسوس ہوتی ہے۔ یہ وصف ایک دو کا نہیں بلکہ پاکستانیوں کا مشترکہ وصف ہے کہ وہ اپنے رشحاتِ قلم کو اس مٹی کی خوشبو سے آمیز کر رہے ہیں۔

سوال ۔ بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماحول اور تمدن کا اثر ہر شخص کی طرح ایک فنکار پر بھی ہوتا ہے۔ ہماری تہذیب سے جہاں بھی کوئی Contrast اہلِ فکر و نظر کو دکھائی دیا۔ اس کا انہوں نے بے لاگ اظہار کیا۔ جدیدیت سے متاثر ہونا اس شاعری کا خاصہ ہے۔ جس کی بنا پر تجربے سے زیادہ تائید کا پہلو اس شاعری میں واضح ہوتا ہے۔ یہ تائید خفی بھی اور جلی بھی۔ یعنی ہئیت اور مضمون۔ لفظیات کا تجربہ البتہ تائید سے ذرا الگ ہے۔ "چاند" لندن کا ہو یا فرانس کا چاند ہی رہتا ہے۔ ذرا اُجلا ہوتا ہے کہ وہاں آلودگی کم ہے۔ اور یہاں ہمارے ملک میں آلودگی کے فضائی قبضے کی بنا پر یہ شاید کم خوبصورت، یا تھوڑا سا کم روشن نظر آتا ہو۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی کمان/قوس ہو یا اس کا دائرہ ہی جمال یہ یہاں بھی اپنے جوبن پر ہے اور وہاں بھی اپنے جوبن پر...... میں سمجھتا ہوں کہ بیک جنبشِ قلم ہم بیرونِ ملک پاکستانیوں کے بارے میں یا اُن کی تحاریر کے بارے میں حتمی رائے نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس سے پہلے ایسا کوئی عمل ظہور میں نہیں آیا جس سے ان کی کاوشوں کا مجموعی طور پر اندازہ لگایا جا سکے...... ابھی تک ڈاکٹر شبیہ الحسن نے (اور شاید اکا دکا دیگر نقادانِ فن) نے اس جانب توجہ دی ہے کہ ان ادبا اور شعرائے کرام کی تخلیقات کو اکٹھا کر کے لایا جائے۔ اور پھر ناقدینِ فن اور قاری اپنی رائے قائم کر سکیں کہ آیا ان تخلیقات کا معیار فنی یا فکری یا ان کے اسلوب میں کیا ندرت ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ "چکی" کی مشقت کے عمل سے گزرنے والے ان تخلیق کاروں نے بہر طور اردو ادب سے وفا کی ہے۔

سوال کیا آپ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن

ہیں؟

جواب ۔ میرے خیال میں منزل اطمینان شاید بلھے شاہ کی ''انحد'' ہے۔ اسلئے میں نہیں سمجھتا کہ ہم کسی بھی ادب کو ۱۰۰ فیصد اطمینان بخش قرار دے ڈالیں۔ اس کی وجہ اظہر من الشمس ہے کہ اس جانب ہماری بہت کم توجہ رہی ہے۔ اردو زبان سے محبت کرنے والوں نے بیرون ملک ہمارے فن شہ پاروں کی قدر وقیمت بڑھائی ہے۔ یہاں کے شعرائے کرام کے خوبصورت اور دلکش ایڈیشنوں کی اشاعت اور ان ممالک میں کتابوں کی ریکارڈ فروخت بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی تخلیقی کام سے گہری محبت کی آئینہ دار ہے۔ مگر ہماری لائبریروں میں امریکہ، کینڈا اور عرب ممالک سے لے کر ساؤتھ افریقہ میں مقیم اہل فن کے کام کی بہت کم پذیرائی ہوئی ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ بیرون ملک میں بیٹھ کر زرِ مبادلہ بھیج کر اپنے وطن کی معیشت کو بچانے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی تخلیقی خدمت کرنا از خود ایسا کام ہے۔ جسے دیکھ کر ہمیں اطمینان کی فضا کی قربت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ ہر تخلیق کار دامن اردو کو وسعت دے رہا ہے۔ اس کی حدود میں اضافہ کر رہا ہے جس میں زبان وبیان کی خوبیوں کے ساتھ جدت بھی طلوع ہوتی رہتی ہے۔

سوال ۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب۔ اس سلسلے میں میری رائے ہے کہ ایک تو تخلیق کار اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔ کیونکہ وہاں خاندان کی صورت میں لوگ مقیم ہیں اس لئے ان کی کوشش ہونی چاہیے کہ ان کی نسل اور آئندہ نوجوان نسل تخلیقی زاویوں میں پاکستانی ادب کا ضرور مطالعہ کرے اور اس طرح سلسلہ در سلسلہ تخلیقی زنجیر اردو کو محکم مقام دے گی۔ علمی وادبی مجلسوں کا وہاں سے زیادہ سے زیادہ اجرا کیا جائے۔ اور مختلف ممالک میں ایک دوسرے کو بھیجا جائے۔ جبکہ ہمارے ملک میں مقیم نابغہ روزگار تخلیق کاروں کی تخلیقات کو بھی ان میں شامل اشاعت کیا جائے۔ سیمینار اور مذاکرے منعقد کرائے جائیں۔ دیگر زبانوں کے اردو خواں افراد کو

دعوت دی جائے۔ ادب کو آفاقی رنگ دیا جائے۔ تاکہ اردو کی ترویج زیادہ آسان ہو۔ مشاعرے، مباحثے، مقالے، ڈرامے، بیت بازی، افسانہ نویسی کے حوالے سے وہاں کی درسگاہوں اور دانشوروں تک رسائی حاصل کی جائے۔ انہیں دعوت دی جائے۔ وہاں کے دانشوروں سے رابطہ کیا جائے۔ ریڈیو، اخبارات ٹیلی ویژن کے ذریعے اردو زبان وادب کی رسائی کے مواقع حاصل کیے جائیں۔ خواتین ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ زیر تعلیم تحقیق کاروں (طلبہ و طالبات) کو اشاعتی اداروں کے ذریعے متعارف کرایا جائے۔ لائبریریوں کے قیام پر اس مقام پر ہو جہاں ایک دو تخلیق کار موجود ہوں اور اردو جاننے والے موجود ہوں تاجر، اور سرمایہ کار حضرات سے رابطے کر کے اردو کی کتب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور ترسیل ممکن بنائی جائے۔ ماہانہ، سہ ماہی یا سالانہ ادبی جریدے جاری کرائے جائیں۔ جس میں تنقید، تحقیق اور تخلیق سب شامل ہوں۔ اردو ادب میں پاکستانی ہیروز قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ اور تحریک پاکستان کے حوالہ جات خوب سے خوب تر انداز میں پیش کیے جائیں...... یہ وہ سب سے بڑا فریضہ ہے جو اردو تخلیق کاروں کے ذریعے ادا ہو کر ہماری نظریاتی شناخت کو مستحکم اور ارفع مقام دلا سکے گا۔ (انشاءاللہ)

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی (کراچی)

لندن یونیورسٹی، برمنگھم، اسکاٹ لینڈ میں ادبی پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ کئی برس سے میں لندن یونیورسٹی کی اردو کانفرنس میں شریک ہو رہا ہوں۔ ۲۰۰۹ء میں لندن یونیورسٹی کی "میر انیس اور اردو مرثیہ" کانفرنس میں شریک ہوا، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز بھی شریک ہوئے اور ماسکو یونیورسٹی کی اردو پروفیسر لڈ ملا بھی موجود تھیں۔

بعض نشستوں میں غزلیں، نظمیں اور افسانے و تحقیقی مقالے سننے کا اتفاق ہوا۔ ایک دو نشستوں میں میری صدارتی تقریر بھی ہوئی۔ سب حضرات و خواتین مل کر اردو کی

ترویج کے لیے کام کر رہے ہیں۔ مجھے تو بہت مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اردو کے لیے کام ہو رہا ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک یونان اور جرمنی میں بھی اردو اخبارات ورسالے شائع ہوتے ہیں اور ادبی پروگرام ہوتے ہیں جن میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ فرینکفرٹ (جرمنی) میں اقبال صاحب اردو کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔ ایتھنز (یونان) میں عشیر رضوی نے میری تقاریر کا اہتمام کیا تھا وہاں بھی اردو کے پروگرام ریڈیو اور ٹی وی پر ہوتے ہیں جن میں شرکت کا موقع ملا۔ امریکہ میں شکاگو، نیوجرسی، نیویارک، جارجیا اور واشنگٹن میں متعدد مرتبہ ادبی پروگرام میں شریک ہوا اور وہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ اخبارات ورسالے بھی شائع ہو رہے ہیں امید ہے اردو کی ترویج کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ڈاکٹر نفیس اقبال (لاہور)

وطن کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس محبت کا اظہار بیشتر بیرونِ ملک مقیم ادبا وشعرا کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ وطن سے دور وطن کی یاد کے تخلیقی رویے کا اظہار وطن دوست شعرا کی کتابوں کے نام سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے اشفاق حسین کی کتاب ''ہم اجنبی ہیں''۔ اُن کی حساسیت اُنھیں اپنے وطن کی کربناکی کو بھی بیان کرنے پر مجبور کرتی ہے جیسے وہ اپنی نظم ''شہر آباد کا نوحہ'' میں علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسی کتاب کے ذیلی عنوانات ''ہجرت کا ثمر''، ''نثار میں تیری گلیوں پہ'' وطن کی محبت کو اجاگر کرنے میں معاون ہیں۔

بیرونِ ملک رہنے والے شعر وادب کے سفیروں نے اپنی فکری وروحانی میراث سے اپنا رشتہ نہیں توڑا بلکہ اپنی گمشدہ مابعد الطبیعیاتی روایت کو اپنی تخلیقات میں زندہ کیا ہے۔ وطن کے حالات پر پردیس میں رہ کر بے چینی کا اظہار کیا ہے بلکہ بیرونِ ملک عملی جدوجہد بھی

کی ہے۔ اُردو کی مختلف اصناف پر کام کرتے ہوئے بیرونِ ملک ادیبوں نے تنقید کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ عبدالستار مسلم نے "میرا تنقیدی سفر" میں تنقیدی تنوع سے کام لیا ہے۔ اُن کے تنقیدی نظریات کی بنیاد مابعدالطبیعیاتی دینی وفکری عناصر اور عصرِ حاضر کے مسائل کے تجزیے پر استوار ہے۔

وسیع تناظر رکھنے والی شاعرہ عرفانہ عزیز نے اپنی انفرادیت قائم کرتے ہوئے نئے امکانات کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے کلاسیکی قدروں کی قدر کرتے ہوئے جدید رویوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ حب الوطنی پر مبنی نظمیں بھی لکھی ہیں جیسے "میرے محبوب وطن"، "ہجرت کا ثمر"، "اے نگارِ وطن" وغیرہ۔ موضوعات کی رنگارنگی اور فارسی تراکیب کا استعمال اُن کی تحریروں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔

تہذیبی سیاق وسباق سے آگہی رکھنے والے محمد ممتاز راشد نے وطن کی ہر چیز سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ نسیم سید کی شاعری صرف ذاتی کرب کا اظہار نہیں بلکہ معاشرتی ناہمواریوں کو بھی بیان کرتی ہے۔ اقبال حیدر مرثیہ نگاری کرتے ہیں۔ نذیر۔ اے قمر ماہیے لکھتے ہیں جن میں معنی کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ تسنیم عابدی ہمارے مردانہ معاشرے کے خلاف علم بلند کرتی ہیں۔

ہر تہذیب بقول ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے اسالیب خود دریافت کرتی ہے جن کے ذریعے وہ اپنی روح کا اظہار کرتی ہے۔ ایلیٹ کے بقول "ادب اور مذہب کو الگ الگ خانوں میں رکھنا غیر عقلی ہے۔ مذہبی امتزاج کے بغیر ادب غیر ذمہ دار اور غیر اخلاقی ہو جاتا ہے۔" سید وصی الحسن نقاش نے جالبی صاحب اور ایلیٹ دونوں کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے مذہبی معتقدات کو ارفع رنگ دینے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے سلام نگاری کی ہے۔ وہ مذہب کی مابعدالطبیعیاتی قدروں سے آگاہی بھی رکھتے ہیں اور جدید طرز کی سلام نگاری بھی کرتے ہیں۔ اُن کے سلاموں میں عقیدہ پیغام بن جاتا ہے جو آفاقی

قدروں کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے وہ جدت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اجداد کی وراثت کے امین بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مذکورہ باتوں سے یہ تو ظاہر ہے کہ بیرونِ ملک مقیم ادبا و شعرا نے حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے شعروادب کی ترویج میں بڑا مثبت کردار ادا کیا ہے مگر ہمارے سامنے ہجرت کی بڑی بامعنی تاریخ ہے چونکہ ہجرت علم و تجربہ میں وسعت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ وسیع النظری کا سبب بھی بنتی ہے اور چیزوں کو نئے معانی اور مفہوم سے آشنا کرنا بھی اُس کا کام ہے، اس لیے ہم بیرونِ ملک ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ توقعات رکھتے ہیں انہیں اپنے تخلیقی عمل میں سماجی وتہذیبی شعور سے زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے۔ وہ ادب کی آگ کو بامعنی طریقے سے روشناس کرتے ہوئے پاکستان کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ پاکستان کے دشمنوں نے پاکستان کے چہرے کو اپنی چالاکی سے مسخ کر دیا ہے۔ وہ پاکستانی تہذیب و ورثے کو اپنی قوتِ متخیلہ کے ذریعے متشکل کر کے پیش کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کے مسائل کا ادراک کرتے ہوئے ادب کے ذریعے اُن کے اظہار کی سماجی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔

ہمارے معاشرے کے مربوط رشتے منتشر ہوتے جا رہے ہیں۔ مادی ترقی کے حصول میں ہماری نئی نسل کے اعصاب جواب دینے لگیں تو وہ مختلف نشوں سے اعصاب کو آسودہ کرنے لگتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو اس بیمار نسل کی بیمار روحوں کو تندرست رکھنے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ تہذیبی مسائل اُجاگر کر کے نئی نسل کو تاریخی شعور دینا ہوگا۔ نئی نسل کے ذہنوں سے تاریخ کو مٹانے کی کوششوں کا راستہ روکنا ہوگا۔ اُن کے جسم و روح کے فراق کو ختم کر کے اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار سے بے اعتنائی کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

ادب کا کام غموں میں توازن پیدا کرنا ہوتا ہے اس لیے بیرون ملک رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایک مضبوط نظامِ خیال وضع کر کے مابعد الطبیعیاتی بنیادوں کو مضبوط

بنانا اور تہذیب نفس کے اصولوں کو رفع کرنا ہوگا۔ عدم توازن کے شکار اپنے معاشرے کو کش مکش، تذبذب، انتشار، تصادم اور تضاد سے باہر نکال کر ان کی بے جہتی کو ایک سمت دینا ہوگی اور اپنے تخلیقی عمل میں باوقار سوچ کے ذریعے اپنی نئی نسل میں ایک انقلاب بپا کرنا ہو گا۔ اپنے کلچر اور تہذیبی رشتوں کا مذاق اڑانے والی نسل کو اپنی روایت اور تاریخ سے آگاہ کر کے اپنی تہذیب سے اُن کا رشتہ تلاش کرنے میں مدد دینی ہوگی تاکہ ہماری آنے والی نسل بھیڑ کی بجائے ایک قوم بن سکے۔ یہ اُن کا احسان ہوگا پاکستانی معاشرہ پر۔ انھیں اس دشوار راستے پر خود میں بھی تبدیلی لانی ہوگی۔ قول و فعل کے تضاد کو ختم کر کے سادگی اپنانی ہو گی۔ ہوسِ زر کی مذمت کرنی ہوگی۔ لامحدود خواہشوں کے معنی کرنا ہوں گے۔ عارضی خوشیوں کے حصول میں تن من دھن کی بجائے ابدی راحتوں کی تلاش کرنا ہوگی۔

عذرا اصغر (کراچی)

اردو ادب ہی میں نہیں ہر شعبہ ہائے زندگی میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو کام کرتے ہیں اور صرف کام سے غرض رکھتے ہیں دوم وہ جو نام کمانے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ نام تو بہر طور ان کا بھی ہوتا ہے جنہیں نام سے غرض نہیں ہوتی لیکن ان کا نام کام سے مشہور ہوتا ہے۔

اُردو زبان و ادب کے اس ناسپاس اور پرآشوب دور میں اردو کے جو جرائد اور کتب منصہ شہود پر آ رہے ہیں وہ صدقۂ جاریہ سے کیا کم ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب ''اردو ادب کے سفیر'' ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ہے۔ مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے سفیرانِ اردو ادب کے کوائف جمع کیے ہیں۔

دنیا کی وسعت کی طرح اردو ادب کا پھیلاؤ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک کتاب میں سما سکے تاہم اس کاوش کے ذریعہ سے بجا طور پر بہت سے ادب دوستوں سے تعارف ہو

رہا ہے اور یہ جان کر خوشی ہی نہیں بلکہ احساس طمانیت گہرا ہوتا ہے کہ اردو جسے بعض لوگ مردہ قرار دینے پر مصر ہیں وہ زبان مشرق وسطیٰ سے باہر بھی پھیل رہی ہے۔ بھارت اور پاکستان کے باشندے جس جس سرزمین پر قدم رنجہ ہوئے انہوں نے وہاں اردو ادب کا پودا کاشت کیا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں اردو ادب کا چرچا نہ ہو۔ یہی نہیں کہ مغرب اور مشرق بعید وغیرہ میں آباد اردو داں شعر و ادب تخلیق کر رہے ہیں اور محافل شعر و سخن برپا کرتے ہیں بلکہ بیشتر ممالک سے اردو کے بیشتر رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں۔ تقریباً گزشتہ چوتھائی صدی سے معروف شاعر، افسانہ نگار حیدر قریشی جرمنی سے جدید ادب شائع کر رہے ہیں۔ لندن سے سینئر اور نامور افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ پچھلی نصف صدی سے ایک جریدہ شائع کر رہے تھے اور ادب قریباً دس بارہ برسوں سے انہوں نے ہی سے مخزن کا اجرا کیا ہے۔ جس میں بیرونِ پاکستان ادیب و شعرا کی تخلیقات اور ان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ مخزن کی اشاعت نے بہت سے اہلِ قلم کو پاکستانی قارئین اور قلم کاروں سے متعارف کرایا ہے۔

مغربی دنیا میں بسنے والے صاحبِ استطاعت ادیب و شعرا پاکستان اور بھارت کے لکھاریوں بطور خاص شعرا کو بلاتے ہیں اور یوں اردو ادب کا دائرہ وسیع کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ مغربی اور مشرق بعید بلکہ دیگر ممالک کے ادب کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے نیز انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، عربی، فارسی زبانوں کے ادیبوں کے تعاون سے اردو کی تخلیقات مختلف زبانوں میں ترجمہ کی جائیں اور صرف یہی نہیں کہ تراجم ہوں بلکہ ان کی اشاعت کا بندوبست بھی ہوتا کہ انہیں مشرقی معاشرے کو سمجھنے میں سہولت ہو اور اردو ادب کا پھیلاؤ وسیع ہو۔ دنیا جو ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے صحیح معنوں میں قریب آئے اور ذہنی فاصلے کم ہوں۔ ''محبتیں'' جو مشرق اور خاص طور پر مسلم دنیا کا طرۂ امتیاز ہے عام ہوں نیز اقوام عالم جان سکیں کہ ہم محبت بانٹنے والے ہیں نفرت نہیں۔

ڈاکٹر علی محمد خان (لاہور)

دنیا جانتی ہے کہ اردو اس وقت دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں انگریزی اور چینی کے بعد تیسری بڑی زبان اردو ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے دنیا کے تقریباً ہر خطے اور ہر ملک میں موجود ہیں اور اس کے حلقۂ اثر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ انگریزی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک بھر میں واحد رابطے کی زبان ہے۔ اگرچہ پاکستان میں صوبائی سطح پر دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں مگر اُن کا دائرہ اثر صرف مقامی سطح تک محدود ہے جبکہ اردو واحد زبان ہے جو طورخم سے لے کر کراچی اور گوادر کے ساحلوں تک سمجھی، بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے بلکہ بھارت، بنگلہ دیش اور سارک کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی مقبولیت کچھ کم نہیں۔ یہاں کے بیشتر باشندے، بالخصوص شہری آبادیوں میں رہنے والے اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں ہے۔ گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جنوبی ایشیا میں اردو وہ زبان ہے جسے کوہ ہندو کش سے چٹاگانگ اور کوہ ہمالیہ سے لے کر جزائر مالدیپ تک قبولِ عام کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک اور یورپ، امریکہ، کینیڈا، افریقہ، آسٹریلیا اور ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دنیا کی بیشتر معروف یونی ورسٹیوں مثلاً کیمرج یونی ورسٹی، آکسفورڈ یونی ورسٹی، کنگز کالج لندن، لندن یونی ورسٹی، کولمبیا یونی ورسٹی، شکاگو یونی ورسٹی، انٹرنیشنل یونی ورسٹی کیلیفورنیا، میک گل یونی ورسٹی کینیڈا اور جامع ازہر مصر وغیرہ میں ضرورت کے تحت اردو کی تدریس کے شعبے قائم ہیں، جن میں اردو سیکھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ لطف

یہ ہے کہ متذکرہ یونی ورسٹیوں کے علاوہ بھی دنیا کی کئی اور یونیورسٹیوں میں اردو میں پی ایچ ڈی تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ پاکستان کی یونی ورسٹیوں میں بھی دوسرے ملکوں سے طلبہ اردو پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا کی سات ارب آبادی میں سے اردو جاننے اور بولنے والوں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ ارب سے متجاوز ہے جو اردو کی عام مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں؟ تو میرے نزدیک اس کا جواب اثبات میں ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں پاکستانی یا انڈین نہ ہوں۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ کہیں زیادہ ہیں اور کہیں کم اور کچھ لوگ مستقل طور پر رہائش پذیر ہیں اور کچھ عارضی طور پر لیکن انہیں روزگار کے دھندوں کے علاوہ زندگی بسر کرنے کے کچھ اور لوازمات بھی درکار ہوتے ہیں۔ پیار محبت سے زندگی بسر کرنے اور دلوں کو ایک رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ زبان ہے۔ وہ انگریزی، عربی، فرانسیسی، جرمنی یا دیگر غیر ملکی زبان میں اپنی لیاقت کا لاکھ اظہار کریں لیکن خواب اردو ہی میں دیکھتے ہیں۔ بیوی بچوں اور عزیز و اقارب سے اردو ہی میں گفتگو کرتے ہیں اور دل و جان سے اردو کے نام لیوا اور اردو ہی کے والا و شیفتہ ہیں چنانچہ انھوں نے مقامی طور پر اپنی اپنی دسترس میں رہ کر اردو شعر و ادب کے حوالے سے مختلف ناموں سے چھوٹی بڑی مجلسیں قائم کر رکھی ہیں جہاں وہ اپنی انا کی تسکین اور اردو شعر و ادب کی ترویج کے لیے کوششیں کر کے خوشی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ وہ وطن سے دور رہ کر اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔

ایسے تخلیق کاروں کی تخلیقات سے، جن کا تفصیلی تذکرہ آپ کو ڈاکٹر شبیہ الحسن کی نئی تصنیف ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' میں ملے گا، بے شائبہ و بلا مبالغہ وطن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور بعض جگہوں پر مثلاً: یو اے ای، برطانیہ، امریکہ، ایران، سعودی عرب، ترکی اور

مصر میں سہولیات نہ ہونے کے باوجود ان تخلیقات کا اچھا خاصا معیار ہے۔ میں بیرون ملک مقیم ایسے تمام پاکستانیوں کو جو کٹھن حالات میں اردو شعروادب کے پودے کی آبیاری میں مصروف ہیں، سلام پیش کرتا ہوں۔ میرے خیال میں انہیں وہاں رہ کر اردو زبان وادب کی خدمت میں مستعد رہنا چاہیے۔ اس کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا معیار اونچا کرنے کے لیے ان کی مالی معاونت سے سرپرستی کرنی چاہیے جو ان کے لیے شاید آسان بھی ہے۔

ڈاکٹر اختر علی میرٹھی (لاہور)

پیدا ظفرو فتح کا امکاں نہیں ہوتا
جب تک کوئی کوشاں بہ دل و جاں نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مشن میں دن دگنی اور رات چوگنی کامیابیاں عطا فرمائے۔ دیس اور پردیس میں رہنے والوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کے سوال نامے کے مختصر جوابات پیشِ خدمت ہیں۔

ا۔ اپنے وطن کی مٹی عزیز ترین متاعِ حیات ہے اور جب کوئی اس مٹی کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے تو اس کا رابطہ اپنے وطن سے مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ دیارِ غیر میں رہنے والا ہر پاکستانی اپنے وطن کا سفیر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو اس کی نس نس میں اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے اور شعروادب سے تعلق رکھنے والا انسان تو زیادہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اس کے ہر عمل سے اپنے دیس سے محبت کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

بیرون ملک رہنے والے پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج میں اپنا کردار نہایت احسن طریق سے نبھا رہے ہیں۔ وہ دیارِ غیر میں ہوتے ہوئے اپنی تہذیب وتمدن

اور اپنی زبان کی بہتر طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۲۔ دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کی تخلیقات میں وطن کی محبت کی خوشبو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ وطن میں رہنے والے تخلیق کاروں سے زیادہ محبِ وطن ہیں۔ ان کی تخلیقات میں اپنے دیس سے محبت کی تڑپ نمایاں نظر آتی ہے کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس خطے میں جنم لیتا ہے اسے اس خطے سے غیر ارادی طور پر بے انتہا لگاؤ ہوتا ہے۔

۳۔ تخلیق کار دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو وہ حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی نسبت جذبوں کو زیادہ محسوس کرتا ہے اور انہیں لفظی جامہ پہنا دیتا ہے جبکہ ایسا تخلیق کار جو اپنے وطن، اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں سے بہت دور تنہائی اور سفر کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو وہ ان جذبوں کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہے اور جب وہ ان جذبات و احساسات کو شعری و ادبی شکل دیتا ہے تو اس کا قاری و سامع کے دل و ذہن پر گہرا اثر مرتسم ہوتا ہے۔ ایسی تخلیقات کا معیار یقیناً بلند ہوتا ہے۔

۴۔ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی شعراو ادبا یقیناً معیاری تخلیقات منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ وہ ان تخلیقات کے ذریعے سے نہ صرف اپنا بلکہ اپنے ملک و وطن کا نام بھی روشن کر رہے ہیں۔ اردو شعر و ادب کے یہی سفیر ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

۵۔ شعری و ادبی تخلیقات کئی پہلوؤں سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں تخلیق کار کے احساسات و خیالات، تجربات و مشاہدات، علم، مطالعہ اور فکر و فلسفہ وغیرہ مرکب صورت میں سامنے آتے ہیں۔ دیارِ غیر میں مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کے مشاہدات و تجربات اور احساسات و جذبات نہ صرف اپنی قوم و وطن سے متعلق ہوتے ہیں بلکہ وہ آفاقی و کائناتی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تخلیق کار ان سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ ان کو جذب کر لیتا ہے اور ان کو اپنی زندگی اور عمل کا حصہ بنا لیتا ہے۔ اس لئے ان کی تخلیقات میں قومی نہیں بلکہ

عالمگیری خصوصیات جنم لیتی ہیں جسے ہم ادبِ عالیہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک اعلیٰ ادیب کا ہاتھ ساری دنیا بلکہ کائنات کی نبض پر ہوتا ہے لہٰذا ان پردیسی تخلیق کاروں کو مزید مشورے دینا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

پروفیسر آغا حیدر (لاہور)

دیارِ غیر میں رہتے ہوئے گوناگوں مصروفیات کے باوجود لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اُن تمام قلم کاروں کی تخلیقی و تحقیقی کاوشیں، اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا پرتو ہیں۔ وہ اُردو زبان کے سفیروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی کاوشوں کو ''کم و کیف'' کے ترازو میں تولنا، موزوں نہیں۔ یہ کہنا دلیل کم نظری ہے کہ پردیس میں کون اُردو زبان و ادب کو جانتا پہچانتا ہوگا۔ حق یہ ہے کہ پردیسی شعرا و ادبا، محبت کی زبان بولتے ہیں اور محبت کی زبان وہ دلکش صدا ہے جو عرب ہو یا عجم، جانی پہچانی اور سمجھی جاتی ہے۔ بقول حکیم الامت ؎ حرفِ محبت ترکی نہ تازی

الغرض دیارِ غیر میں بسنے والے قلم کاروں کی خدمات واقعی لائقِ صد تحسین و امتنان ہیں۔

زمانہ محوِ انتظار ہے کہ کوئی محقق اندرون اور بیرونِ وطن عزیز پاکستان کے لکھاریوں کی تخلیقات میں یک جہتی پیدا کرے تاکہ اُن کے دکھ درد میں ایسی سانجھ نمایاں ہو جس سے وطن کی مٹی کی خوشبو آئے۔ عین ممکن ہے کہ قدرت، آج کل کے نوجوان قلم کاروں کے سرخیل ڈاکٹر شبیہ الحسن سے، یہ کارنامہ کروا سکے۔

ڈاکٹر کنول فیروز (لاہور)

میرے قیامِ سرگودھا کے دوران ایک نامور ادیب فدائے ادب تونسوی ہوا کرتے تھے جن کی نگارشات اُس دور کے تقریباً ہر ہفت روزہ اور ماہنامہ جرائد میں شائع ہوا

کرتی تھیں۔ وہ طنز و مزاح سے لے کر ہر سنجیدہ ادبی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے نہیں جھجکتے تھے۔ آج مجھے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی پے بہ پے ادبی تخلیقات اور کتب کی اشاعت پر فدائے ادب تونسوی بے اختیار یاد آ گئے۔ ابھی چند دن ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مضافاتی ادب کے حوالے سے ایک گراں قدر تحقیق و تخلیق پر مبنی کام کیا۔ اس موضوع پر عصرِ حاضر کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر اساتذہ فن و شعر کی آرا حاصل کیں اور ایک جامع کتاب حسنِ ترتیب و تہذیب سے آراستہ کر کے "مضافاتی شعر و ادب" کے نام سے نذرِ قارئین کر دی۔ اس کتاب کی افادیت کے ہمہ نوع پہلو ہیں جن پر تفصیلاً لکھا جا سکتا ہے لیکن اس موضوع پر کام کرنے والے طلبا و طالبات اور محققین جو اس کتاب سے استفادہ کر سکیں گے وہ اپنی جگہ ایک مسلمہ امر ہے۔ ابھی اِس کتاب پر تبصروں اور آراء کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا مراسلہ موصول ہوا کہ دیارِ غیر میں مقیم تارکینِ وطن کے شعر و ادب پر وہ ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں جس کا نام "اُردو شعر و ادب کے سفیر" تجویز ہوا ہے۔ اُنہوں نے اس بڑے کام کا آغاز کر دیا ہے کیونکہ شاید ہی دُنیا کا کوئی گوشہ ایسا ہو یعنی کوئی ملک ایسا ہو جہاں اُردو زبان کا کوئی ادیب یا شاعر موجود نہ ہو۔ یہ دُنیا چار براعظموں پر مشتمل ہے جن میں یورپ، ایشیا، امریکہ اور آسٹریلیا شامل ہیں۔ ہمارے ہاں تقریباً ہر براعظم کے ہر قابلِ ذکر شہر میں مقیم ادیب و شاعر وطنِ عزیز میں ترکِ وطن کرنے کے بعد بطور مہمان آتے رہتے ہیں اور اُن کی بہ وجوہ پذیرائی بھی بڑی دھوم دھام سے کی جاتی ہے۔ اُن کے اعزاز میں تقریبات منعقد کی جاتی ہیں اور انہیں مختلف النوع اعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ بیرونِ ممالک میں اُردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ان ادیبوں اور شاعروں سے پانچ نکات پر مشتمل ایک سوال نامہ کے جواب حاصل کرنے کی سعی کی ہے۔ میرے نزدیک اُن کی یہ کاوش بھی آئندہ نسل کے تحقیق کاروں اور طلبا و طالبات کے لئے ایک راہنما کتاب ثابت ہوگی میری معلومات کے مطابق

اس نہج پر اس سے قبل کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا اور اس نوعیت کے کام کی ضرورت بھی تھی تا کہ اہلِ وطن ادیب و شاعر تارک الوطن ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت، فن اور اُن کی شعری اور ادبی کاوشوں، سرگرمیوں اور تخلیقات سے روشناس ہو سکیں۔ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ اور پھر اُن کے کوائف کا حصول بذات خود کٹھن اور تھکا دینے والا کام ہے لیکن ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اس کام کی بطریق احسن انجام دہی میں یقیناً کامیاب ہوں گے کیونکہ اُن کا ادبی ماضی اس کا گواہ ہے۔ انہوں نے یقیناً بیرون ملک آباد قابلِ ذکر ادیبوں اور شاعروں کے کوائف اکٹھے کر لئے ہوں گے۔ میں یہاں صرف دو مسیحی شاعروں کا ذکر کر کے اجازت چاہوں گا۔ امریکہ میں مقیم ایک شاعر افضال فردوس ہیں جن کے والد بھی شاعر تھے۔ اُن کا نام فردوس سیالکوٹی تھا۔ افضال فردوس کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں اور وہ آج کل امریکہ میں ایک چرچ میں ریورنڈ افضال فردوس کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ افضال فردوس پاکستان میں قیام کے دوران سیف الدین سیف سے تلمیذ تھے۔ اسی طرح یو ایس اے میں مقیم ایک اور مسیحی شاعر حمید ویس بھی ہیں جن کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں وہ پہلے پہل مجھ سے اصلاح لیتے رہے بعد ازاں سیالکوٹ کے نامور شاعر تاب اسلم سے اصلاح لیتے رہے۔ وہ بھی آج کل ڈاکٹر حمید ویس کے نام سے پادری کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی سوچتا ہوں کہ دو شاعرات کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ ایک تو برمنگھم انگلینڈ میں مقیم ہیں اور لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی معروف ہیں۔ اُن کا نام نسیم اختر ہے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے بلکہ کلیات بھی شائع ہو چکے ہیں اور دوسری شاعرہ نگہت پروین رعنا ہے جو شاعری میں میری شاگرد ہیں اور نیوجرسی یو ایس اے میں مقیم ہیں۔ انہوں نے ایم اے کا تھیسس قیوم نظر پر لکھا تھا اور ڈاکٹر اجمل نیازی، عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، گلزار وفا چودھری اور نسرین انجم بھٹی کی یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور میں ہم

جماعت تھیں اُن کا حال ہی میں ایک شعری مجموعہ ''نکہت گل رعنا'' کے نام سے شائع ہوا ہے جس پر اظہر جاوید، کنول فیروز، سالار مسعودی، نسرین انجم بھٹی اور پروین بجلی کی آرا درج ہیں۔

اعزاز احمد آذر (لاہور)

۱۔ حسب توفیق واستطاعت وہ سب تخلیق کار یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں مگر ایک بات پیش نظر رہے کہ جب کوئی تخلیق کار کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے یا اس تخلیق کے عمل ومراحل سے گذر رہا ہوتا ہے تو صرف اور صرف اپنی تخلیقی اپج یا فکری وفنی اور ذہنی وقلبی آسودگی کے لیے لکھتا ہے۔ ''شعروادب کی ترویج'' اس عمل سے از خود ہو جاتی ہے وہ اس نیت سے کاغذ قلم لے کر نہیں بیٹھتا کہ ''چلوجی آؤ شعروادب کی ترویج کریں'' ماشاء اللہ ہمارے ادیب وشاعر جو بیرون ملک مقیم ہیں ان کے تخلیقی عمل سے شعروادب کا ترویجی عمل مثبت انداز میں تکمیل پارہا ہے۔

۲۔ ان کی تخلیقات میں وطن کی مٹی کی خوشبو ''بولتی ہوئی'' محسوس ہوتی ہے یہ ایک قدرتی امر ہے کہ وطن سے باہر رہتے ہوئے حب وطن کا جذبہ بیکراں ہو جاتا ہے۔

۳۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیق کا معیار وہی ہے جو میری اور آپ کی تخلیقات کا معیار ہے۔

۴۔ سوال یہ ہے کہ میرے پاس اس اطمینان کا کیا پیمانہ ہے اور یہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار مجھے کس نے دیا؟ یہی بات سوال نمبر ۳ کے جواب کی بھی بنیاد ہے۔

۵۔ ان تخلیق کاروں کو مزید یہی کرنا چاہیے کہ "اپنا کام جاری رکھیں۔"

ڈاکٹر صاحب! آپ کی کوششیں اور کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔ آپ ادبی اور علمی قدروں کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ ایک مشن ہے اور مشنری لوگ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔ یہی آپ کے آج تک کے کام سے ظاہر ہے۔ اللہ آپ کو استقامت و کامیابی عطا کرے۔

پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب۔ آپ کے سوالات کے جواب میں میری ناچیز رائے ترتیب وار درج ہے۔

۱۔ جی ہاں! بیرون ملک مقیم پاکستانی (یا دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے تخلیق کار) شعر و ادب (اردو یا دوسری قومی زبانوں کے حوالے سے) کی ترویج کے لیے یقیناً اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ انھیں وطن میں مقیم تخلیق کاروں کی بہ نسبت یہ ترجیح حاصل ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے بیرونِ ملک مقیم ہم وطنوں کا ایک وسیع حلقۂ قارئین بھی تشکیل دے رہے ہیں اور زبان کو زندہ اور متحرک رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس سے نسبت برقرار رکھنے کی اہمیت کو اُجاگر کر رہے ہیں جو کسی بھی زبان کے لیے نیک فال ہے۔

۲۔ اُن کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو کا عنصر اندرونِ ملک بسنے والے تخلیق کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وطن میں موجود نہیں مگر وطن اُن میں پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ قوت سے موجود ہے۔ وطن سے محبت کا صحیح تجربہ بیرون ملک مقیم رہ کر ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ اس کسک کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کی تخلیقات سے وطن کی خوشبو کا ظہور ہونا عین فطری

ہے۔

۳۔ بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کی تخلیقات کا مجموعی معیار عمدہ ہے۔ انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو وہاں اچھے، بہت اچھے، بُرے اور بہت بُرے ہر طرح کے تخلیق کار موجود ہیں مگر ایسا تو اندرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کے سلسلے میں بھی ہے۔ یہ ہے کہ ہمیں اُن کی تخلیق کا معیار متعین کرتے ہوئے کسی بھی قسم کی رواداری اور خوشامد پسندی سے گریز کرنا چاہیے جس کا مظاہرہ کرنا اس سلسلے میں اب ایک عمومی روایت بن چکا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے قد کاٹھ مادی سہولتوں کی فراوانی یا کمیابی کے تناسب سے ماپنے کے بجائے، تخلیق کے فکری /ادبی معیار کے تناظر میں متعین کریں جس کے لیے اُن کی فکری اور ادبی استعداد کو معیار بنایا جائے۔

۴۔ بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کے کام سے مطمئن یا نامطمئن ہونے کا مسئلہ بھی انفرادی سطح پر تجزیے کا محتاج ہے۔ اُن کے کام کا مجموعی تاثر بُرا نہیں۔

۵۔ بیرونِ ملک مقیم تخلیق کار ہوں یا اندرونِ ملک موجود تخلیق کاروں کی فوج ظفر موج، سب کے لیے میرا مشورہ بس یہی ہے کہ انہیں ''کیا لکھنا چاہیے؟'' سے زیادہ یہ جاننا چاہیے کہ ''کیا کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں''۔ یعنی انہیں اپنے باطنی نقاد کو توانا اور فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری (عالمی) زبانوں کے ادب پر نگاہ رکھنا، ادبی رویوں اور اسالیب سے آگاہ ہونا اور اپنے اندر کے سچ کو فضا میں موجود دروغ سے محفوظ رکھنا، ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کو مسلسل اور بے تکان نبھانے کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک ادب سے وابستگی شوقِ فضول نہیں ایک الوہی ذمہ داری ہے اور میں ہر ادیب سے اس فرض کو بطریقِ احسن نبھانے کی توقع رکھتا ہوں۔

کرامت بخاری (لاہور)

۱۔ یقیناً اُردو ادب کی نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں، خصوصاً مڈل ایسٹ، جہاں جشن اور ایوارڈز کا سلسلہ چل نکلا ہے اور پھر تمام یورپ میں ادبی تنظیمیں فعال کردار ادا کر رہی ہیں۔ دنیا بھر میں یہ زبان پھیل رہی ہے اور حیران کن حد تک پھیل رہی ہے، یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق اردو اس وقت دنیا کی دوسری بڑی Spoken بولی جانے والی اور تیسری بڑی Written لکھی جانے والی زبان ہے۔ شعر و ادب کی نئی بستیاں، تنظیمیں، ادبی رسائل و جرائد یقیناً اس میں بہت ہی فعال اور مثبت کردار ادا کر رہے ہیں، ہمیں صرف اور صرف اردو رسم الخط کی تبدیلی کی سازش کا مقابلہ کرنا ہے، میں اسے سازش ہی کہا کرتا ہوں۔

۲۔ یقیناً ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو اور وطن کی مٹی کی مہک موجود ہے، اس سلسلے میں یورپ میں بسنے والے اردو شعرا پر کام ہو چکا ہے۔ میں خود تقریباً ۱۳ ملکوں میں جا چکا ہوں۔ وہاں وطن کی محبت اور وطن سے دوری کا احساس نمایاں ہے۔

۳۔ البتہ معیار پر گفتگو ہو سکتی ہے، معیار معیاری نہیں ہے، خصوصاً یورپ سے آنے والی شاعرات جنہیں یہاں کے شعرا لکھ کے دیتے ہیں، اُن سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں اور اُن کی کتابیں چھاپنے کے بہانے اُن سے لاکھوں روپے بٹورتے ہیں، باہر کے سفر اور مشاعرے پڑھتے ہیں لیکن اُن سے مخلص نہیں ہیں۔ ہر جگہ بتاتے ہیں کہ فلاں کو میں نے لکھ کر دیا، فلاں کو میں نے کتاب بنا کر دی وغیرہ۔ نام لینے کی ضرورت نہیں آپ سب جانتے ہیں۔ اس طرح یہ شاعرات خود اپنی رقم خرچ کر کے اپنی ذلت کے سامان پیدا کر رہی ہیں اور خوش

ہیں کہ ہماری تقریب ہوگئی، کتاب چھپ گئی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سلسلہ ذرا منفی ہے۔ وگرنہ اچھے شاعر اور شاعرات بھی ہیں، جنہوں نے معیاری کام کیا ہے۔

۴۔ ہاں میں ان کی تخلیقات سے مطمئن ہوں، مگر محنت اور علم کی ضرورت ہے۔ زیادہ سنجیدگی اور فکری آگہی کی ضرورت ہے، زبان کو زبان بلکہ پہچان کا درجہ دینا اور عبادت کی طرح بلکہ عقیدے کی طرح اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

۵۔ ایک تو اردو رسم الخط تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔ پابند شاعری کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ عروض، بحر، وزن اور شاعری کے رموز سیکھنا چاہئیں، اردو کو ان ممالک میں مزید متعارف کروانا، تراجم کروانا، اور پھیلانا چاہیے۔

افتخار مجاز (لاہور)

ایک تخلیق کار نقاد کے طور پر سوال نامہ مرتب کرتے ہوئے آپ نے بجا طور پر اُستادانہ چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے یوں اردو شعر و ادب کے سفیر پر اس منفرد کام اور کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ سوال نامے کی تخلیق پر بھی تحسین آپ کا حق ہے۔ بہر طور آپ کے ارشاد کی روشنی میں، بھجوائے گئے سوالنامے کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں، تاہم یہ پیش نظر رہے کہ یہ میری رائے اور ایک طالب علم کے جوابات ہیں۔

سوال۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں...... پاکستانی اہل قلم کی اردو زبان میں گاہے بگاہے تخلیقات نظر نواز تو ہوتی رہتی ہیں، کبھی کبھار ان اوورسیز پاکستانی قلم کاروں کی کتابیں، شاعری کے مجموعے اور نثری تخلیقات بھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں، لیکن میری دانست

میں یوں خال خال منصہ شہود پر آنے والی تحریریں اور کتابیں اپنے تخلیق کاروں (شعرا + مصنفین) کے ذاتی ذوق کی تسکین و آسودگی کا باعث تو ضرور ہوتی ہوں گی، اس Contribution سے ہمارے اردو شعروادب کے خزانے اور خزینے میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوتا، میں کوئی نقاد یا دانشور نہیں، تاہم ادب کے ایک عام قاری اور طالب علم کے طور پر میں دیکھتا ہوں اور میری یہ رائے ہے کہ عمومی طور پر بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی طرف سے تخلیق کیا جانے والا اردو (اور پنجابی) ادب کوئی بہت معیاری اور متاثر کن نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر تو مذکورہ تخلیقات بہت غیر معیاری اور ادب کے مروجہ قواعد وضوابط کی بھی نفی کررہی ہوتیں ہیں، یہ امر ملحوظ رہے کہ میں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے ہاتھوں تخلیق پانے والے سارے ادب کی بات نہیں کر رہا، عمومی صورت پر اپنی رائے دے رہا ہوں، وگرنہ یہ بھی حقیقت اور بہت بڑی سچائی ہے کہ کبھی کبھار بیرون ملک مقیم پاکستانیوں (اہل قلم) کی ایسی ادبی تخلیقات بھی نظرنواز ہوتی رہتی ہیں جو بلا شبہ ادب کے ماتھے کا جھومر کہی جاسکتی ہیں مگر یاد رہے کہ ایسی تحریروں اور تخلیقات کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔

چنانچہ متذکرہ بالا رائے کے تناظر میں، میں یہ کہوں گا کہ جب بیرون ملک پاکستانیوں کے ہاتھوں تخلیق پانے والا ادب متاثر کن ہی نہیں ہوتا تو پھر ہم اوورسیز پاکستانی لکھاریوں کے کردار کو کس منہ سے مثبت کہہ سکتے ہیں؟

یہاں میں ایک بات یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیق کردہ ادب کی کتابی صورت میں اشاعت کا باقاعدگی سے اہتمام ہو تو پھر شاید اوورسیز پاکستانی اہل قلم کا کردار اور Contribution واضح ہو کر سامنے آسکے، اور زیادہ بہتر ہو کہ آپ پھر ہم ایسے طالب علموں کی بجائے صائب الرائے اصحاب، ناقدین اور اہل فکر ودانش کی رائے لیں تاہم اس صورتحال کے باوجود میں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں سے ملتمس ہوں

کہ وہ میری یا میرے ایسوں کی رائے سے دل برداشتہ نہ ہوں اور اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔ مشق انسان کو بہتری کی طرف لے جاتی ہے، ممکن ہو تو سینئر اور اساتذۂ فن سے راہنمائی لیں تاکہ بہتر ادب کی تخلیق ان کے کریڈٹ پر آئے۔

میری تحریر کردہ ان سطور میں جہاں پہلے سوال کا جواب موجود ہے وہیں آپ کو سوال نامہ میں دیئے گئے تیسرے، چوتھے اور پانچویں سوال کا جواب بھی مل رہا ہوگا۔

آپ کے اس بہت ہی جامع سوالنامہ میں پوچھی گئی باتوں کے حوالے سے ایک بات میں یہ بھی کہوں گا کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی اہل قلم کے تخلیق کردہ ادب (جسے بعض اوقات ادب کہا ہی نہیں جا سکتا) کو پرموٹ کرنے میں ہمارے بعض ادیب شاعر اور اخبارات کے کالم نگار بہت منفی کردار ادا کر رہے ہیں، یہ لوگ بیرونی دوروں کے لالچ اور غیر ممالک میں مقیم ماٹھے شاعروں، ادیبوں بلکہ ''تک بند'' بزعم خود قلم کاروں ''مالدار آسامیوں'' کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے انہیں بے جا طور پر پرموٹ کرتے ہیں جس سے وہ ''تک بند'' خود کو سچ مچ کا ادیب شاعر سمجھ کر ادب کی خدمت کے نام پر ادب کی بدنامی کا باعث ثابت ہونے لگتے ہیں، لہٰذا ہمارے جینوئن ادیبوں، شاعروں اور کالم نگار، قلم کاروں کو چاہیئے کہ وہ ادب کو بے ادب کرنے کا یہ سلسلہ بند کریں اور صرف جینوئن اور سینئر پاکستانی قلم کاروں کو پرموٹ کریں، تاکہ جینوئن قلم کار واقعتاً ادب کی خدمت کر سکیں اور ہمارا ادبی خزانہ Rich ہو۔

آپ کا دوسرا سوال ہے کہ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

میری رائے میں بیرون ملک مقیم پاکستانی اہل قلم کی ادبی تحریروں اور تخلیقات کا معیار کچھ بھی ہو، وطن سے محبت کی چاشنی عمومی طور پر ان کی تحریروں میں ضرور ہوتی ہے، میرے حافظہ میں کئی شاعروں کے ایسے شعر محفوظ ہیں جو وطن سے دوری کے احساس کی اتنی

شہرت سے کسے گئے کہ وطن کے باس نے انہیں شہکار بنا دیا، اور وہ ضرب المثل بن گئے۔
جیسے یارِ عزیز شفیق سلیمی کا یہ شعر۔

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

اسی طرح بیرون ملک مقیم پاکستانی لکھاریوں کے نثری فن پاروں میں بھی عمومی طور پر وطن کی بو، باس، خوشبو، محبت ضرور ہوتی ہے، صرف ہوتا یہی کہ اچھے قلم کاروں اور مستند ادیبوں، شاعروں کا اسلوب انداز، پیرایہ اظہار فنکارانہ دلچسپ، توجہ طلب اور متاثر کن ہوتا ہے جبکہ فنی طور پر کمزور اور تنگ بند قلم کاروں کے ہاں یہ سب کچھ نہیں ملتا۔

حرفِ آخر کے طور پر ادب کی ترویج کے لیے قائم سرکاری و غیر سرکاری اداروں سے گزارش کروں گا کہ وہ بیرون ملک مقیم پاکستانی اہل قلم ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کا اہتمام کریں، بلکہ اوور سیز پاکستانیوں کا تخلیق کردہ ادب تسلسل سے مجموعوں کی صورت میں شائع کرنا شروع کریں تا کہ اوور سیز قلم کاروں کا Contribution واضح طور پر سامنے آسکے اور اگر ہمارا تاثر غلط ہے تو اس کی نفی ہو سکے!

لیجیے اب آپ سے اجازت چاہنے سے قبل میں چند لفظوں میں ایک مرتبہ پھر ساری بات کہہ دوں۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی اہل قلم کا تخلیق کردہ ادب میں فی الوقت کوئی مثبت و اہم کردار و حصہ نظر نہیں آتا، عمومی طور پر معیار بہت پسندیدہ نہیں، تاہم ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو عمومی طور پر ہوتی ہے۔ اوور سیز رائٹرز کو اپنی تعلیمی استعداد، مطالعہ بڑھانا چاہیے، سینئر اور اساتذۂ فن سے راہنمائی لینی چاہیے، میڈیا سے وابستہ افراد کو غیر مستند رائٹرز کو پرموٹ نہیں کرنا چاہیے، قومی اداروں کو اوور سیز پاکستانیوں کا تخلیق کردہ ادب تسلسل سے شائع کرنا چاہیے۔

یہ میری دیانتدارانہ اور سیدھی سچی رائے ہے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں، تاہم

اگر ایسا ہو تو میں پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

ڈاکٹر شفیق انجم (اسلام آباد)

بیرون ملک پاکستانی شعرا اور ادبا کی خدمات خاصی اطمینان بخش ہیں اور جہاں تک میرے علم میں ہے بیرون ملک ادیبوں نے اردو کو نئے جہانوں سے روشناس کرایا ہے۔ خصوصاً وہاں کے ادب، کلچر، ایجادات اور دیگر عصری علمی رجحانات و سماجی معاملات سے اردو والوں کو آگاہی دلانا اور یہاں کے مقامی مناظر کو دنیا بھر کے سامنے رکھنا، ایک بڑی خدمت ہے۔ اگرچہ یہ کام کئی دیگر ذرائع سے بھی ہوا ہے لیکن بیرون ملک اردو ادیبوں کا حوالہ زیادہ مؤثر اور پر معنی رہا ہے۔ تخلیق کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کی راہیں بھی کھلی ہیں اور سب سے بڑھ کر اردو کی آواز، اردو کا نقارہ (جسے محض ایک گونج کے معنی میں بھی لیا جائے تو بھی اہم ہے) ساری دنیا میں ان ادیبوں کے ذریعے عام ہوا ہے۔ آپ اس تحرک کو "اردو شعر و ادب کے سفیر" کی صورت میں جمع کر کے ایک بہت مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر حسین سحر (ملتان)

سوال۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک یہ قلم کار اس سلسلے میں فعال ہیں۔ اخبارات و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی رپورٹیں اس کا ایک واضح ثبوت ہیں۔

سوال۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب۔ جی ہاں! ان کی نگارشات میں وطن کی خوشبو کے ساتھ ساتھ اہلِ وطن کی یاد صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔

سوال۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں ان کی تحریروں کا فنی اور فکری معیار کسی طرح بھی کم نہیں۔ اس سلسلے میں ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی نگارشات کو دیکھا جائے تو آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر تحریریں معیاری ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ گزشتہ گیارہ برس میں چونکہ خود بھی بیرونِ وطن مقیم ہوں۔ اس لئے مجھے ان کی بیشتر تخلیقی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں ان کے کام سے بہت حد تک مطمئن ہوں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیئے؟

جواب۔ میری رائے میں انہیں پہلے سے زیادہ منظم اور متحد ہو کر اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ایک تحریک کی شکل میں اُردو زبان و ادب کی اشاعت اور خاص طور پر پاکستانیت کے تشخص کے فروغ کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ سمندر پار مقیم پاکستانیوں اور خاص طور پر خلیجی ریاستوں میں رہنے والے اہلِ وطن کو باقاعدگی سے ایک ایسا ادبی مجلہ جاری کرنا چاہیئے جو ان کی نگارشات کا نمائندہ اور تخلیقی سرگرمیوں کا ترجمان ہو۔

آغا گل (کوئٹہ)

بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے ادب میں ایک کرب عموماً ملتا ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر مسرور، مطمئن اور مالی طور پر خوشحال زندگی گزارتے ہیں، مگر ان کی تحریر میں ایک کرب

ہے۔ ان کے ذہن میں تضادات کا طوفان ہے۔ اُن کی کہانیوں میں ایسے مظلوم کردار ملتے ہیں جو روزی روٹی کمانے آئے ہیں مگر نئے معاشرے میں ان کی ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو رہی۔ وہ اپنے ساتھ روایات کا پاسدار ذہن بھی لے آتے ہیں حالانکہ انہیں اپنا دھڑ ساتھ لانا چاہیے تھا۔ ذہن وہیں کہیں پاکستان میں رکھ آتے ہیں۔ ڈریکولا کی مانند اُن کا دماغ ماضی کے تابوتوں میں صحیح سلامت پڑا رہتا ہے۔ سماجی تضادات عموماً اُن کے افسانوں کے موضوعات ہوتے ہیں۔ وطن عزیز میں عموماً Quality کی بجائے Quantity کی اہمیت ہے۔ پھر یہاں ادبی گروپنگ اور لابنگ ہے، جس کے سبب بیرون ملک پاکستانی افسانہ نگاروں کی پذیرائی کم ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ ہمارے سفیر ہیں۔ بیرونِ ملک وہ ہماری نمائندگی کر رہے ہیں۔ پاکستانی ادیب ناسٹلجیا کے سبب ست Nostalgic ہیں۔ ان کی تحریروں میں واضح Homesickness پائی جاتی ہے۔ وہ ہر ملک ہر شہر میں ایک چھوٹا سا پاکستان بنانا چاہتے ہیں جس کی اجازت متعلقہ ممالک نہیں دیتے۔ فنی لحاظ سے شائد اُن کی ادبی بنیاد عموماً کمزور ہوا کرتی ہے۔ یہ میری ایک محض ذاتی Generalise Statement ہے۔ اظہار کا قرینہ تو یقیناً موجود ہے، تخلیق کی قوت بھی ہے مگر ہر فن کی کچھ پابندیاں ہوا کرتی ہیں۔ میں اُن کا احترام کرتا ہوں کہ دیارِ غیر میں وہ تخلیق کا عمل برقرار رکھتے ہیں۔

ادھر وطن عزیز میں کچھ کمرشل ادبی رسالے اُن کی مالی حالت کیش کرتے ہیں۔ رقم لے کر اُن کی تخلیقات شائع کرتے ہیں حالانکہ ادب کو کمرشل نہیں ہونا چاہیے۔ ادب کمرشل ہو کر پروپیگنڈا بن جاتا ہے۔ اس کی روح کی پاکیزگی متاثر ہوتی ہے تاہم مجھے یہ کہنے میں، تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ اچھے معیاری افسانے تخلیق ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ممنون ہیں کہ آپ نے ایک ایسے حساس پہلو کی جانب توجہ دلائی جسے عمومی طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ بیرون ملک پاکستانی ادیب، شاعر، دانشور ہمارے سفیر ہیں۔ وہ پاکستانی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُن کے بارے

میں ایک تذکرہ مرتب کیا جائے یا تو ممالک کے لحاظ سے جیسے جرمنی، فرانس وغیرہ کے پاکستانی ادیب یا پھر یوں کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے ادیب۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے ادیب۔ کیونکہ ہر دس برس (Decade) میں دنیا بدل جاتی ہے۔ پسند و ناپسند۔ سائیکی غرضیکہ بھی کچھ بدل جاتا ہے۔ اس بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے آدرش کے ساتھ کیسے جیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وطنِ عزیز سے باہر۔ غیر ممالک میں جینا آرٹ ہے یا سائنس۔ اُمید ہے کہ شام وسحر کی لیبارٹری میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن خود ہی تجزیہ کریں گے۔

ناصر ملک (لیہ)

زبانیں خود رو ہیں؛ زبانیں تراش خراش مانگتی ہیں...... ان متضاد آراؤں کی موجودگی میں زبانوں کی نمو اور ارتقائی مراحل کی بود و باش میں سیراب کاروں کا کردار کسی بھی طور پر ثانوی حیثیت کا حامل نہیں ہوتا۔ اُردو چونکہ کم عمر مگر نہایت زود اشاعت زبان ہے، اس کے ارتقائی سفر میں میر و غالب، انیس و دبیر، سودا و شوق اور حالی و اقبال کی کاوشیں زادِ راہ ہیں اور اِس کے سیراب کار کسی بھی عہد میں خوابیدگی آمیز خاموشی کی ردا اوڑھ کر سوئے نہیں، اِس لیے اس کی اشاعت، نشو و نما اور کاملیت میں قلم کاروں، بیان طرازوں اور سود و زیاں کے شمار سے ماورا اصحابِ طرز ادیبوں کا کردار فراموش کیا جانے والا نہیں ہے۔ ماقبل تقسیم، برصغیر کے ادبا کا ایک کارواں تاریخ کے اوراق پر سجا ہے جنھوں نے ہندی، بنگلہ، پنجابی اور ان گنت مقامی زبانوں کے مقابلے میں اُردو کی ترویج کے لیے زندگیاں وقف کیں۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے شعرا اور ادیبوں نے اُردو کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا جبکہ کسی بھی پاکستان حکومت نے قومی زبان قرار پانے والی زبان کو اعتبار نہیں بخشا بلکہ اِسے انگریزی کے تابع رکھا۔ اُردو لکھنے بولنے والوں پر انگریزی کے متاثرین کو ترجیح دی جاتی رہی اور ناگوار امتیازی رویوں کے سبب احساسِ محرومی کی سوغات بانٹی گئی، مگر اِس خودرو درخت کو

تناور سائباں بنانے والوں کی اپنی سی جہتوں نے وہ کام کیا، جو حکومتوں پر قرض تھا جن سے ہر مقتدر نے آنکھیں چرائیں۔ عہدِ موجود میں بھی اُردو زبان کو یا تو اِس کے علمبردار ہتھیلیوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں یا پھر ٹاٹ سکولوں کے بچوں کی زبانوں پر اِس کے حروف تہجی سجے دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرتی تقسیم کا اظہار یوں بھی کیا گیا کہ متمول اور خود ساختہ اعلیٰ ترتیب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مخصوص مدرسوں میں اُردو تدریس موقوف کر دی گئی۔ بچوں کے لبوں پر ہائے، گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ، ٹیک کیئر، گڈ بائی اور سی یو اگین جیسے بے تاثر الفاظ چپکا دیے گئے اور اُن پر باور کرا دیا گیا کہ جذبات کے اظہار کے لیے ہماری قومی زبان ادھوری ہے، بے تاثر اور کھوکھلی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُردو زبان اِس قابل نہیں ہے کہ یہ عالمگیریت میں اپنی انفرادی پہچان بنا سکے؟ کیا یہ واقعی انسانی جذبات و احساسات کو عیاں کرنے سے عاری ہے؟......اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر یہ سوچنا ہوگا کہ پاکستان سے باہر جانے والے لوگ انگریزی (روایتی اور تحریف شدہ) سے بہت جلد اُکتا جاتے ہیں اور اپنی قلبی وارداتوں کو اُردو کے پیہناووں میں لپیٹ کر صفحۂ قرطاس پر سجاتے ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں ہے، جو یقیناً نہیں ہے، تو پھر اندرونِ ملک رہنے والے احساسِ کمتری کا شکار کیوں ہیں؟ وہ اپنے بچوں کو اُردو کے بجائے انگریزی کے نشیب و فراز کا مسافر کیوں بناتے ہیں؟......یہی وہ اُلجھن ہے جسے سلجھایا جانا وقت کی اولیں ضرورت ہے۔

کسی بھی دور میں تختِ اقتدار پر براجمان ظالموں اور خونی لٹیروں کی کمی نہیں رہی۔ جتنی طویل داستانِ ظلم ہے، اتنا ہی قدیم احتجاجِ مرداں ہے۔ خدا رسی ڈھیلی کرتا ہے، چھوڑتا نہیں۔ ظالم اپنی رسی کی طوالت میں خود اُلجھ کر منہ کے بل گرتا ہے۔ امریکہ، انگلینڈ اور اسرائیل گر ظلم و بربریت کے استعارے مانے جائیں تو آوارہ گردانِ تاریخ بہ آسانی ان استعاروں کے تانے بانے تاریخی قدامت تک لے جائیں گے۔ ہر ذی شعور ملتِ اسلامیہ

اس نکتے کو سمجھتا ہے کہ مغرب و امریکہ کی برتری عددی نہیں، وسائل پر موقوف نہیں اور نہ ہی ان کے دامن میں تین سو تیرہ شیدائیانِ شہادت کا سا جذبۂ جہاد موجود ہے۔ مذکورہ قوموں نے اپنی برتری علوم پر غیر معمولی دسترس کی بدولت حاصل کی۔ علم انبیاء کی میراث ہے۔ مسلمان اس میراث کے امین ہو کر اس سے دور بھاگتے ہیں۔ ابن الہیثم کا پن ہول کیمرا (Pin Hole Camera) سیٹلائٹ کی آنکھ سے اپنے حقیقی وارثین کی بے رغبتی کو حسرت و ملامت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ البیرونی کا علم آج بھی ارضی و سماوی پیمائشوں پر نوحہ خواں ہے۔ جابر بن حیان اپنے استاد محترم حضرت جعفر صادقؓ سے عرض پرداز ہے کہ میں ایک عالمِ دین استاد کی شاگردی میں بابائے کیمیا بن گیا، میرے پچھلے سینکڑوں استادوں کے طفیل بھی کوئی کیمیادان نہ بن سکا۔ ایوبی منجنیق سے خائف قومیں آج عالمگیر میزائلوں سے آراستہ ہیں اور نہ صرف ان سے بھرپور عسکری فوائد کشید کر رہی ہیں بلکہ زائد المیعاد اسلحے کو مہنگے داموں کڑی شرائط پر بیچ کر کثیر زرِ مبادلہ بھی حاصل کر رہی ہیں۔ قدرت ایک بار قسمت کا دروازہ ضرور کھولتی ہے۔ ہم پر جب بھی دروازہ کھلا، ہم اپنے آئیڈیلز کی دوسروں پر برتری ثابت کرنے میں خرچ ہو گئے۔ ہمارے ماضی کے روشن ستارے معترضین میں پھنس کر جانشینوں سے محروم ہو گئے۔ دینی و دنیاوی علوم کے بلا جواز بٹوارے نے ہمیں پتھر کے عہد (Stone Age) میں لا کھڑا کیا اور ہمیں اس پر کوئی ندامت تک نہیں۔ ''حصولِ علم ہر مرد و زن پر فرض ہے'' کے فلسفے کو ہم نے دینی علم تک محدود کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ ہادیٔ عالم ﷺ نے یہودی قیدیوں کو کن علوم کے کارہائے تدریس پر مامور کیا اور بخشش میں آزادی مرحمت فرمائی۔ حصولِ تعلیم کیلئے چین جا کر کن علوم پر دسترس مطلوب تھی؟ حالانکہ فاصلے کی اکبریت کو تمثیلی پیرہن کسی اور انداز سے بھی دیا جاسکتا تھا۔

بڑی احتیاط سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا، ہم وہیں کھڑے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے کشکول مایا سے عاری تھے مگر جھولی سے ایمان و

ایثار کا خزینہ لبریز تھا، آج وہ بھی نہیں۔ کل ہماری گرد آلود آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے مستقبل کے خواب رقصاں تھے، آج ہماری آنکھیں بے نور ہیں۔ سر پر ڈھلکتے جس آنچل کیلئے ہم نے ہزاروں ہاتھ کٹوائے، آج انہی آنچلوں کو ہمارے اپنے ثقافتی حملوں نے نوچ گھسوٹ ڈالا۔ انگریزی تقلید کی بے بہر مجبوری دکھائی ہوئی علیگڑھ کی راہ کو ہم نے مضبوطی سے تھام لیا، اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا۔ انگریز نے ہماری بے ضابطگیوں اور بے راہ رویوں سے تنگ آ کر ہمیں آزاد کیا، ہم نے ان کا طوقِ غلامی نہ چھوڑا۔ اپنے نظریات کو ترک کرتے ہوئے اپنے آپ کو کسی قابل نہ چھوڑا۔

انگریزی زبان پر دسترس کو کلید ارتقاء قرار دینے والو! کیا البیرونی، خوارزمی، ابن الہیثم، جعفر صادقؒ اور جابر بن حیان جیسے عالمی شہرہ آفاق محققین نے حصول علم کیلئے انگریزی یا بدیسی زبان پر اعتماد کیا؟ کیا چنگیزی عسکریت کو انگریزی زبان دانی کی ضرورت پیش آئی؟ چائنا اور جاپان کی ٹیکنالوجی انگریزی زبان کی مرہون ہے؟ لبنان، فلسطین، کشمیر اور بوسنیا کے مسائل پر کتنے مناظرے ہمارے فر فر انگلش بولتے صاحبانِ اقتدار نے جیتے؟ گر کسی بھی استفسار پر دعویٰ اثبات ہو تو اپنی انگریز فہمی کے نتیجے میں حاصل کئے تمغہ ہائے امتیاز ساتھ لے جاؤ اور احمدی نژاد اور اس کی قوم کو انگریزی کی افادیت بتلاؤ۔ اپنے ماہر نفسیات دانوں سے دریافت کرو کہ دنیا میں پاکستانی قوم کے علاوہ بھی کوئی ہے جو اپنے بچوں کو چار زبانیں پڑھانے پر نازاں ہے؟ پوچھو کہ پاکستان کے حرماں نصیب نونہالوں کی چار زبانوں کے کڑے محاذ پر کس طرح نفسیاتی درگت بنتی ہے؟...... سوچو کہ اللہ اکبر کی تمام عمر گردان کرنے والے اللہ کو اکبر اور اکبر کو اکبر اعظم کیوں مانتے ہیں؟ دیکھو کہ قرآن کو از بریاد کر لینے والے اس کی تعلیمات پر کس حد تک عمل پیرا ہیں؟...... مانو کہ "مارننگ واک" پر ہر کلاس میں امتیازی نمبر لینے والے گیارہ بجے سے پہلے بستر سے نہیں نکلتے۔ مانو کہ "آنسٹی از دا بیسٹ پالیسی" پر رقم طراز سکول سے نکلتے ہی بدعنوانیوں اور فراڈ کے نت نئے

طریقے ایجاد کرتے ہیں۔ مانو کہ ''ڈو آرڈائی'' پر پوزیشنیں حاصل کرنیوالے قتل و غارت گری میں کئی تھانوں کو مطلوب ہوتے ہیں۔ مانو کہ کرکٹ کنٹری کو پوری طرح سمجھنے والے انگریزی میں اپنا نام بھی نہیں بتا سکتے۔ مانو کہ ''ولا تفرقوا'' پر طویل مضمون لکھنے والے فرقہ بندی کے خلاف نئے فرقہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ پھر یہ بھی مانو کہ ہمارے پاس گریجویٹ، ماسٹرز اور فلسفی تو ہیں مگر لوحِ فردا پر لکھی خون آشام تحریر پڑھ کر سمجھنے والا کوئی نہیں۔ گر تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع ہے تو کسی قومی بینک کی لون فائل کے انگریزی مندرجات کا انگلش گریجویٹ سے اردو میں ترجمہ کروا کے دیکھو۔ کسی پنجابی کے ماسٹر سے ہیر وارث شاہ کا اردو میں ترجمہ کراؤ۔ ''راجہ گدھ'' یا ''جنت کی تلاش'' کا انگریزی کے ماسٹر سے ترجمہ کراؤ۔ کسی ایم اے عربی سے نماز کا مادری زبان میں مفہوم پوچھو۔ ڈگریاں بانٹنے اور ان کا شمار کرنے سے شرحِ خواندگی بڑھتی ہے، شعور نہیں بڑھتا۔

یہ طے ہے کہ کسی بھی معاشرے کی اقدار، رسومات اور جذباتی اونچ نیچ کے پیمانے ہمیشہ اُسی خطے سے ہزاروں سال کی وابستگی رکھنے والی زبان میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ کوئی بھی اور زبان، خواہ وہ دنیا میں کتنی ہی معتبر اور کثیر القومی قرار پا جائے، اس معاشرے میں مکمل اور جاندار نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی حالات میں جب اُردو کا سینہ چھلنی ہے، محبانِ اُردو کی آوازیں بھرائی ہوئی ہیں، کتب اپنے قارئین کے انتظار میں بوسیدہ ہوتی جاتی ہیں، نصابِ تعلیم اُردو کے ادیب نہیں، بلکہ انگریزی کے ترجمان پیدا کرنے پر مامور ہو چکا ہے، تب ڈاکٹر شبیہ الحسن ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' کے عنوان سے اُردو کی آبیاری کا پرچم سربلند کر کے میدانِ عمل میں سینہ سپر دکھائی دیتا ہے تو خوش گوار حیرت کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ جب ایک کربِ ناتمام کے ساتھ اپنے عہد کے معتبر دانش وروں سے سوال کناں ہوتا ہے کہ کیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کا کردار اطمینان بخش ہے تو دل میں ایک عجیب سی کسک جاگتی ہے کہ اُن پر عائد ادبی ذمہ داریوں کا جائزہ لینے سے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ

کیا اندرونِ ملک بیٹھے ہوؤں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے؟......

بیرون ممالک میں مقیم پاکستانی تخلیق کار کئی انداز سے زبان و ادب کے فرائض سفارت سرانجام دینے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے افراد کو ہم اس طرح فہرست کر سکتے ہیں۔

۱۔ وہ تخلیق کار جن کی تخلیقی ترجیحات اپنی مٹی سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کی رہتل بھتل بھلے غیر ملکی ہو مگر سوچنے کا انداز اور فکری صداقت عین پاکستانی ہے۔

۲۔ وہ تخلیق کار جو حصول سرمایہ کے بعد شہرت کی دیوی کو رام کرنے کے لیے ادب کو بطور ہتھکنڈا استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے پاس تخلیقی قوت نہیں ہے اور ان کی تخلیقات کو بہ صد احتیاط بدیشی ادب کا چربہ یا ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۳۔ وہ تخلیق کار جو اپنے وسیب کی روایات اور ترجیحات کو طویل مسافت کے بعد فراموش کر بیٹھے ہیں اور ترقی یافتہ معاشروں کی بدلی ہوئی اقدار کی آئینہ کاری کرتے ہیں۔

۴۔ وہ افراد جن کے ہاں ادبی اقدار نہ ہونے کے برابر ہیں اور وہ نمود و نمائش کے زینے پر بیٹھ کر پاکستان کے ادباء و شعراء کو کمیونٹی کے مالی اشتراک سے اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں، گہما گہمی، میڈیا کوریج اور بلائے گئے مہمان ادباء کی شہرت کو اُچک کر اپنی برتری کا اظہار کرتے ہیں۔

کوئی بھی ادیب جب معاشی مسائل کے ہاتھوں یرغمال ہو کر، اپنی فضا میں گھٹن سے گھبرا کر یا ترقی یافتہ معاشروں کی تاب و تمکنت سے متاثر ہو کر بیرون ملک مقیم ہوتا ہے تو وہ اپنی مادری اور قومی زبان سے منہ پھیر کر انگریزی یا متعلقہ دیسی زبان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ فطری اور بنیادی خواہش ہوتی ہے۔ وہ بولنا اور لکھنا سیکھ جاتا ہے مگر لاکھ خواہش اور کوشش کے باوجود اپنے تخیلات کی دنیا کو، اپنے مافی الضمیر کے اظہار

کے لیے، دکھائی دینے والی جھلمل روشنیوں کے سیلاب کو اپنی نم آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حیطۂ تحریر میں لانا چاہتا ہے تو اچانک بے بس ہو جاتا ہے۔ اُسے سیکھی ہوئی بدیشی زبان نامعتبر اور ادھوری محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی ابتداء کی طرف لوٹتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں اُلجھ جاتا ہے اور اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اُلجھے ہوئے ریشم میں ہاتھ پھنسا بیٹھا ہے۔ وہاں کا مزاج اُس کی ادبی استقامت کو تاراج کر دیتا ہے۔ کھنڈر زدہ بلند و بالا اور روشن عمارتیں دیکھتا ہے۔ گونگے عہد میں جنم لینے والا آواز کے ہجوم میں آن کھڑا ہوتا ہے۔ اندھی راہوں پر بچپن نچھاور کرنے والا اخیرہ کن روشنیوں کی زد میں ایستادہ ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے تو اُس ماحول کو جس سے اُس کا نہ تو جذباتی تعلق وابستہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہمدردی کا کوئی احساس...... وہ سوچتا ہے تو اُس ذہن سے جس نے انسان، تخلیقِ انسان اور ترجیحاتِ انسان کا یکسر مختلف نصاب پڑھ رکھا ہوتا ہے۔ وہ کھوتا ہے تو اُن ہاتھوں سے جن ہاتھوں پر سیاہ بختی، بدامنی اور گھٹن کی لکیریں ثبت ہوتی ہیں۔ ایسے میں اُس کے اظہار میں اخلاص اور صداقت کا فقدان پیدا ہونے لگتا ہے۔ وہ اُس معاشرے میں سانسیں لیتا ہے جہاں قلم کار نہ صرف بہت معتبر بلکہ عوامی پسندیدگی کا نمائندہ ہوتا ہے مگر اُس کے تمام تر قارئین عقب میں اُس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں جو اپنی کم مائیگی کے سبب، اپنی مجبوریوں کے سبب اندھیروں کو سینے سے لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ انھیں بدیشی اجالوں کی کہانیاں مزید دُکھ اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بیرونِ ممالک رہنے والے اپنی بے پناہ دولت اور وقت کی عمدہ تقسیم کے سبب نہ صرف بہت کچھ لکھ لیتے ہیں بلکہ پیسہ خرچ کر کے عمدہ طباعت اور بڑی اشاعت کا حظ بھی اُٹھا لیتے ہیں۔ خوبصورت اور اُجلی کتابیں اُردو کے مغربی ماحول میں اپسرائی مخلوق کی طرح اُترتی ہیں۔ اسٹالز پر تابندہ و فروزاں دکھائی دیتی ہیں مگر زمین سے فطری رشتہ اور جذباتی وابستگی نہ ہونے کے باعث عوامی ہمدردی اور پسندیدگی حاصل کرنے سے محروم رہتی ہیں۔ میں نے ایک برطانیہ پلٹ

شاعر سے گلہ کیا کہ آپ اُردو شاعری میں انگریزی الفاظ و محاورات کو اِس بے دردی سے کیوں ڈال دیتے ہیں تو وہ خفا ہو گیا اور اُس نے بے دریغ درجواں آں کے طور پر کہا کہ آپ اُردو کے بنیاد پرست ادیب ہیں۔ اُردو میں عربی، ہندی اور فارسی کے الفاظ شامل ہو سکتے ہیں تو انگریزی کے کیوں نہیں؟ موصوف نے یہ بھی کہا کہ ہم اُردو کو دنیا کے قریب کرنا چاہتے ہیں اور آپ جیسے قدامت پسند ادیب اِسے دنیا سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں اُس کی باتوں پر سوائے دم بخود رہنے کے، کیا ردِ عمل ظاہر کر سکتا تھا۔

بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار ادبی ترویج و اشاعت میں اپنی سی کوششیں بہر حال کر رہے ہیں۔ متمول ادیب کمیونٹی کے تعاون سے مشاعروں، ادبی تقاریب اور مباحثاتی انعقاد کے عمل میں پیش پیش ہیں۔ اُن کے منظورِ نظر افراد غیر ملکی دوروں کا لطف بھی کشید کرتے رہتے ہیں، وہ تخنے درے مملکتِ خداداد میں راجہ اندر کی طرح سال بسال اُترتے ہیں اور نمود و نمائش کی بیساکھیوں پر اِٹھلاتے ہوئے حلقۂ یاراں سے گھل مل کر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوششیں کرتے ہیں مگر بصد معذرت یہ اُردو ادب کی خدمت کے زمرے میں آنے والے عوامل نہیں ہیں۔ یہ شخصی نمائش اور جذباتی آسودگی کے ہتھکنڈے ہیں۔ مگر یہ وطن سے باہر مقیم بھی افراد کا وطیرہ نہیں قرار پاتا۔ معاشی مجبوری کے سبب ملک سے باہر قدم رکھنے والے کئی افراد ایسے بھی ہیں جن کے قلب و نظر میں ہمیشہ وطن کی ناآسودہ گلیاں، ناانصافی سے بھرا ہوا معاشرہ، پیلے اور ابھری ہڈیوں والے مدقوق چہرے اور بیٹوں کی راہیں تکتی ہوئی جھریوں بھری مامتائیں سسکتی رہتی ہیں۔ وہ معاشرے سے کٹتے ہیں مگر انسانی محسوسات کی دنیا سے کٹنے پر تیار نہیں ہوتے۔ وہ لکھتے ہیں تو ان کی تحریر میں نہ صرف وطن سے دوری کا دکھ شامل ہوتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ ناسٹلجیا کا شکار رہتے ہیں۔ اگر سفیر راے امریکیائی فضا میں رہ کر بلھے شاہ، خواجہ فرید، وارث شاہ اور شاہ حسین کے لفظوں کا جادو فراموش نہیں کر پایا تو یہ اُس کے ذہن کا کمال ہے جس نے پنجابی ادب کی روایتی تابکاریوں

کو اپنی سنگلاخ زمین پر کندہ کر رکھا ہے۔ حیدر قریشی جرمنی کی جدت طراز فضا میں سانسیں لیتے ہوئے اپنے چھوڑے ہوئے وسیب کے لیے متفکر نظر آتا ہے۔ ایسے تخلیق کاروں کی بلاشبہ کمی نہیں ہے جو اُردو یا پاکستان کی مقامی زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لیے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں اور ان کی تخلیقات میں بلاشبہ وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ مطالعاتی سفر میں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کے ہاں نئی باتیں، نئی تراکیب، نئے استعارے اور تشبیہات بکثرت موجود ہیں بلکہ کسی بھی لحاظ سے اُن کی تخلیقات کے معیار پر انگشت طرازی نہیں کی جاسکتی۔ یہ لوگ کسی نمود و نمائش، صلے، ایوارڈ یا شہرت کے بغیر اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔ مسلسل یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ ملک کے اندر رہ کر بیرونی زبان و ادب سے متاثر ہونے والے کتنے بڑے فریب اور واہمے کا شکار ہیں۔ چونکہ وہ اُردو کے حقیقی سیراب کار ہیں، اس کے طلب گار ہیں، عیاں کرتے ہیں کہ وہ یورپ میں بیٹھ کر بھی اُردو یا مادری زبان کو دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان و ادب پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہوں نے اپنے زبان و ادب سے منہ موڑ کر بدیشی ثقافت کو پورے جان و تن سے گلے لگایا اور کوشش کی کہ انگریزی یا دوسری کسی یورپین زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا جائے، کتب شائع کیں مگر چونکہ کسی بھی زبان کو محض بول لینا ہی کافی نہیں ہوتا، اس لئے بری طرح ناکام ہوئے۔ اُن کی اشاعتی جسارتوں کو مقامی وسیب نے بری طرح مسترد کر دیا۔ اپنے وطن میں بدیشی ادب کی گنجائش نہیں تھی۔ یوں اُن کی تخلیقات اندھیرے میں کھو گئیں۔

جو تخلیق کار انگریزی (یا کوئی بھی بدیشی) ادب کے گلے میں تخلیق کا ہار پہنا کر پاکستانی ادب میں ڈھالتے رہے، وہ بھی محض ذاتی نمود و نمائش کے کچھ بھی حاصل نہ کر پائے۔ یہ تسکین بھی بہت عارضی اور لمحاتی ثابت ہوئی۔ عملی طور پر وہ زبان و ادب کی کوئی خدمت نہیں کر پائے۔ چونکہ وہ خیالات و افکار اُس معاشرے سے چُراتے رہے جس کا اس

معاشرے سے کوئی ناتا نہیں تھا، اِس لیے یہاں اُن خیالات کو کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ ان کی شاعری یا نثر میں وطنیت کا عنصر غائب تھا، صداقت کی خوشبو ناپید تھی اِس لئے یقینی طور پر ان کی تخلیقات کو عمدہ معیار اور نفاست و جدت کی سند حاصل نہ ہو پائی۔ چند ایک، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اُردو کو "وسعت" دینے کے درپے رہے اور اس کارِ عجب نے بھی انھیں کوئی دوام نہیں بخشا۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی فطری ماخذ، انسانی جذبے اور محسوسات جن کا براہِ راست تعلق ہمارے معاشرے سے ہے، بدیشی زبان و ادب کا حصہ نہیں ہیں۔ جو وہاں کے ابتدائی عناصر ہیں، وہ ہمارے ادب سے ماورا ہیں، اِس لیے آدھے تیتر اور آدھے بٹیر اپنی بولیوں کے حصار کھینچنے میں ناکام رہے۔

مجموعی طور پر میں بصد عجز یہ رائے پیش کرتا ہوں کہ دیسی ادب کی اشاعت اور سفارت میں ہمارے بیرونِ ملک مقیم قلم کار جزوی طور پر ناکام ٹھہرے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا متن کمزور، اظہار ناتواں اور ذائقہ مدام رہنے والا نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات میں وطنیت، محبت اور روایات ناپید ہیں اور عدم اعتماد اور عدم اطمینان کا احساس ہوتا ہے مگر یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں اور (انشاءاللہ) آنے والے نہایت قریبی عہد میں وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں گے۔ ان سفیروں کو اپنے کردار کی تمام تر نوعیات، جزئیات اور اہمیت کو سمجھنا ہوگا۔ صرف خوب صورت کتابیں، چند پسندیدہ قلم کاروں پر مشتمل تحریروں والے رسائل اور تقاریب کافی نہیں ہیں۔ انہیں اُردو کا مزاج سمجھنا ہوگا، انہیں اُردو کو دنیا میں روشناس کرنے کا طریق کار اپنانا ہوگا، تب کہیں جا کر دیدہ ور پیدا ہوگا......

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (سرگودھا)

سوال ۔ کیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لئے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ یقیناً بیرونِ ملک تخلیق کار بڑی حد تک اپنا کردار ادا کر رہے ہیں لیکن ان کی بہت سی تخلیقات دستیاب نہیں اس لیے کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہو گا جبکہ مجموعی طور پر تخلیق کار جہاں بھی ہو اپنا تخلیقی عمل جاری رکھتا ہے۔

سوال۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب۔ وطن سے محبت قدرتی عمل ہے لیکن اسے لاشعوری طور پر محسوس کیا جانا چاہیے تو زیادہ تخلیقی عمل وقوع پذیر ہو سکتا ہے یقیناً بہت سے تخلیق کار وطن کی محبت سے سرشار ہیں۔

سوال۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب۔ تخلیق کاروں کی تخلیق کا معیار جانچنا کوئی آسان کام نہیں اور نہ یہ تنقید کا منصب ہے۔ بہر کیف یہ تخلیقات اپنے ہونے کا ثبوت ضرور فراہم کرتی ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات دستیاب نہیں اور پھر مطمئن تو ہم خود اپنی تخلیقات سے بھی نہیں یہ ایک سفر ہے، خوب سے خوب تر کا سفر جو جاری رہنا چاہیے۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب۔ ان تخلیق کاروں کو اپنا تخلیقی عمل جاری رکھنا چاہیے اور تخلیقی عمل جاری رکھنا ہی مثبت عمل ہے۔

ڈاکٹر مختار ظفر (ملتان)

آپ نے اپنی زیرِ تکمیل کتاب ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' کے لئے جو سوالات ترتیب دیے ہیں، وہ ایسے صائب اور معنی خیز ہیں کہ ان کے جوابات سے متعینہ موضوع کی

وسعت، وقیع اور گراں قدر نیز متنوع معلومات پر محیط ہوگی۔ بوئے گل بھی ہوگی، نالۂ دل بھی اور دودِ چراغِ محفل بھی اور تری بزم سے کوئی پریشاں خاطر بھی نہیں رہے گا۔

آپ کی اس کاوش کی تحسین واجب ہے کہ ''اُردو شعر و ادب کے یہ سفیر'' لولوئے لالہ کی طرح ہیں، آپ محنتِ شاقہ سے انہیں چنتے ہیں اور اس متاع کو علم و ادب کی محفل میں غور و فکر کی نذر کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح شعر و ادب کے گلزار کھلانے کی سعی جاری رکھیں تا کہ

یمِ ہستی میں کیف و نور کا سیلِ رواں آئے

آپ نے اس حوالے سے جو سوالات اُٹھائے ہیں، اپنی معلومات کی حد تک ان کا مختصراً جواب پیشِ خدمت ہے:

۱۔ میرے خیال میں بیرونِ ملک ہمارے پاکستانی تخلیق کار اپنی شعری و ادبی نگارشات کے ذریعے فی الواقع ایک مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ شعر و ادب نہ تو بزنس کا مال ہے جو کسی خاص آمدنی کا ذریعہ ہو اور نہ ہی ارادی کاوشوں کا حاصل، بلکہ اِس ''متاعِ گراں مایہ'' کی تو آج کے مادی دور اور حصولِ زر کی دوڑ میں کوئی وقعت ہی نہیں ہے، لہٰذا اس صورتِ حال میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ ''ان سر پھرے'' تخلیق کاروں کے اندرونی اُبال کا نتیجہ ہے اور کسی تخلیق کا پیرامیٹر بنیادی طور پر یہی ہے کہ وہ اس نامیاتی قوت کی دین ہو جو تخلیق کار کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔

۲۔ دیارِ غیر میں مقیم ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیق پر وہاں کے ماحول اور معروضی حالات کا اثر بھی ہوگا تاہم وطن کی محبت اس میں گہرے رنگ بھرتی ہے۔ یہ محبت جس طرح ان کے دلوں میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے اور اس کی یاد انہیں اس طرح ستاتی ہے کہ

خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

تو یہی خوشبو ان کی نگارشات میں جادو جگاتی ہے اور اسی وجہ سے یہ حب وطن سے نکہت بار ہیں۔

۳۔ ان تخلیقات کا معیار مختلف بھی ہے اور بوقلموں بھی۔ جو لوگ وطن میں تخلیق ہونے والی نگارشات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، وہ فکر و فن کی Main Stream سے جڑے رہتے ہیں، اس لئے ان کی کاوشیں معیاری ہوتی ہیں...... مگر وہ لوگ جو بے گانہ رہتے ہیں، ان کی کاوشوں کے لئے کہنا مشکل ہے کہ وہ ملکی معیار سے کس حد تک انصاف کرتی ہیں۔

۴۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں کا زیادہ مطالعہ نہیں...... تاہم جو چیزیں نظر سے گزری ہیں، ان میں بیشتر کا حسن دل فریب اور Content تفکر خیز ہے۔ وہ دل پر دستک بھی دیتی ہیں مجھے اطمینان ہے کہ "شعر و ادب کے یہ سفیر"، ادب کی اچھی جوت جگا رہے ہیں۔

۵۔ میرے خیال میں ان تخلیق کاروں کو اپنی نگارشات پاکستان کے ادبی مجلوں میں اشاعت کے لئے بھیجنی چاہئیں اور ہمارے مجلوں کو ان کی خواہشات کا احترام کرنا چاہیے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم پاکستان میں طبع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد از خود انہیں پہنچائیں...... پھر یہاں کے وہ لوگ جو ان کی دعوت پر وہاں جاتے ہیں اور ادبی محفلوں / سیمینارز میں شرکت کرتے ہیں، بلکہ رسائل و جرائد میں جہاں اس عنوان سے اپنا تذکرہ کر کے اپنی projection کرتے ہیں وہاں ان کی ادبی و شعری خدمات کا بطور خاص ذکر کریں تاکہ وہ بھی نغمہ بن کر ہماری سماعتوں میں گونجتے رہیں اور پھر شاخ در شاخ کئی پھول سنور کر "آئیں"۔

عارف شفیق (کراچی)

کیا زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

یہ خوبصورت شعر دیارِ غیر میں ایک مدت سے مقیم پاکستانی شاعر احمد مشتاق کا ہے ہم اگر مختلف ممالک میں مقیم پاکستانی ادیب و شعراء کی تخلیقات کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی اور احمد فراز کے انتقال کے بعد جو ادبی منظر نامہ ہمارے سامنے موجود ہے اس میں ظفر اقبال، شہزاد احمد، انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد، رشید امجد، احمد ہمیش اور چند اور نام ان میں شامل کرلیں جو پاکستان میں موجود ہیں۔ باقی اس عہد کے اہم لکھنے والوں کی اکثریت دیارِ غیر میں مقیم ہے۔ احمد مشتاق کے بعد ایک اہم نام ساقی فاروقی جن کا یہ شعر مجھے ذاتی طور پر پسند ہے۔

بیکار ان کے واسطے آنکھیں ہوئیں تباہ
یہ لوگ آنسوؤں سے گرفتار کب ہوئے

افتخار نسیم جیسا جدید اور بیباک شاعر بھی دیارِ غیر میں مقیم ہے۔ افتخار نسیم اور خالد سہیل کی تخلیقات کا مطالعہ تو یہ احساس دلاتا ہے کہ اگر وہ پاکستان میں ہوتے تو شاید اتنی بیباکی سے اپنے اندر کی سچائیوں کا اظہار نہ کرپاتے۔ نظم کی ایک اور خوبصورت شاعرہ نسیم سید جن نئے تجربوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے ہوئے ہیں وہ بھی دیارِ غیر میں مقیم ہیں۔ ماہیے کے حوالے سے ایک اہم نام حیدر قریشی کا تعلق بھی دیارِ غیر سے ہے۔ حمیرا رحمان، اشفاق حسین، تسنیم الٰہی، زلفی یعقوب تصور، شفیق سلیمی، عشرت آفرین، ن۔م۔ دانش، ثروت زہرا، عدیل زیدی، قمر حیدر قمر، نذیر اے قمر، پنہاں ریحانہ قمر، ظہور الاسلام، جاوید خالد عرفان، ڈاکٹر صبیحہ صبا جیسے تازہ لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ہماری اعلیٰ روایات کی

نمائندگی کرنے والی شاعرات طلعت اشارت اور عرفانہ عزیز بھی دیارِ غیر میں مقیم ہیں۔ اسی طرح افسانوی ادب کے اہم ناموں میں مصطفیٰ کریم، مقصود الٰہی شیخ، شکیلہ رفیق، محسنہ جیلانی، خالد سہیل، نجم الحسن رضوی، سلطان جمیل نسیم، سہیل ادیب، جاوید دانش اور "وزیرِ اعظم" جیسے ناول کے خالق اشرف شاد بھی دیارِ غیر میں مقیم ہیں۔ دیارِ غیر میں مقیم تین شعراء کے اشعار اس وقت یاد آ رہے ہیں۔

صحراؤں میں عمر ہماری ریت ہوئی
گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیے (یعقوب تصور)

....

ہجرت کا ثمر بھی تو مقدر نہیں اپنا
بے گھر ہوئے ایسے کہ کوئی گھر نہیں اپنا (اشفاق حسین)

....

گمنام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے (شفیق سلیمی)

طنز و مزاح کے حوالے سے خالد عرفان ایک اہم نام ہے وہ بھی دیارِ غیر میں مقیم ہے۔ دیارِ غیر میں پاکستان کی طرح مشاعرے بھی ادب کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ شعراء کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو شاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے ان سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں۔ ادبی رسائل اور کتابوں کے ذریعے جن ادیب و شعراء کی تخلیقات میرے مطالعے میں رہیں اس کی بنیاد پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دیارِ غیر میں مقیم ادیب و شعراء معیاری ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ کسی ایک شہر یا کسی ایک ملک میں نہیں بلکہ بقول احمد مشتاق "اب یہاں کوئی کہیں کوئی نہیں رہتا ہے۔"

ڈاکٹر عذرا شوذب (ملتان)

دیارِ غیر میں تخلیق ہونے والے ادبی سرمائے کی قدر و قیمت عربی، فارسی اور اُردو ہماری مذہبی و تہذیبی زبانیں ہیں۔ اردو زبان بالخصوص عربی و فارسی سے زیادہ مقبول زبان ہے۔ یہ ایک لچک دار اور وسعت پذیر زبان بھی ہے۔ اس کے سفرِ ارتقا میں کئی نازک موڑ آئے مگر اس زبان نے نئی منزلوں کی تلاش کا سفر جاری رکھا ہے۔ پاکستان کے تمام صوبوں میں بولی جانے والی یہ زبان اردو ادب اپنا دائرہ اثر دور دراز کے ملکوں تک بڑھا چکی ہے۔ امریکہ، برطانیہ، چین، ترکی، فرانس، جرمنی، جاپان، مصر، ناروے، سویڈن، آسٹریلیا، سعودی عرب، عرب امارات وغیرہ یعنی دنیا کے قریباً پچاس ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کی وجہ سے ان ملکوں میں اُردو کا خاصا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستان سے بے گھر ہونے والی یہ زبان جس کی جائے پناہ پاکستان ہے بیرونِ پاکستان بسنے والوں کیلئے رابطے کی واحد زبان ہے وہاں برپا ہونے والی مذہبی محفلوں، سیاسی میٹنگوں، معاشرتی جلسوں، تفریحات، عید تہوار اور آپس کی بات چیت کا ذریعہ اُردو زبان ہی ہے۔ ان ملکوں میں بسنے والے ادباء و شعراء نے اردو شعر و ادب کی ترویج کیلئے مختلف تنظیمیں قائم کر لی ہیں۔ بعض نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی دیارِ غیر میں اردو زبان و ادب کی ترویج بنا لیا ہے۔ ان تنظیموں کے تحت منعقدہ ادبی و شعری محافل میں شاندار ادبی و شعری سرمایہ جمع ہوا ہے۔ اس سرمائے کو عظمت و بلندی کے اعتبار سے پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادب کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔ ان ممالک سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و جرائد نے بھی اردو زبان و ادب کے فروغ میں معاونت کی ہے۔ بعض ممالک کی یونیورسٹیوں میں اردو چیئرز قائم ہیں۔ حکومت کی کوششوں سے ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ چیئرز ان ممالک میں اردو زبان و ادب کی وسعت پذیری کا سبب ہیں۔ اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی کیلئے صحت و

فصاحت و زبان کے پرانے معیاروں کو بدلنے اور لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں اور دیگر ممالک میں آباد پاکستانیوں کے دل میں اردو لکھتے ہوئے یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ کسی غیر کی زبان استعمال کر رہے ہیں اور اس احساس کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کے کسی علاقے کے باشندے اردو زبان کے حوالے سے کوئی فوقیت رکھتے ہیں۔ بطور مجموعی پاکستان سے باہر تخلیق ہونے والا ادبی وصحافتی سرمایہ قابلِ قدر ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس سرمائے کو مجتمع کر کے اِس کی تفہیم کے ساتھ حق تنقید بھی ادا کریں۔ اس ادبی سرمائے کو عام پاکستانی قاری تک رسائی دینے کی کوششوں کا آغاز بھی ہونا چاہیے۔ میں اُردو زبان وادب کی طالبہ کے طور پر پاکستان سے باہر قیام پذیر ادباء وشعراء کی تخلیقی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جو نئے اور اچھوتے موضوعات پر نہ صرف کام کرتے ہیں بلکہ ان کوششوں کو کتابی شکل دے کر عام قاری تک ان کی رسائی کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ میں ان کو اِس تازہ تصنیف پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

اپنے ملک میں رہ کر دھرتی ماں کے پیار کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا پردیس میں جا کر ہوتا ہے۔ دیس سے دوری وطن کی بہت سی چیزوں سے پیار کو جنم دیتی ہے۔ جہاں اپنے عزیز واقارب، گھر، شہر، سڑکیں، راستے اور چوراہے یاد آتے ہیں وہاں اپنے دیس کی بولیاں بھی من کے اندر ہی خوشبو بن کر پھوٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ جب دیس کی زبانیں یاد آتی ہیں تو اپنے دیس کے ادب سے پیار بھی جاگ اُٹھتا ہے۔ پردیس میں جہاں اردگرد لوگوں کو اُن کے اپنے دیس کی بولی بولتے دیکھتا ہے تو وہاں کی بولی مجبوری کی خاطر انسان سیکھ تو لیتا ہے مگر پھر وہ اپنے ہم وطنوں کو تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے تا کہ اُن سے کھل کر

باتیں کر سکے۔

ایسے میں انسان کے اندر کا ادیب اور شاعر بھی جاگ اُٹھتا ہے۔ اپنے وطن میں برپا ہونے والی ادبی محفلوں کو یاد کر کے انسان وہاں بھی اپنی محفلیں سجا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک بسنے والے پاکستانی جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنی الگ ادبی دنیا بسا لیتے ہیں۔ ایسی محفلوں میں جان پیدا کرنے کے لئے وہ پاکستان سے بھی نامور ادیبوں او رشاعروں کو بلا لیتے ہیں یوں اُن کا کتھارسس بھی ہو جاتا ہے اور وہ نئی ادبی تبدیلیوں سے روشناس بھی ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ شاعر و ادیب جو بیرون ملک رہتے ہوئے ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ یقیناً لائق تحسین ہے۔ دوبئی، مسقط، عمان، سعودی عرب، برطانیہ، چین، امریکہ، ناروے، جرمنی، کینیڈا وغیرہ بلکہ تقریباً تمام ممالک میں پاکستانی ادیب اردو اور دوسری قومی زبانوں کے ادب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اس سے جہاں اردو اور دوسری قومی زبانوں کو فروغ مل رہا ہے وہاں ان کے من کو تسکین مل رہی ہے کہ وہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلے ہی ماشاءاللہ بہت کام ہو رہا ہے چونکہ بیرون ملک اپنی کتاب چھپوانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے کیونکہ نہ صرف وہاں 'چھپوائی' بہت مہنگی ہے بلکہ وہاں کے پرنٹنگ قوانین بھی سخت ہیں۔ سو پردیسی ادیب پاکستان سے اپنی کتابیں چھپواتے ہیں اور پھر جب وہ پاکستان تشریف لاتے ہیں تو اُن کی تقریب پذیرائی بھی ہو جاتی ہے۔ یوں پردیسی پاکستانیوں اور یہاں مقیم پاکستانیوں کے آپس میں بڑے خوبصورت روابط ہو جاتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اب اس ادبی خدمت کو ایک نئے نظریے سے سوچا جائے کہ ہماری تحریریں کس طرح سے ہمارے ملک کے امیج کو بہتر کر سکتی ہیں کیونکہ ہمارا ملک ایسے کرائسس میں ہے جس سے نکالنے کیلئے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ

مل کر اور اپنے طور بھی ادیبوں اور شاعروں کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہی ہو سکتی ہے کہ جس دیس میں بھی ہمارے ادیب بسیرا کر رہے ہیں وہاں کی قومی زبان میں ان تحریروں کا ترجمہ شائع ہو۔ ایسا ناروے، انگلستان، چین، امریکہ اور دوسرے ممالک میں ہو رہا ہے لیکن اس کو ایک مشن کے طور پر اپنانے کی ضرورت ہے کیونکہ جہاں پر ہم اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں (جو کہ ہندوستان کے ادیب بھی کر سکتے ہیں) وہاں ہمیں اپنے ملک پاکستان کو بھی روشنیوں اور خوشبوؤں سے روشن کرنا اور مہکانا ہے تاکہ دھرتی ماں کا حق ادا ہو سکے۔

ڈاکٹر طارق عزیز (لاہور)

تخلیقی اپج کسی شاعر یا ادیب کے اندر سے پھوٹنے والا وہ جذبہ ہے جو جغرافیائی حدود و قیود کا پابند ہوتا ہے۔ یہ وہ خواہش نمو ہے جس کے نتیجے میں صحراؤں میں پھول کھل اٹھتے ہیں اور پہاڑوں سے چشمے بہہ نکلتے ہیں۔ کوئی شخص شاعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا جس طرح پاکستان میں بسنے والا ہر شخص شاعر یا ادیب نہیں ہے اسی طرح بیرونِ ملک آباد تمام کے تمام پاکستانی بھی ادیب یا شاعر نہیں ہیں۔ یہ تخلیقی صلاحیت عطیۂ خداوندی ہے جسے نصیب ہو سو ہو لہٰذا یہ سمجھنا کہ بیرونِ ملک آباد پاکستانی شاعر یا ادیب اسی کارِ تخلیق کے لیے آمادۂ ہجرت ہوئے درست نہیں۔ یہ ادیب اور شاعر بیرونِ ملک نہ بھی جاتے تو ادیب اور شاعر ہوتے۔ تاہم اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ ان کا بیرونِ ملک آباد ہونا معاشی یا سیاسی مجبوریوں کا نتیجہ تھا جن کی بار آوری کے لیے انہوں نے دن رات ایک کیے رکھا جیسا کہ بقول افتخار عارف:

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

اور اس بنیادی مقصد سفر کے باوجود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نہ تو خوابیدہ ہونے دیا نہ پسِ پشت ڈالا بلکہ یہ تخلیق کار اس اعتبار سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے کہ اپنے ملک میں پائے جانے والی غیر ضروری اور بے مقصد مصروفیات کا سامنا انہیں نہ کرنا پڑا اور بیرونِ ملک میں کارِ معیشت کے آٹھ دس گھنٹوں کے بعد انہیں جو وقت میسر آتا ہے وہ مکمل فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ جس میں ان کی تخلیقی سرگرمیاں مکمل یکسوئی اور بھرپور توانائی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں یہ تو وہ تخلیقی عمل ہے جو کسی بھی جگہ سرانجام پا نا ہی تھا لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان ادیبوں اور شاعروں نے بیرون ملک مختلف ادبی تنظیموں کی تشکیل کر کے ان کے زیرِ اہتمام ادبی تقریبات کے انعقاد کا اہتمام کیا جس میں اردو سمجھنے اور نہ سمجھنے والوں کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے اور یوں علم وادب کے یہ تخلیق کار بیرونی ممالک میں علم وادب کے سفیر بن جاتے ہیں۔

جس طرح کسی دوسرے ملک میں پاکستانی سفارت خانہ وہاں آباد پاکستانی کمیونٹی کے حقوق وسہولیات کا خیال رکھتا ہے بعینہ یہ تخلیق کار اپنی کمیونٹی کے تخلیقی حقوق، سہولیات اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے مختلف امور میں جتے رہتے ہیں اور یوں اس ملک میں اپنی زبان وادب اور تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے جس مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ قابلِ قدر اور لائق صد تحسین ہے۔

تاہم اس ضمن میں چند امور کی طرف توجہ دینا ازبس ضروری ہے۔ بیرون ملک بسنے والے یہ ادیب اور شاعر اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود جس خفیف احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں انہیں اس سے باہر نکلنا چاہیے۔ انہیں ملک میں آباد ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ تخلیقی برابری سطح پر مکالمہ کرنا چاہیے اور حکومتِ پاکستان کے سامنے یہ مطالبہ رکھنا چاہیے کہ پاکستان کے ٹی وی چینلز پر بیرون ملک بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لیے وقت مخصوص کیا جائے تا کہ پاکستان کے قارئین وناظرین ان کی تخلیقی

صلاحیتوں سے آگاہ ہو کر انہیں بطور ادیب و شاعر پہچانیں اور یہاں کے ناشرین ان کی تخلیقی کتب کی اشاعت کا بطور خاص اہتمام کریں۔ یوں اس گلہ کا ازالہ بھی ہو جائے گا کہ بیرونِ ملک سے آنے والے ادیب اور شاعر زرِ مبادلہ کے زور پر اپنی کتابیں چھپواتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ممالک میں ادیبوں اور شاعروں کی مختلف تنظیمیں جو وہاں ادبی تقریبات کا اہتمام کرتی ہیں انہیں چاہیے کہ سال میں ایک آدھ مرتبہ پاکستان کے اندر بھی ادبی تقریب کا اہتمام کیا کریں تاکہ ادیبوں اور شاعروں کا باہمی مکالمہ مزید بامعنی، بامقصد اور بے تکلف انداز میں مکمل ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر مذکورہ بالا معروضات پر حکومت پاکستان اوورسیز پاکستان فاؤنڈیشن اور خود بیرون ملک بسنے والے ادیب اور شاعر توجہ دیں گے تو ادبی سفارت کاری کا یہ فریضہ بطریق احسن سرانجام پائے گا۔

ڈاکٹر پروفیسر افتخار بیگ (لیہ)

ماضی میں اردو زبان برصغیر کے لوگوں کے لئے رابطے کی زبان تھی اور آج یہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے برصغیر کے لوگوں کے لئے رابطے کی زبان ہے۔ آج ذرائع آمد و رفت اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے دنیا سکڑ سمٹ گئی ہے۔ برصغیر کے رہنے والے لوگ (جن میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، سبھی شامل ہیں) اس خطے کی معاشی بدحالی کی وجہ سے یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے علاوہ خلیجی ریاستوں میں اپنے حصے کا رزق تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ دیارِ غیر میں، دوسرے معاشروں میں، جہاں کی ثقافت اور تہذیبی رویے ان لوگوں کے لئے اجنبی ہوتے ہیں، زندگی بسر کرنا کتنا کٹھن اور کتنا جاں گداز ہوتا ہے اس کا حال صرف وہی جانتے ہیں جنہوں نے غربت کا مزہ چکھا ہو۔ جب یہ لوگ اپنے وطن میں ہوتے ہیں تو یقینی طور پر فکری اور جذباتی اعتبار سے کئی زمروں میں تقسیم ہوتے ہیں مثلاً مسلمان، ہندو، بودھ، سکھ...... مثلاً سندھی، پختون،

بلوچ، پنجابی اور سرائیکی...... مگر دیارِ غیر میں ان کے تمام گروہی، علاقائی اور مذہبی تعصبات سے ورا ایک رشتہ پیدا ہوتا ہے اور وہ رشتہ ہے اردو زبان کا۔

اپنے دیس سے دور رہنے والے ان غریب الوطن لوگوں میں جہاں یہ زبان اپنائیت اور یگانگت کا احساس پیدا کرتی ہے، فرد سے فرد کے رشتے کو مضبوط بناتی ہے۔ وہیں یہ زبان فکری اور جذباتی فاصلوں اور مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے تعصبات کو بھی ختم کر دیتی ہے اور جو لوگ دور دیس میں بیٹھ کر اردو شعر و ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ گویا انسانی قدروں کے فروغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اپنی زبان سے محبت کا یہ رویہ بے حد قابلِ ستائش ہے کیونکہ یہ لوگ:

۱۔ اردو زبان کے سفیر ہیں اور دور دراز کے معاشروں میں اردو زبان اور اس زبان سے وابستہ ثقافتی اور تہذیبی رویوں کو متعارف کروانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

۲۔ اُردو زبان و ادب کے دامن میں دوسری تہذیبی اور ثقافتی اکائیوں کے رویوں کو سمونے اور متعارف کروانے کا باعث بن رہے ہیں۔

۳۔ دوسرے معاشروں میں برصغیر کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں موجود ہیں ان کا ازالہ اور سدباب کر رہے ہیں۔

۴۔ مقامی طور پر یعنی برصغیر کی حدود میں (اور بسا اوقات پاکستانی حدود کے اندر) جو گروہی اور لسانی تعصبات موجود ہیں ان کو نارمل کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

لیکن یہ بات بڑی حد تک پریشان کن ہے کہ اردو کے یہ سفیر جو دنیا بھر کے معاشروں میں پھیلے ہوئے ہیں خود بہت سے فکری مغالطوں کا شکار ہیں۔ وطنِ عزیز میں مارشلائی جبر اور مختلف ادوار کی آمریت نے یہاں کے لوگوں کو فکری آزادی سے تہی کر دیا

ہے اور یہ تخلیق کار اور شاعر و ادیب حضرات خود جدید فکری رجحانات اور رویوں کو اپنا دشمن گردانتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر حضرات محض روٹی روزی کے چکر میں مزدوری کرنے بیرونِ ملک جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کی ذہنی پرداخت علمی اور فکری حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ لوگ محض حادثاتی طور پر فکر و فن کی دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ نتیجتاً یہ لوگ ہر شے کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعے اور مشاہدے کی بھی خاص حدود ہوتی ہیں۔ فکری گہرائی اور گیرائی اور وہ بصیرت جو جدید عہد کی ٹوٹتی بکھرتی صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے ان لوگوں کے ہاں پیدا ہی نہیں ہوتی جس طرح وطنِ عزیز میں رہنے والے بہت سے فنکار اردو شعر و ادب کو ایک صدی پرانی روایات کے آئینے میں جانچتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی درسی کتابوں میں کلاسیکی عہد کا مطالعہ کر کے شاعری کا آغاز کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں، ہمارے ہاں بہت سے میرؔ اور بہت سے دردؔ بہت سے داغؔ بہت سے مومنؔ اور کئی غالبؔ بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں بھی شاعری کا ایک بڑا حصہ (خصوصاً غزل میں) آج بھی دردؔ اور میرؔ کے عہد میں سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بیرونِ ملک مقیم لوگوں کے ہاں زیادہ ہے۔

دوسری سطح پر کچھ فکری Taboos ایسے ہیں جنہیں ہمارا تخلیق کار توڑنا نہیں چاہتا کیونکہ اس کا خیال ہے کہ یہی Taboos فکری معراج اور صحیح منہاج ہیں حالانکہ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود خوبصورت بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی کوششوں اور تخلیقات کی وجہ سے اردو زبان کا رس اور رچاؤ آج دنیا بھر کے معاشروں میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ یہ اسی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ اردو کے سفیر اپنی آشفتگی کے باوصف، بس اس زبان کی خدمت کر رہے ہیں اور بہت سے نئے فکری زاویوں کی پرداخت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید

شبیہ الحسن نے ان احباب کی قدر افزائی کر کے اُردو زبان وادب پر احسان کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد (لاہور)

اُردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے پاکستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے لیکن اس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ سر دست میرے دھیان میں اُن غریب الوطن لوگوں کے چہرے اُبھر رہے ہیں جنہوں نے اپنی اقتصادی مجبوریوں کے تحت اپنی مٹی سے جدائی کے ستم جھیلے اور اجنبی سرزمینوں میں تلاشِ رزق کے امکان پیدا کیے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تخلیقی اُفتاد نے قلم وقرطاس سے بھی اپنے تعلق کو خوب نبھایا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی تازہ کتاب کو انہی پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے ذکر سے مہکایا ہے جو وطن سے دُور بیٹھ کر اُردو شعر ونثر میں کارہائے تخلیق انجام دے رہے ہیں۔ یہ سفیرانِ ادب اپنی اپنی سطح پر جو کام کر رہے ہیں انہیں اُردو ادب کے مرکزی دھارے میں لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اُن کے تجربات اور مشاہدات کی دنیا پاکستان میں بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسی طرح اُن کے یہاں جذبے اور احساس نے جس طور ہجر زدہ کیفیتوں کو لفظوں میں رچانے کی سعی کی ہے وہ ہمارے یہاں کم کم نظر آتی ہے۔ ۲۰۰۸ء میں مجھے دو ماہ کے لیے برطانیہ میں قیام کا موقع ملا۔ میرے سفر کی نوعیت اگرچہ اُن لوگوں سے مختلف تھی جو ادب کے نام پر بعض دیگر مقاصد (جو اُن کے نزدیک سفر وسیلۂ ظفر کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں) کی تکمیل کے لیے باہر جاتے ہیں۔ تاہم اس سفر کے دوران میں مجھے ادیبوں اور شاعروں کے ایسے حلقے میں اٹھنے بیٹھنے کے مواقع میسر آئے جن کے چہرے روحانیت کے نُور سے مستنیر اور دل والہانہ محبت سے سرشار تھے۔ یہی روشنی اور محبت اُن کے لفظوں میں بھی باہم آمیز ہو کر اپنی کرشمہ سازیوں کی جھلک دکھاتی تھی۔ لندن میں ایک عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جس میں لندن کے اُردو شعرا میں جناب عطا الجیب راشد، جناب عبدالسلام ظافر، جناب مبارک احمد ظفر، جناب مبارک احمد صدیقی، جناب آصف محمود باسط، جناب فاروق محمود، جناب سید ناصر دہلوی، جناب ڈاکٹر محمد جلال شمس اور جناب مقصود الحق شامل ہوئے جبکہ برمنگھم سے جناب سید نصیر احمد شاہ اور جناب آدم چغتائی شریک ہوئے۔ کینیڈا سے جناب ڈاکٹر پرویز پروازی، ہالینڈ سے جناب جمیل الرحمٰن، ناروے سے جناب خواجہ عبدالمومن اور جرمنی سے جناب عبدالجلیل عباد نے مشاعرے میں شرکت کی۔ اِن اصحاب فن کے کلام کو سُن کر یہ اندازہ ہوا کہ بیرونی ممالک میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل نہایت درخشاں اور روشن ہے۔ ان میں بعض شاعروں کے یہاں تو زبان کو برتنے اور اسے فنی قالب میں ڈھالنے کا ایسا قرینہ اور سلیقہ نظر آیا جو اُردو کے مراکز میں بیٹھ کر کارِ تخلیق انجام دینے والوں کے یہاں بھی خال خال نظر آتا ہے۔ بریڈفورڈ کے مشاعرے میں بھی یہی صورت نظر آئی۔ وہاں پر ادبی محافل کے کرتا دھرتا عبدالباری ملک نے جو سجا سجائی اس میں اہلِ ذوق خواتین و حضرات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ گلاسگو کے مشاعرے میں اُردو میں لکھنے والوں سے ملاقات ہوئی تو یہ احساس ہوا کہ سکاٹ لینڈ کے اِس شہر میں اُردو سے محبت کرنے والے کس طرح اپنی زبان اور ادب کو سینوں میں سجائے ہوئے ہیں۔

۲۰۰۸ء ہی میں اکتوبر کے مہینے میں کینیڈا کے شہر ٹورانٹو جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ سفر پاکستان اور کینیڈا کے اشتراک سے سیڈا کے تحت ترتیب دیا گیا تھا جس میں یونیورسٹی آف ایجوکیشن کی نمائندگی میرے ذمے تھی۔ یونیورسٹی آف ٹورانٹو میں تو اُردو زبان و ادب کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے۔ دُور دُور تک کہیں اُردو بولنے والا دکھائی نہ دیتا تھا لیکن ٹورانٹو میں اپنی آمد کے دوسرے روز استادِ گرامی ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب کو فون پر اطلاع دی تو گویا دبستان کھل گیا۔ ڈاکٹر صاحب ٹورانٹو کے نواحی شہر مسی ساگا میں مقیم ہیں اور ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں۔ اُردو آپ بیتی پر انہوں نے جو تحقیقی و تنقیدی کام

کیا ہے، ہمارے ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس موضوع پر ان کی دو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی آپ بیتی شائع ہوتی ہے تو ان کی نظر میں رہتی ہے۔ اردو زبان میں شاید ہی کوئی آپ بیتی ہوگی جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اس کے علاوہ بہت سے تراجم بھی ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ خوبصورت شعر کہتے ہیں جن میں روایت اور جدت کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ میرے پرانے دوست رحمان ہاشمی بھی مسی ساگا میں ہیں۔ ان کے ساتھ ہم زمانہ طالب علمی میں کالجوں میں مشاعرے پڑھا کرتے تھے۔ اس دور میں ان کی ایک نظم "ماں" بہت مقبول ہوئی تھی۔ جسے ہم اکثر فرمائش کر کے سُنا کرتے تھے۔ مسی ساگا میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں اُردو شاعری کے بہت سے گوہر ہائے نایاب کو سننے کا موقع ملا۔ رشید ندیم، افضال احمد نوید، رفیع رضا، اکرم ثابت اور مظفر منصور نمایاں لہجہ رکھنے والے نوجوان شاعر ہیں۔ خصوصاً افضال احمد نوید اور رفیع رضا کی شاعری نے بہت متاثر کیا۔ افضال احمد نوید ہمارے نظم گو شاعر اور نقاد ڈاکٹر ابرار احمد کے چھوٹے بھائی ہیں۔ غزل میں ہمارے جدید کہنے والوں میں وہ بہت آگے ہیں۔

بعد میں رشید ندیم کے گھر ایک نشست جمی جس میں افضال نوید اور رفیع رضا کی بہت سی چیزیں سننے کا موقع ملا۔ مسی ساگا ہی میں انجینئر مبشر خورشید بہت عمدہ شاعری کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کا ایک مجموعہ بھی عنایت کیا۔ جرمنی میں مقیم طاہر مجید پاکستان میں محکمہ اطلاعات سے وابستہ تھے۔ گذشتہ کئی برس سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ لندن میں ان سے بھی ملاقات رہی۔ بہت عمدہ شعر کہتے ہیں ان کا مجموعہ کلام "خوشبو کا سفر" شائع ہو چکا ہے۔ اکرم محمود اور احمد مبارک امریکہ میں ہیں۔ حبیب الرحمٰن ساحر بھی امریکہ میں ہیں اور اُردو شاعری کی ترویج و ترقی میں بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔

اُردو زبان و ادب کے مراکز سے دُور رہ کر ان ادبا اور شعرا نے اُردو کے حوالے سے علم و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان پر یہ سب داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ اس وقت

جبکہ پاکستان میں اُردو زبان پر زوال پذیری کا وقت ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اُردو زبان کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا جا چکا ہے۔ یہاں تک کہ اسے ایک قومی اور سرکاری زبان کے طور پر بھی قبول کرنے میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں، پاکستان سے باہر بسنے والے پاکستانی آج بھی اسے اپنی شناخت کا وسیلہ بنائے ہوئے ہیں اور ادبی اور علمی سطح پر اسے مضبوط بنانے میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ ہمیں اپنے ان غریب الوطن سفیرانِ ادب کی بھرپور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ ان کے مضامین میں نظم و نثر کو پاکستان کے ادبی رسائل اور دیگر جرائد میں جگہ ملنی چاہیے اور نقادوں کو ان کی تحریروں کا نوٹس لینا چاہیے۔

ڈاکٹر طارق زیدی (لاہور)

اپنے لسانی علاقے سے جدا ہو کر اپنی زبان میں تخلیق کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن اس کام کو سفارت وغیرہ اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس طرح اُس علاقے کے لوگوں کو اِس زبان و بیان سے نہ شناسائی ہوتی ہے اور نہ دلچسپی۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہ خبر پڑھتے ہوں گے کہ فلاں زبان کے شعرا اکٹھے ہوئے۔ اس سے زیادہ سفارت کا کام مترجم کرتا ہے۔ وہ کسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرے یا اردو کا ترجمہ کسی اور زبان میں کرے۔

محض علاقہ بدل جانے سے اگر کوئی شاعر اہم ہو جائے تو اس کے معنی یقیناً یہ ہوں گے کہ اس کی کوئی ایک جہت ہی اہم ہے ورنہ اہمیت علاقائی حدود کی اسیر نہیں ہوتی۔ کم از کم اس زبان کے تمام علاقوں کے لیے اہم ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اردو کے لسانی علاقے میں بھی جہاں اہم شاعر ہیں وہاں غیر اہم شاعر بھی ہیں اور یہی بات دوسری جگہوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم (لاہور)

۱۔ اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کے فروغ، ترویج اور توسیع میں مثبت کردار ادا کر رہے ہیں اُن کی وجہ سے اردو زبان و ادب کو دیارِ غیر میں اجنبیت اور غیریت کا سامنا نہیں ہے۔ ہمیں اُن کے مثبت کردار کو سراہنا چاہیے۔

۲۔ وطن سے دُوری اور غریب الوطنی کا شدید احساس اُن کی تخلیقات میں یقیناً موجود ہے۔ وطن سے وابستگی کا یہی جذبہ اور اس جذبے کی آنچ اُن کی تخلیقات کی نمایاں شناخت ہے۔

۳۔ تمام تخلیق کاروں کا معیار یقیناً ایک جیسا نہیں ہے بیشتر تخلیقات میں تخلیقی ترفع کی کمی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

۴۔ مکمل اطمینان کا اظہار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اُن کے احساس کے نقوش تیز اور تیکھے ہیں مگر تخلیقی گہرائی موجود نہیں ہے۔

۵۔ انہیں کلاسیکی اور معیاری معاصر ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اُن کے مطالعے میں جتنی وسعت آئے گی تخلیقات میں اُتنی Depth پیدا ہوتی جائے گی۔

ڈاکٹر ریاض قدیر (لاہور)

اردو کی ترویج و ترقی کے لیے بیرونِ ملک مقیم اردو ادباء و شعراء کی خدمات دو لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اولاً اردو زبان کو عالمی سطح پر متعارف کروانا اور اردو خواں طبقے کی تعداد میں اضافہ کرنا۔ ثانیاً عالمگیریت (Global Issues) کو اردو

زبان وادب کا حصہ بنانا۔

بیرونِ ملک مقیم ادبا و شعرا اس لحاظ سے تحسین کے مستحق ہیں کہ وہ اجنبی فضاؤں میں اردو کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ میری ناقص رائے میں ان ادبا و شعرا کو اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کے لیے اردو زبان کو اپنائے رکھنا چاہیے تاکہ اردو زبان وادب میں مختلف دیاروں کی بو باس جذب ہو کر اسے ایک عالمگیر زبان کے درجے تک پہنچا دے۔

ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی (لاہور)

تخلیق کار کا اندرون ملک یا بیرونِ ملک مقیم ہونا اتنا اہم نہیں جتنا اس کا حقیقی (Genuine) تخلیق کار ہونا ہے۔ سچا ادیب اپنے ملک میں ہو یا دیارِ غیر میں، اس کی تخلیقی صلاحیت اظہار کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لیتی ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو قوت متخیلہ کی وادی اس کے جذبات و احساسات اور مشاہدات کو اپنے دامن میں سمانے کی منتظر رہتی ہے اگر وہ نثر نگار ہے تو یہی جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات، افسانے، ناول، ڈرامے یا انشائیے کی صورت میں منظرِ عام پر آ جاتے ہیں۔

گذشتہ چند دہائیوں سے تو ہر پاکستانی کے لیے یورپ ایک جنت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ کوئی ملازمت کے لیے تو کوئی حصولِ تعلیم کی غرض سے دیارِ غیر ہی کا انتخاب کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان منچلوں نے کہیں سے یہ شعر سُن لیا ہے کہ:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

اب حال یہ ہے کہ لڑکا ہو تو اسے غیر ملکی لڑکی اور لڑکی ہے تو اسے بیرونِ ملک مقیم لڑکا ہی پسند آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس خواہش نے لڑکوں کو غلام بنا دیا اور لڑکیوں کو شادی

شدہ شوہر بھی عطا کیے ہیں۔

بیرون ملک مقیم افراد میں ہر قماش اور ہر ذوق کے افراد شامل ہیں۔ بعض ممالک میں تو پاکستانیوں کی اتنی کثرت ہے کہ وہاں چھوٹے چھوٹے پاکستان بن چکے ہیں اور پاکستانی ثقافت کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ ان پاکستانیوں میں شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنے کسی ہم وطن اہلِ قلم سے ملتے ہیں تو اس کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کچھ یہی منظر ہمارے ہاں بھی دیکھا جاتا ہے اور بیرون ملک سے آنے والے پاکستانی اہلِ قلم کی پذیرائی کے لیے محافل سجائی جاتی ہیں۔ ان اہلِ قلم کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بیرون ملک مقیم اہلِ قلم جن میں مرد و زن بھی شامل ہیں۔ عدیم الفرصتی کے باوجود پرورش لوح و قلم کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں۔

ان منظوم و منثور تخلیقات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم ان تخلیقات کی ہے جن میں وطن کی مٹی کی خوشبو مہک رہی ہے اور دیارِ غیر کی رنگا رنگ زندگی کے جذبہ حب لوطنی کے چراغ کی لو کو مدھم نہیں کر سکی۔

دوسری وہ تخلیقات ہیں جو ان ممالک کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہیں جہاں پاکستانی آباد ہیں ان میں زیادہ تر افسانے ہیں جن سے ان ممالک کے بارے میں آگہی حاصل ہوتی ہے۔

تیسری تخلیقات میں پاکستانی معاشرہ کے مسائل اور بیرون ملک بسنے والوں کی زندگی یکجا نظر آتی ہے۔ گویا ہمارے اہلِ قلم بیرون ملک رہتے ہوئے ایک طرف اپنے وطن کے فرسودہ رسوم رواج کی بیخ کنی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں تو دوسری طرف مغرب کی ثقافت کا پردہ چاک کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی قبیل کا ایک افسانہ دو دہائی قبل افسانہ نگار کی زبان سے سننے کا موقع میسر آیا۔

''افسانے کا مرکزی کردار ایک ایسا پاکستانی ہے جو والدہ کی ان پڑھ اور بد سلیقہ بیٹی سے شادی تو کر لیتا ہے لیکن ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث دیارِ غیر کا رُخ کرتا ہے۔ کئی سال بعد ایک صبح دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے تو سامنے اس کی بیوی سفید برقع میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔ ابھی وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا کہ بیوی نے سفید کپڑے کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیا جس پر لکھا تھا ''بیٹا یہ مرے کفن کا ٹکڑا ہے تجھے ماں کے کفن کا واسطہ اپنی بیوی کو بسا لے۔ ماں کی وصیت مان کر اس نے بیوی کو اپنا لیا۔ اس کے ہمسائے نے جب اس کی بیوی کا حلیہ دیکھا تو زیرِ لب مسکرا دیا۔ دن گزرنے لگے وہ تین بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔

اچانک زندگی نے پلٹا کھایا۔ بیوی نے طلاق لے لی۔ بڑی بیٹیاں بھی اپنے اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گھر سے رخصت ہو گئیں۔ چھوٹی بیٹی اس کے پاس تھی۔ اس کی خوشی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ ایک شام بیوی آئی اور بولی دونوں بیٹیوں کی طرح یہ بھی تمہاری بیٹی نہیں دیکھو اس کی آنکھیں مائیکل سے کتنی ملتی ہیں۔

اس طرح کے آئینے تخلیق کرنے والے اہلِ قلم لائقِ صد تحسین ہیں۔ ممکن ہے بیرونِ ملک مقیم اسے محض اتفاق قرار دیں اور پاکستانی اسے ایک افسانہ سمجھ کر ٹال دیں لیکن مغربی معاشرت کی عکاسی کرنے والے ادیبوں کو اپنی سی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

بیرون ملک مقیم پاکستانی اہلِ قلم جہاں مختلف اصنافِ نظم ونثر کی آبیاری میں مصروف ہیں وہاں وہ اردو زبان کی ترویج اور اس کے ارتقا کے حوالے سے بھی بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر اور موبائل فون پر پیغامات بھیجنے کے لیے رومن کا استعمال عام ہے اور بیرون ملک بسنے والوں نے اردو رسم الخط کے جنازے پر آنسو بہاتے ہوئے یہ عذر پیش

کیا ہے کہ اس طرح زبان تو کم از کم بچ ہی جائے گی اور یہ بھول گئے کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہر حال بہتر ہوتی ہے۔ اردو زبان کا تشخص اس کے رسم الخط سے ہے اور بیرونِ ملک مقیم اہلِ قلم اردو زبان کے رسم الخط کے تحفظ کا فرض کفایہ بڑی محنت سے انجام دے رہے ہیں۔

لندن میں مقیم ایک پاکستانی شاعر پاکستان تشریف لائے اور ان کی زبان سے ایک مزاحیہ پنجابی نظم سننے کو ملی۔ ایک شعر حافظے میں رہ گیا آپ بھی سُن لیجیے :

جناں پیتیاں شراباں او ستے پئے نے
جیویں رات دے جاگے ہوئے گتے پئے نے

اس ایک شعر نے دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کی معاشرت کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ گرچہ یہ مغرب کی مجموعی معاشرت کی عکاسی بھی ہے۔

جہاں تک بیرون ملک مقیم اہلِ قلم کی ذمہ داری کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ہمیں شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ بیشتر اہلِ قلم نہایت سلیقے اور سنجیدگی سے یہ ذمہ داری نباہ رہے ہیں۔ تاہم 9/11 کے بعد پاکستان اور پاکستانیوں کے بارے میں دنیا کے میڈیا نے جو مہم چلائی ہے اس کی وجہ سے ہر پاکستانی کو دہشت گرد سمجھ لیا گیا ہے۔ اب سبز پاسپورٹ ایک گالی بن کر رہ گیا ہے۔ اسلامی نام رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی ناپاک لیکن کامیاب سازش کے نتیجے میں پاکستان کا تشخص بُری طرح مجروح ہوا ہے۔

ان حالات میں بیرون ملک مقیم پاکستانی اہلِ قلم کی ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ایسی نظموں اور ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جو دنیا کو حقیقت حال سے آگاہ کر سکیں۔

ایک اور انتہائی نازک گھمبیر مسئلہ ان افراد کا ہے جو غیر قانونی تارکین وطن کہلاتے ہیں۔ یہ عرصہ دراز سے بر آنے والے دن کا استقبال اس اُمید پر کرتے ہیں کہ

انہیں ''نیشنلٹی'' کی نعمت عظمیٰ ضرور حاصل ہوگی لیکن ہر شام ان کی اُمید کا سورج مایوسی اور نا امیدی کے اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ بدقسمت اپنوں کے دُکھ درد میں شامل نہیں ہو سکتے۔ انہیں یہ خوف بُری طرح دامن گیر ہے کہ اگر وہ ایک بار پاکستان آ گئے تو پھر واپس جانا ممکن نہ ہوگا۔ والدین کی آنکھیں ان کا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی اہل قلم روز افزوں بڑھتے ہوئے مسائل کا ادراک کرتے ہوئے انہیں اپنی نگارشات میں جگہ ضرور دیں گے۔

ڈاکٹر ضیاالحسن (لاہور)

پاکستان میں یورپ و امریکہ میں مقیم اُردو لکھنے والے ادیبوں کے بارے میں دو طرح کی آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے گزشتہ بیس پچیس سالوں میں بنی ہے، جب سے پاکستان کے دوسرے درجے کے شاعر یورپ و امریکہ میں مشاعرے پڑھنے کے لیے جانے لگے ہیں۔ یہ شاعر دوسرے درجے سے زیادہ دو نمبر شاعر ہیں جنھوں نے وہاں بھی اپنے جیسے غیر تخلیقی افراد تلاش کیے جو ادب کے میدان میں سرمایہ کاری کر سکتے ہوں۔ وہ ان سرمایہ کاروں کے لیے شاعری جیسی منظومات کا بندوبست کرتے ہیں اور ان کی اشاعت کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔ یوں دونوں تخلیق نا آشنا گروہوں کا کام چلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں کوئی نیا شاعر ان خطوں سے اچانک وارد کرتا ہے تو سب سے پہلے یہ خیال آتا ہے کہ اس کے پیچھے شعر گر کون ہے۔

دوسری رائے ان اردو ادیبوں کے بارے میں ہے جو یا تو ان خطوں میں جانے سے پہلے ہی بطور ادیب اپنی پہچان مستحکم کر چکے تھے یا انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے کام سے اردو کے سنجیدہ قاری کو متوجہ کیا۔ اصل میں یہی وہ شعرا و ادبا ہیں جنھوں نے اُردو ادب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ ان میں شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی ہیں، خاص طور پر فکشن والوں

نے مشرق و مغرب کی معاشرت کے تضاد سے ایک نیا اسلوب دریافت کیا جس نے اردو نثر کے اسالیب میں متعدد اضافے کیے۔ ان کی تخلیقات سے محض دو مختلف تہذیبوں کے موازنے کی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ دو مختلف نظام ہائے زندگی اور نظریہ ہائے حیات کا تقابل بھی ہوتا ہے۔ اس سے صرف یہ فائدہ ہی نہیں ہوا کہ اردو ادب کے موضوعات و اسالیب میں تنوع پیدا ہوا بلکہ ہمیں اپنی زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویہ اور اک نیا تفکر بھی میسر آ رہا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان صاحبِ فکر و اسلوب ادیبوں کے نام سے ہماری زندگی اور ادب لوگوں میں فکری و فنی دونوں حوالوں سے وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح کے ادیبوں میں شاعری میں ن۔م۔ راشد اور فکشن میں عبداللہ حسین جیسے بڑے اردو ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ ان کے بعد شاعروں اور نثر نگاروں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جن کے نام گنوانے کا مطلب محض فہرست سازی ہوگا اور جو غیر ضروری ہے۔ میرا مقصود محض ان سنجیدہ اور صاحبِ فن لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے اور ادب میں ان کی اہمیت کو سمجھنا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یورپ و امریکہ میں اردو ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کی خدمات بیش بہا ہیں اور انہوں نے ہمارے ادب میں موضوعاتی و اسلوبیاتی حوالے سے بہت سے اضافے کیے ہیں۔

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

ڈاکٹر شبیہ الحسن اس لحاظ سے قابلِ قدر نقاد ہیں کہ وہ ہمیشہ پسماندہ اور دُور افتادہ علاقوں میں مقیم اہلِ قلم کی تخلیقی کاوشوں کو قارئین تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اہلِ قلم لاہور، کراچی اور اسلام آباد جیسے بڑے اور مرکزی شہروں سے دُور ہوں یا سات سمندر پار ڈاکٹر صاحب کی نظر انہیں بہر صورت ڈھونڈ لیتی ہے۔ اگرچہ اب کی بار انہوں نے ایک اہم موضوع پر قلم اُٹھانے کا بیڑا اٹھایا ہے مگر یہ کام ہر لحاظ سے مشکل اور "غیر منافع

بخش'' ہے کہ اولاً بیرون ملک مقیم اہلِ قلم کی تخلیقی کاوشوں تک رسائی اور ثانیاً ان تخلیقات میں سے ''اصلی اور نقلی'' کو الگ کرنا خاصا دشوار اور فساد برپا کرنے والا کام ہے۔ علاوہ ازیں بیرون ملک آباد اردو اہلِ قلم کا عدم تعاون پر مبنی رویہ بھی خاصا حوصلہ شکن ہوتا ہے کہ مجھے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے ''اردو ادب یورپ اور امریکہ میں'' کی تکمیل کے دوران اس کا عملی تجربہ ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود میں اپنے بھائی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

جہاں تک ان کے اس سوال کا تعلق ہے کہ بیرون ملک مقیم اردو اہلِ قلم شعروادب کی ترویج میں کس حد تک مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں میں صرف اس قدر کہوں گا کہ بیرونی دنیا میں اردو کے جینوئین ادیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور بیشتر ''اہلِ قلم'' تو ''بہروپیے'' ہیں اور ان کے کریڈٹ پر اصل ادیبوں سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ان بہروپیوں نے پاک وہند میں کرائے کے ''منشی'' پال رکھے ہیں جو مسلسل ''طلب'' کو ''رسد'' بھیج رہے ہیں۔ رہی بات اردو زبان کی تحریروں سے وطن کی خوشبو آنے کی، تو جناب ان میں چند ہی اعلیٰ پائے کے فنکار ایسے ہیں جن کی تحریروں سے مغربی سرزمین، وہاں کے باشندوں کے مسائل، موسموں اور انسانی سرگرمیوں کی ''خوشبو'' آتی ہے ورنہ بیشتر اردو اہل قلم کی تحریروں سے مغرب میں سالہا سال سے آباد ہو چکنے کے باوجود بھی ابھی تک آبائی سرزمینوں ہی کی ''بو'' آرہی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ بیرون ملک جا بسنے سے قبل بیشتر اہلِ قلم کی ''ثقافتی تربیت'' مکمل ہو چکی تھی اور وہاں پہنچ کر بھی ان حضرات نے ان معاشروں کی طرف کھلنے والی ذہنی کھڑکیاں بند ہی رکھی ہیں اور یوں ایک ثقافتی آویزش نے جنم لیا جس کے نتیجے میں صرف وطن کی خوشبو رہ گئی اور ''نئے وطنوں'' کی خوشبو ان کی تحریروں سے محروم ہی رہی۔

رہا بیرونی ادیبوں کی تحریروں کا ادبی معیار، میرے خیال میں جو جینوئن اور سچے

ادیب ہیں ان کی تحریروں کا معیار خاصا بلند ہے۔ شاعری یہاں بھی تھوک کے حساب سے ہو رہی ہے اور وہاں بھی مگر اچھے شعر کے لیے یہاں بھی آنکھیں ترس رہی ہیں اور وہاں بھی۔ پھر بھی ساقی فاروقی اور احمد مشتاق کا دمِ غنیمت ہے البتہ فکشن کے حوالے سے جتندر بلو، قیصر تمکین، ہرچرن چاولہ، عبداللہ حسین، رضیہ فصیح احمد، نعیمہ ضیاالدین، مصطفیٰ کریم اور بعض دوسرے ادیبوں نے اعلیٰ پائے کی تخلیقات پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر شبیر احمد قادری (فیصل آباد)

بیرونِ ملک مقیم اہلِ قلم اِس اعتبار سے قابلِ قدر ہیں کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات اور ہر دم رواں پیہم رواں زندگی میں سے وقت نکال کر فروغِ ادب کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ بیرونِ ملک ہر پاکستانی، وطنِ عزیز کا غیر سرکاری سفیر ہے۔ ملکوں کی سرحدیں ہوتی ہیں اُن کا احترام کیا جانا چاہیے مگر ادب کو سرحدوں کا پابند کرنے کی کوششیں تاحال کامیاب نہیں ہو سکیں۔ یُوں تو ہر ملک کے اہلِ قلم کی مجموعی تخلیقات کا کچھ حصہ اپنے اپنے ملک، اس کی آزادی، اس کے تحفظ اور استحکام کے جذبات پر مبنی ہوتا ہے لیکن تخلیقی ادب کا زیادہ حصہ انسانیت سے محبت کا امین ہوتا ہے۔ اپنی دھرتی، اپنے ملک سے محبت کا جذبہ قابلِ احترام ہے لیکن انسان کے ساتھ محبت و مودّت کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کو دوسرے مذاہب اور دوسری رنگ و نسل اور ذات کے لوگوں سے ملنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اس لیے، دیکھا یہ گیا ہے کہ اُن کی نظر میں اتنی ہی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ وسعت اور پھیلاؤ کا یہ احساس اُن کی تخلیقات میں بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بھرپور مطالعہ اور عمیق مطالعہ اس عمل کو مزید استحکام بخشنے کا وسیلہ بنتا ہے۔

ماضی میں بیرونی ممالک میں اردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں کی کتابوں کا

سرمایہ کم تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب اردو اور پاکستانی زبانوں کی کتب چھوٹی موٹی لائبریریوں کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ کتابوں کا یہ سرمایہ ان سفیرانِ اردو کی نئی نسل کو اپنی اصل سے متعارف کرانے کا بڑا موثر وسیلہ ہے۔

مغربی اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں پاکستانی بڑی تعداد میں مقیم ہیں۔ یہ گویا تلاشِ رزق میں نکلے ہوئے پرندے ہیں۔ ان میں سے بعض پرندے دانہ دُنکا چگنے کے بعد اپنے وطن لوٹ آتے ہیں اور بعض وہیں اپنے گھونسلے بنا لیتے ہیں۔ بیرونِ ملک ایک مدت تک قیام کرنے والے ایک پاکستانی، شفیق سلیمی نے وطنِ عزیز کی پاک دھرتی پر قدم رکھا تو اپنے آپ ہی سے سوال کرنے لگے تھے کہ

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

وطن سے دوری کے لمحات بڑے کرب خیز اور اذیت ناک ہوتے ہیں۔ غریب الوطن وہاں وطن سے آنے والی چٹھیوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ٹیلی فون کالز، موبائل فونز، میسج اور انٹرنیٹ اپنے پیاروں کی خبر لاتے ہیں مگر تنہائی کا سانپ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ڈسنے لگتا ہے۔ اس بے زبان احساس کو اہلِ قلم ہی زبان عطا کرتے ہیں۔ گاہ شعر کہہ کر گاہ افسانہ یا ناول لکھ کر، کبھی مضمون لکھ کر اور کبھی ڈرامہ نگاری کے ذریعے۔ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں نے حمد و نعت، سیرت نگاری اور مرثیہ گوئی میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔

بیرونی ممالک میں مقیم اہلِ قلم، میرے نزدیک ادب کی تاریخ میں اپنے لیے علیحدہ باب کا استحقاق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وطن جیسی سہولتیں میسر نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ خاص طور پر مغربی ممالک میں دوسرے درجے کا شہری ہونے کے باوجود بعض سفیرانِ اردو نے اول درجے کا ادب تخلیق کیا ہے۔

یہاں میں بیرونی ممالک میں مقیم سفارت خانوں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کراؤں گا کہ وہ اپنے اپنے ملک میں رہنے والے پاکستانی ادیبوں کے لیے متعلقہ اور ضروری بنیادی سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنائیں تا کہ دنیا بھر کے انسانوں اور زبانوں کے درمیان آفاقی جذبوں کو مزید استحکام بخشا جا سکے۔

میں محترم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی خدمت میں ہدیہ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک اور اہم مگر نظر انداز کیے جا چکے شعبہ کے حوالے سے نہ صرف ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (شمارہ دسمبر ۲۰۰۹ء) کا سفیرانِ اردو نمبر شائع کیا بلکہ اِسی موضوع پر ایک کتاب بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ آفریں صد آفریں۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک (لاہور)

یہ امر ہر طرح کے شک و شبے سے بالا ہے کہ کسی بھی قوم و ملک کے سب سے مؤثر و معتبر سفیر اس کے قلم کار ہوتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے سیاسی جعل سازوں اور رنگ بازوں کی لاختتم حماقتوں، دور نااندیشیوں اور لامحدود مالی ہوس نے وطنِ عزیز کو بدنامی و بدقسمتی کی آخری دیوار سے لگا دیا ہے۔ شاد عظیم آبادی نے کسی زمانے میں سچ کہا تھا کہ :

مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

یہی وجہ ہے کہ ہمارا کوئی بھی سیاست دان اپنے پیٹ کے کنویں سے باہر نہ نکل سکا اور نتیجتاً لسانیات وادبیات کا محل تعمیر ہونے کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ اس سیاسی ماحول کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس ہوس انگیز ماحول کے اثرات ہمارے قلم کاروں نے بھی قبول کرنا شروع کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے بے شمار متحرک و متبرک شاعر ادیب مختلف سیاسی

جماعتوں اور شخصیات کی گود میں جا بیٹھے۔ اس طرح صریرِ خامہ سے اٹھنے والی نوائے سروش، صدائے مدہوش اور ادائے خود فروش کے تابع ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی قومی زبان کے فروغ و نفاذ اور ادبی اقدار کے تحفظ و ارتقا کے لیے ہمارے پرکھوں نے جو خواب دیکھ رکھے تھے وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

ان حالات میں بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کا دم غنیمت ہے، جو دیارِ غیر میں قومی زبان و ادب و ثقافت کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ لیکن وہاں بھی کچھ عرصے سے یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ زبان و ادب کی خدمت کا سارا جذبہ کاروباری مشاعروں تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ جس کا زبان و ادب پہ تو جو اثر پڑنا تھا سو پڑا، یہ بھی مشاہدے میں آیا کہ ہمارے ہاں بیرونِ ملک مشاعرہ پڑھنے کی ہوس میں مبتلا شعرا کا ایک مخصوص طبقہ غیرت، انا اور خودداری کی ساری منزلیں جس سرعت سے طے کرتا چلا گیا، یہ ایک الگ داستان ہے، لیکن فی الحال اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اردو زبان جو دنیا بھر میں بولی جانے والی سات ہزار زبانوں میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر آتی ہے اس کا اہلِ دنیا کے سامنے نہ صرف بہتر تعارف کروانے کی ضرورت ہے بلکہ اس زبان میں تخلیق کردہ ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے اور دوسری زبانوں میں جنم لینے والے شاہ پاروں کو اردو کا قالب پہنانے کی اشد ضرورت ہے۔ جو بیرونِ ملک مقیم پاکستانی بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ ہمیں ان کے اردو پروری کے کسی ایسے ہی اقدام کا انتظار ہے۔

ڈاکٹر محمد ہارون قادر (لاہور)

اُردو ادب کے حوالے اُردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا کے لئے ہر لمحہ سرگرم عمل رہے ہیں۔ پاکستان کے ادیب و شعرا ملکی سطح پر مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت کی صورت میں اپنی خدمات کی داد وصول کرتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک

رہائش پذیر دانشور بھی اُردو ادب کے فروغ وارتقا میں بھرپور حصہ لے کر" اُردو شعر و ادب کے سفیر" ہونے کا مکمل ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ ہمارے وہ غیر ملکی احباب وطن سے دور رہ کر بھی زبان کے ناتے سے ہمارے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح پاکستان میں رہ کر پاکستانی ادیبوں، شاعروں کی تحریروں میں وطن کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی محسوس ہوتی ہے اُسی طرح مختلف ممالک میں رہائش پذیر پاکستانی بھی اُردو ادب کی ترقی کے لئے بہتر خدمات انجام دے کر وطن کی مٹی کے ساتھ محبت رکھنے کا بھرپور طریقے سے حق ادا کر رہے ہیں۔

اُن کی تخلیقات بیرون ملک کے دانشوروں کو پاکستانی تہذیب وثقافت، حالات و احوال کی آگاہی میں انتہائی مثبت کردار ادا کر رہی ہیں۔ وسائل کی کم یابی کے باوجود اُن کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تخلیقات کا معیار کسی صورت بھی اپنے ہم وطن دانشوروں سے کم نہیں ہے۔ اس بات کی دلیل میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ" فاصلے تو کبھی بھی جذبات کو کم نہیں کر سکتے بلکہ دُوری محبت و ایثار کے جذبے کو دو چند کر دیتی ہے۔"

بیرون ملک مقیم دانشوروں نے جہاں تک اپنے ساتھی دانشوروں کے ساتھ مل بیٹھ کر اپنے دُکھ سکھ کی سانجھ بنائی ہوئی ہے وہاں اُنھیں یہ بھی چاہیے کہ وہ اپنے آبائی ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اُن کی تخلیقات کے ساتھ اپنے اپنے رہائش پذیر ممالک میں متعارف کرائیں۔ یوں اُن کے الفاظ کا رشتہ اُن کے آبائی ملک کے اندر رہنے والے دانشوروں کے الفاظ کے ساتھ جُڑ جائے گا۔ ہمارے دُکھ درد اور خوشیاں سانجھی ہوں گی۔ میری خُدا کے حضور یہ دعا ہے کہ وہ خوش وخرم رہ کر ہماری خوشیوں میں شرکت کرتے رہیں اور ہم اُن کی خوشیوں میں شریک رہیں۔ (آمین)!

پروفیسر جمیل احمد عدیل (بورے والا)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن...... کو اکیڈمی سے موسوم کیا جائے یا پھر کسی علمی ادارے سے معنون کیا جائے؟ ہمیں نہیں معلوم، لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس وقت ان کی استعدادی حالتوں کو فعلی صورتوں میں منقلب ہوتے دیکھ کر زبانِ غیر سے شرحِ آرزو کرنا پڑ رہی ہے: Reached Its Highest Potential

امکانی ترقیات کے اس سفرنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمارا ذہن اگر اپنے آپ ایک یورپی زبان کی طرف منتقل ہو گیا ہے تو اس بے ساختگی کے عقب میں کسی نوع کی شعوری کاوش بھی متحرک ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی ''تازہ واردات'' کا ہدف وہ ادبا و شعرا بنے ہیں جو وطنِ عزیز سے دور، سات سمندر پار بیٹھے ہیں اور اردو زبان کے رقبے میں وسعتوں کا سبب بن رہے ہیں۔ خاص طور پر وہ ادیب و شاعر جن کا ظاہر محلہ آسرا ''انگلش میڈیم'' ہے لیکن اس کے باوصف اُردو کی نشوونما ان کا مقصود رہتا ہے۔ ایسے ہی لکھاریوں کو ڈاکٹر صاحب نے ''سفیرانِ اُردو'' قرار دیا ہے۔ صاحبو! یہ جو اپنے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب ہیں، یہ اُردو ادب کے ''سہل ممتنع'' ہیں۔ ہم ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور تنقیدی صلاحیتوں کے اس لیے بھی معترف ہیں کہ ان کی سادگی، پُرکاری سے کبھی تہی نہیں ہوتی۔ ''باتیں'' کے عنوان سے ''شام و سحر'' کے مختصر اداریے لکھیں، باقاعدہ انتقادی تحقیقی مقالات ضبطِ تحریر میں لائیں یا ادبی کالم کاغذ پر اتاریں ان کے اُسلوب میں سادگی، آسانی، روانی بلکہ غیر معمولی سہولت کا احساس ہوگا، یوں پہلی ہی سطر سے قاری کو اپنے حصار میں محصور کر لیں گے کہ بعد ازاں وہ گریز پائی اختیار کرنا بھی چاہے، تو اُسے ہر راستہ مسدود ملتا ہے۔ یہ ارتکاز کا اعجاز ہے، یا کیا ہے؟ ہمیں نہیں خبر، مگر یہ ایک طرح کا طلسم ضرور ہے۔ تاہم ہماری دانست سحر کے پیچھے فکری

گہرائی کی توانائی کا ہُنر لازماً اپنا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔ فی الاصل ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا مطالعہ حیران کن حد تک وسیع ہے، چنانچہ ان کے آفاق کا پھیلاؤ ہمہ دم توسیعات کا، قائل دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح انہیں پڑھتے ہوئے بحث در بحث کی کیفیت مسلسل پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ قاری ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو اس طرح نہیں پڑھتا، جیسے طالب علم نصابی عبارت کو پڑھتا ہے۔ بطخ کی مثال بالائی سطح پر تیرتے ہوئے، وہ تو مچھلی کی مانند اعماق میں غوطہ زن ہونے پر خود کو مجبور پاتا ہے کہ سوالات کے گُرمتے اُسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔

اب ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' کے ٹائٹل سے ان کا، نیا علمی کارنامہ منظرِ عام پر آ رہا ہے، یہ محض بیرونِ ممالک میں مقیم پاکستانی ادیبوں/شاعروں کی Pot-Pourri نہیں ہے، جس میں ان کے سوانحی کوائف درج ہوں نیز ''نمونۂ کلام'' سے ضخامت کے تقاضوں کو پورا کر دیا گیا ہو بلکہ یہ کتاب فکر افروز مباحث کا ایک نگار خانہ ہے۔ آپ سوچیے وہ ادیب اور شاعر جنہیں معیشت کی نیلم پری اپنے دیس سے بہت دُور لے گئی، اُردو زبان سے جُڑت، ان پردیسیوں کا مسئلہ کیوں ہے؟ یارو! زبانیں تو ساری ہی پیاری ہوا کرتی ہیں۔ پنجابی بھی بُری نہیں، پشتو میں بھی عیب نہیں، سندھی میں بھی کوئی نقص نہیں، ہندکو بھی نفرت کی تعلیم نہیں دیتی، سرائیکی بھی بغض و عناد کی مبلغ نہیں، ہندی بھی کسی شریعت میں ممنوع قرار نہیں دی گئی، عربی فارسی تو خیر مکرم، مقدس، منزہ ٹھہریں۔ سو ان کے بارے لب کشائی کی ضرورت ہی نہیں۔ مانا کہ زبان تو ''میڈیم'' ہے، اس میں کہی گئی بات اچھی یا بُری ہو سکتی ہے۔ یہ آئیڈیلزم بلاشبہ دنیا کی تمام زبانوں کے لیے اپنے دامن میں گنجائش پیدا کرتا ہے لیکن پھر ''اپنی زبان'' کا قضیہ کیا ہوا؟ اگر پاکستان سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ادیب اور شاعر اُردو لٹریچر کے قد میں اضافہ کر رہے ہیں تو ''اپنی زبان'' کی حساسیت انہیں کیوں لاحق ہے؟ جو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ہاں انہیں ''سفیران

اُردو" قرار پانے کی بنیادی وجہ بنی ہے؟

اس اساسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں اُردو زبان میں اپنے تہذیبی رشتے کو تلاش کرنا ہوگا۔ جب فرد اجتماع کا حصہ نہیں رہتا تو اس کی یہی پہچان رہ جاتی ہے کہ اس کی کوئی پہچان نہیں ہوتی اور ہر فرد کے ساتھ یہ جبر بُری طرح لاحق ہے کہ وہ تنہا جی ہی نہیں سکتا۔ اُسے کسی نہ کسی "مقامی" اجتماع کا جزو بننا ہی پڑے گا۔ کسی نہ کسی تمدن سے وابستہ ہونا ہی ہوگا، کسی نہ کسی سوسائٹی کی قدروں پر اُسے اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ یہ بھی ایک گتھی ہے کہ جس صُلب اور جس خطے سے کسی کا قدرتی ناتا ہوتا ہے، کیا اُس سے بے نیاز ہُوا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی اس بغاوت پر خود کو آمادہ کر بھی لے تو کیا "دوسرے" اُسے بخوبی جذب (Absorb) کر لیں گے؟ کیا "گلوبل ولیج" کے پُرکشش سرابے نے یک رنگی کو تشکیل دے دیا ہے؟ کیا ہر نوع کا جُداگانہ تشخص اُچھل کر بے کراں ہو گیا ہے؟ کیا ہجرتوں اور نقل مکانیوں کے بر پر ہم اپنی معاشرت، اپنے تہذیبی و تمدنی نظام، اپنی ثقافتی روایات، اپنی دینی اقدار، اپنے طرزِ احساس، اپنے جذباتی احوال سے کلیتاً لاتعلق ہونے کا چمتکار دکھا سکتے ہیں؟ یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ دفعتاً ایسا صرف اس لیے نہیں ہو پاتا کہ صدیوں کے عمل میں بڑی عجیب طاقت ہوتی ہے۔ زبان بھی اپنی دھرتی سے وابستگی کا نہایت مضبوط حوالہ ہے۔ علاقائی زبانوں کی ہمارے شعور میں معنویت اپنی جگہ مسلّمہ لیکن اُردو سے بھی ہمارا ایک پختہ رشتہ ہے۔ ہماری تہذیب کے دو بڑے رشتے ہیں۔ ایک کا تعلق عرب سے ہے، دوسرے کا ایران سے۔ ایران سے ہمارا ناتا خالص تہذیبی ہے اور عرب کے ساتھ دینی۔ ہم نے "بوجوہ" دونوں کو قبول کیا ہے۔ آگے چل کر جب ہندوستان تقسیم ہُوا تو ہمیں ایک ملک سے اپنی پہچان وابستہ کرنا پڑی۔ ان گنت لوگ تھے اور ہیں جو اس بٹوارے پر جز بز ہوئے لیکن جو واقعہ رونما ہو چکا ہوتا ہے وہ اپنی جگہ موجود ہُوا کرتا ہے، کسی کے چیں بہ چیں ہونے سے کیا ہو جاتا ہے۔ پاکستان بہر طور معرضِ وجود میں آیا، ہمیں اس جغرافیے کو

تسلیم کرنا پڑا اور اس کی دیگر حدود کے ساتھ اسے وحدت عطا کرنے والی زبان یعنی اُردو کو بھی اپنانا پڑا۔ کسی کے لیے یہ طوعاً ہوا ہے تو کسی کے لیے کرہاً۔ ہاں جنھوں نے اُردو کو برضا قبول کیا ہے وہ عربی کے مقام کے منکر نہیں ہیں، فارسی کی اہمیت سے بھی انھیں انکار نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اُردو اپنی فطرت میں باغی بیٹی نہیں ہے۔ اپنے سلسلۂ نسب پر یہ نادم بھی نہیں ہے۔

صاحبو! دوبارہ سرِ تسلیم خم کہ بچے بھی پیارے ہوتے ہیں مگر جو پیار اپنے بچے کے ساتھ ہوتا ہے وہ غیر کے بچے کے ساتھ ممکن نہیں۔ ساری قومیں اعلیٰ، سارے ملک اچھے، ساری زبانیں پیاری، لیکن جس طرح اپنا ملک مقدم ہے، اسی طرح اپنی زبان (اُردو) کو سب پر ترجیح ہے۔ اُردو کسی علاقائی بولی کی نفی نہیں کرتی، اُردو تو بس سب مقامی بولیوں کو مقامیت کی نفی سے نکال کر اثبات کے زاویوں میں ڈھال کر وحدت عطا کرتی ہے۔ یہ دلیل اُردو کے حق میں بہت قوی ہے کہ اسے ہی قومی زبان ہونا چاہیئے کہ یہ کسی خاص سرزمین کی مقامی زبان نہ ہونے کے باوجود سب کی زبان ہے کیونکہ یہ صرف خیبر سے لے کر کیماڑی تک ہی نہیں بولی اور سمجھی جاتی بلکہ جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ بولی، سُنی اور سمجھی جاتی ہے۔ دنیا کی کم زبانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اتنی کم عمری میں باقاعدہ علوم وفنون کی زبانیں بن گئی ہوں۔ یہ اُردو ہے جس نے تاریخ، سوانح، نفسیات، فلسفہ، علم کلام، منطق، ریاضی، طبیعیات، مابعدالطبیعیات، حیاتیات، انسانیات، اقتصادیات، کیمیا، ادبیات، مذہبیات، تصوف، سماجیات...... غرض کون سا علم ہے جس کا اظہار و ابلاغ کامیابی کے ساتھ اس زبان نے نہیں کیا۔ سب سے بڑھ کر قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر سے لے کر دیگر دینی مسائل پر اس قدر لٹریچر پیدا کیا ہے کہ عربی فارسی کے برابر کھڑی ہونے کے لیے پر تول رہی ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تالیف ''سفیرانِ اُردو'' شعری اور ادبی سرمائے کے ساتھ مخصوص ہے لیکن بہر رنگ اُردو کے سٹرکچر کو پختگی عطا کرنے میں ان مصنفین کا قابل

قدر حصہ ہے، زبان اگر پرداخت کے عمل میں سے گزرے گی تو وہ علوم وفنون کے اظہار کے لائق ٹھہرے گی۔ ہمارے پڑوسی اپنی عصبیت کی وجہ سے رسم الخط پر بضد ہو گئے، وگرنہ ان کے میڈیا سے جو کچھ نشر ہو رہا ہے، وہ کیا ہے؟ ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں کہ بھلے ہی فلموں کی مارکیٹنگ ان کا معاشی مسئلہ ہے مگر اردو کے دامن کو وسیع کرنے میں ان کا بھی ''رول'' ہے۔ اُردو کی سرشت میں ہی تعصب نہیں ہے، اسی لیے دوسری زبانوں کے الفاظ ومصطلحات برابر اس کا حصہ بنتے چلے جا رہے ہیں اور یہ کام صرف پاکستان میں مقیم ادیب وشاعر ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ بیرونِ ملک رہنے والے ادبا وشعرا بھی اُردو کی سفارت کا اہم حق ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اس سلسلے میں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم موضوع کے بارے میں مباحثے کا آغاز کر دیا ہے۔

ڈاکٹر مزمل حسین (لیہ)

شعروادب کی تخلیق جہاں بھی ہو اُس میں تخلیق کار کی ذات کے اظہار سے لے کر اُس کے ماحول بطور خاص اُس کی جنم بھومی یا وطن کی مٹی کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے اور خصوصی تناظر میں اُن شعرا اور ادبا کی تخلیقات جو وطن سے دور رہ کر منصۂ شہود پر آئی ہوں۔ اُن میں نسٹلجیائی کیفیات کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں میں جو خاص طرح کی کسک اور ہجریہ عناصر دکھائی دیتے ہیں وہ ''ترفع'' کو پیدا کرنے کا سبب ضرور بنتے ہیں کیونکہ شعروادب کی تخلیق کے عقب میں اگر شاعر یا ادیب کا ذاتی تجربہ یا قلبی واردات موجود ہو تو یقیناً تخلیقی طرزِ احساس میں ایک خاص قسم کی گدازیت کا آنا ایک ناگزیر عمل بن جاتا ہے۔ اس پس منظر میں بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں اور اُن کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔

وطن سے دور رہ کر شعر و ادب کی تخلیق میں یہ پہلو ہمیشہ توجہ طلب رہتے ہیں۔

(۱) حب الوطنی (۲) اپنی ماں بولی اور قومی زبان سے محبت کا اظہار (۳) اپنی تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے احساسِ تفاخر (۴) اپنے لوگوں سے محبت کا اظہار۔

یہ وہ قدریں ہیں جو کسی بھی زبان کے بڑے ادب کی بنیاد بنتی ہیں لیکن ایسے ادب کی تخلیق کے لیے ایسے شاعر اور ادیب داد کے مستحق ہوتے ہیں جن کی تحریروں میں سیاسی، تہذیبی، لسانی، ادبی، فنی، تاریخی اور علمی شعور جامع شکل میں موجود ہوتا ہے۔ ایک عام مشاہدہ یہ ہے کہ زیادہ تر بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کے ہاں متذکرہ اوصاف ناپید ہیں اُن کے تخلیق پانے والا ادب جملہ شعری و ادبی اصولوں سے عاری ہوتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی مشکل ہے کہ جن بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں نے پورے ذوق سلیم اور تخلیقی شعور سے خدمات سرانجام دی ہیں اُنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تحریروں میں تخلیقی سطح پر وطن کی محبت، انسان دوستی، احترام آدمیت اور فنی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اپنی شعری و ادبی کاوشوں سے نہ صرف ادب کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ پوری لگن سے اپنے وطن کی تہذیب وثقافت کی سفارت کاری بھی کر رہے ہیں۔ وہ جس بھی ملک میں مقیم ہیں وہاں کی اینف کو اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی تاریخ، اپنے ادب، اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے حوالے سے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کا تعلق ایک باشعور اور غیور قوم کے ساتھ ہے۔ اس تناظر میں بیرون ملک مقیم پاکستانی شعرا اور ادبا کی خدمات لائق تحسین ہیں اور ان کا معیار اندرون ملک بہت سے شعرا اور ادبا سے بہتر ہے، لیکن بیرون ملک رہنے والے ایسے شعرا اور ادبا بھی ہیں جو سستی شہرت یا پھر کسی "نظریہ ضرورت" کے تحت شعر و ادب کو استعمال کر رہے ہیں چونکہ اُن کے ہاں دولت کی فراوانی ہوتی ہے اس لیے وہ سطحی قسم کی شاعری کو دیدہ زیب گٹ اپ میں شائع کر کے داد لینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں یا پھر کسی مفاد کے حصول کے لیے پردیس میں ادبی انجمنیں بنا کر

جگ ہنسائی کا سبب بنتے ہیں، لیکن ایسے عناصر بیرون اور اندرون ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، اور ان کی ریت بھی پرانی ہے کیونکہ ہر دور میں ایسے مفاد پرستوں کا ٹولہ موجود رہا ہے۔ ایسے تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ اُن "مین سٹریم" میں آنے کے لیے نہ صرف اپنے مطالعہ کے دائرہ کو بڑھائیں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ علمی و ادبی خدمت بجالائیں تاکہ زبان کے ساتھ ساتھ ملک کا نام بھی روشن ہو۔

ان شیخی پرست شعرا اور ادبا کے مقابلے میں وہ شعرا اور ادبا جو بیرون ملک رہ کر پوری لگن، محنت اور اعلیٰ تخلیقی معیار سے اپنے اپنے کام میں مگن ہیں اُنھیں چاہیے کہ وہ نہ صرف پاکستانی ادب کی روایت کو فروغ دیں بلکہ وہ جس جس ملک میں بھی مقیم ہیں وہاں کی شعری و ادبی روایت کے مطالعہ سے اپنی زبان کے شعروادب کو اُن پہلوؤں سے روشناس کرائیں جو کسی نئے تجربہ کی بنیاد بنیں اور اُن اصطلاحوں، اصناف اور اسالیب کو اپنے شعروادب میں برتیں جو یہاں ناپید ہیں، اس طرح ہمارے شعروادب میں عالمگیریت اور آفاقیت کے عناصر پیدا ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تحریروں میں پاکستانی سیاست، سماج، تہذیب، ثقافت اور یہاں کے عام لوگوں کے دُکھ، سُکھ، نفسیات اور سماجی رویوں کو مکمل جزئیات کے ساتھ اُجاگر کریں کیونکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ بیرون ملک مقیم تخلیق کار جس معاشرے کو پورٹریٹ کرتے ہیں اُس میں بڑی کلاس کی نمائندگی غالب ہوتی ہے اور وہ عام لوگ جو سماج اور تہذیب کے اصل ترجمان ہوتے ہیں اُنھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یہاں یہ بات کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ جس وقت ہمارے یہ شعرا اور ادبا ملک سے ادیبوں اور شاعروں کو مشاعروں اور ادبی تقاریب میں مدعو کرتے ہیں تو مراکز کے تخلیق کاروں کو ہی مرکزِ نگاہ بناتے ہیں اور مضافات میں رہنے والے شعرا اور ادبا کو بھول جاتے ہیں۔ اس طرح صحیح طور پر ملک کی نمائندگی نہیں ہو سکی اور ایک خواہ مخواہ کا تاثر یہ اُبھرتا ہے کہ بیرون ملک میں منعقد ہونے والی محافل صرف مخصوص ادیبوں اور شاعروں

کی تحسین کے لیے ہوتی ہیں۔

اس ساری بحث کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ بیرون ملک تخلیق ہونے والا پاکستانی ادب بعض کمزور پہلوؤں کے باوجود کئی اعتبار سے قابلِ تحسین ہے، اس ادب میں پاکستانی تہذیب وثقافت کا اظہار اور قومی اور علاقائی زبانوں کے ادب کی ترویج ایک خاص تناظر میں جاری وساری ہے اور ہم اُسے کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر شفیق عجمی (لاہور)

کبھی غمِ روزگار، کبھی جستجوئے علم اور کبھی ذوقِ سفر دیارِ غیر میں کشاں کشاں کھینچے لیے جاتا ہے۔ بے وطنی میں وطن کی کشش اور محبت جب خود پر منکشف ہوتی ہے تو بیشتر لوگ محض ناسٹلجیا سے دوچار ہوتے ہیں جبکہ تخلیق کار کے لیے یہ کرب اور تجربہ تخلیقی اظہار کے نئے دریچے وا کرتا ہے۔ یہ تجربہ وطن کے گلی کوچوں کی بُو باس، اس کی ہواؤں کی مہک اور یادوں کے عطر میں لپٹا ہوتا ہے جسے محسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ ان تجربات میں نئے رفیقوں کو بھی شریک کرتا ہے اور اجنبی گزرگاہوں کی روشنیوں اور رونقوں کو اپنے تجربات میں سمو کر اہلِ وطن کو نئے ذائقوں کے تحائف بھی پیش کرتا ہے۔

بے وطنی کے مشاہدات و تجربات تخلیق میں ڈھلتے ہیں، نئے خیالات سے بھی آشنا کرتے ہیں اور اس طرح زندگی نئی فکری و تخلیقی وسعتوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد یار گوندل (سرگودھا)

کیا عمدہ نام رکھا ہے آپ نے اپنی نئی کتاب کا ''اُردو شعروادب کے سفیر'' جو شاعرانہ بھی ہے اور اسم بامسمّٰی بھی۔ غالباً بیرون ملک مقیم قلم کاروں کو ادبی تاریخ کے دھارے میں لانے کے ضمن میں یہ پہلی کامیاب کوشش ہے۔ اس ضمن میں آپ مبارک باد

کے مستحق ہیں۔ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار یقیناً شعر و ادب کی ترویج میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ خصوصاً شاعری میں زیادہ کام ہو رہا ہے۔ اِن کا ادبی اختصاص یہ ہے کہ ان کے ادب میں مشرق اور مغرب، دونوں معاشروں کی عکاسی کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔

ادب کے اِن سفیروں کی تخلیقات کا جزو لاینفک تو وطن کی خوش بُو ہی ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

کے مصداق ''غریب الوطنی'' ایک تخلیقی محرک ہے اور وطن کی محبت کو انگیخت کرتا ہے۔ اصل میں وطن کی محبت ہی اِن کو اُردو ادب سے محبت پر اُکسا رہی ہے۔

اِن تخلیق کاروں کی تخلیقات کے معیار کو تو مستقبل کی ادبی تاریخ ہی مقرر کرے گی۔ ویسے بھی ادب کی معیار بندی کے لیے ایک زمانی فاصلہ درکار ہوتا ہے تا کہ قارئین کی مخصوص آرا فن پارے کے لیے وجود میں آ جائیں تو پھر اس پر مناسب گفتگو کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال معیار سے زیادہ مقدار پر زور ہے۔ اس شعر و ادب میں ابھی آفاقی عنصر نمودار نہیں ہو پایا، لیکن مستقبل کے آفاقی فن کار کے لیے راہیں ہموار کر رہا ہے۔

اُردو ادب کے طالب علم کے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہمارے ہم وطن دیارِ غیر میں بیٹھ کر اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ مَیں اِن کی خدمت کو بے لوث اور ادبی عبادت کا درجہ دیتا ہوں۔ اطمینان یہ کہ اِن کی تخلیقات خلوص پر مبنی اور تعصبات سے پاک ہیں۔ ان کے ادب میں انتشار نہیں بلکہ اتفاق کی روگامزن ہے۔ یہ لکھاری اُردو ادب کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے میں کامیاب ہوں گے۔ جس سے ایک عالم گیر ہم آہنگی پروان چڑھے گی۔

یہ سفیر غیر ملکی معیاری ادب کے معیاری تراجم بھی کریں جس سے اردو ادب میں

مزید وسعت آئے گی۔ دوسری طرف اس وقت جو حکومتی سطح پر اردو ادب کے ٹھیکے دار براجمان ہیں، انہیں چاہیے کہ ادب کے ان سفیروں کی پذیرائی کے لیے کوئی محرک رکھا جائے۔ جس طرح اکادمی ادبیات کے سربراہ نے ایک نیا عالمی انعام برائے ادب ''پس زنداں انعام'' کے نام سے جاری کرنے کا اعلان فرمایا ہے۔ اسی طرح پردیس کے پنچھیوں کے لیے بھی عالمی انعام برائے ''ادب کے سفیر'' کا بھی اجرا کیا جائے۔

پروفیسر شہباز نقوی (لیہ)

بیرون ملک پاکستانی شعرا شعروادب کی تخلیق میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اُن کا زیادہ تر رجحان مشاعروں کی طرف ہے۔ پاکستانی باشندوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس بھی ملک میں ہوں وہاں وہ ایک انجمن ادبی یا سماجی قائم کر لیتے ہیں اور اس طرح اُنہیں تقریب ملاقات کا موقع میسر آ جاتا ہے۔ ان پاکستانیوں میں ادیب اور شعرا ہی یقیناً ہیں کچھ نے اپنے اشاعتی ادارے بھی بنا رکھے ہیں ان کی تخلیقی کاوشوں میں یقیناً اپنی مٹی کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ اپنے وطن سے دوری اور اپنے پیاروں کی جدائی اُنہیں وطن کی طرف مراجعت کا احساس ضرور دلاتی ہے۔

جہاں تک ان کی تخلیقات کے معیار کا تعلق ہے تو میں کچھ زیادہ مطمئن نہیں کیونکہ یہ شعرا (بلکہ بیشتر اندرونِ ملک شعرا بھی) روایت سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کے یہاں غزل میں عاشق، محبوب اور رقیب کی تثلیث موجود نہیں۔ غزل کے بنیادی کرداروں کی نمائندگی کا فقدان ہے۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ روزگار کی تلاش میں نکلے ہوئے پاکستانی شعراء بیرون ملک اپنی تخلیقی کاوشوں کو فراموش نہیں کر رہے۔ شعر کا معیار بہتر بنانے پر توجہ ہونی چاہیئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اندرونِ ملک شاعری کے معیار سے باخبر ہوں۔ شاعر

کو بہت زیادہ باشعور ہونا چاہیے۔ اگر محبت کے وہی گھسے پٹے خیالات بیان کرنے ہیں تو پھر شاعری کو آگے بڑھانا بہت مشکل ہے۔ میں نے کم از کم جتنے شعراء سے ملاقات کی ہے اور جتنے مجموعے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اُس میں معیار کا فقدان ہے۔ کتاب کا ٹائٹل بہت اچھا ہوتا ہے۔ کافی پیسہ لگا کر شائع بھی کر لی جاتی ہے۔ لیکن بین السطور کیا ہے اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے۔ ع کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے

حسین مجروح (لاہور)

ستر (۷۰ء) کی دہائی میں بڑے پیمانے پر پاکستانیوں کے ترک وطن سے یورپ، امریکہ اور شرقِ وسطیٰ میں اردو زبان وادب کے نئے نئے منطقے نمودار ہونا شروع ہوئے۔ بیرونِ ملک پاکستانیوں کی مہاجرت (بالخصوص برطانیہ میں) تو پچاس کی دہائی میں ہی آغاز ہو چکی تھی لیکن ''ترکِ موالات'' کی لوٹ سیل اس طرح جوق در جوق پہلے نہ تھی۔ اس ترکِ وطن کے اسباب مادی رہے ہوں یا سیاسی، دیارِ غیر میں کوچ کر جانے والوں کے ہاں، اپنی جڑوں سے دُوری اور اپنی آب وہوا سے محرومی نے ایک طرح کے ناسٹلجیا کو فروغ دیا، جس کا ادبی اظہار مہاجرت کے عمومی استعارے کی صورت گری میں نمودار ہوا۔ گذرتے وقت کے ساتھ، مشاعرے کا ادارہ جو برصغیر کی تہذیبی فضا میں سخن کی عوامی جڑت کا طاقتور مظہر تھا، بیرونِ ملک پاکستانیوں کی جذباتی تسکین اور کتھارسس کے سمبل کے طور پر اُبھرنا شروع ہوا چونکہ شاعرانہ سرگرمی سے پہچان اور فوری شہرت کے علائم وابستہ تھے چنانچہ اردو دنیا کے ان نوزائیدہ منطقوں میں شعراء کی نت نئی اقسام سامنے آنا شروع ہوئیں۔ اس فصلِ نوبہار میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جن کا شعری سفر اور شناخت، پاکستان ہی میں پرداخت کر چکی تھی، سو مہاجرت کا تجربہ اُن کے شعری نصاب میں دردمندی کا رستا ہوا زخم بن کر سامنے آیا جس پر خوشحالی کا مرہم لگا ہوا تھا۔ یوں اردو شعر وادب میں ایک نئے ذائقے، ایک

اور طرح کے پانی کا ایزاد ہوا لیکن فوری مقبولیت کی اُس للک نے، جو بیرونِ پاکستان ہر مہینے دو مہینے رونما ہونے والے مشاعراتی دنگلوں کے سبب، ان منطقوں کو ارزاں ہوئی، دو خرابیوں کو بھی یہاں، وہاں کے ادبی چلن کا وظیفہ بنا دیا۔ اوّل یہ کہ سخن کی سرخروئی پسِ پشت جا پڑی اور تعلق و خوشامد کی آکاس بیل تلے تیسرے درجے کے شعرا نے بیرونی دنیا میں اردو شعر کی نمائندگی اور ترجمانی کو استقرار کیا۔ معاملہ یہاں تک بھی رہتا تو غنیمت تھا کہ اِس لا سے کچھ دوستوں کی معیشت چمک اُٹھنے کا سامان بہم ہو رہا تھا لیکن زیادہ بڑی بدعت یہ پیدا ہوئی کہ بے صلاحیتی اور عدمِ استحقاق کی اس روپہلی آندھی میں ایک ایسی عجیب الخلقت مخلوق بھی ادب کی ڈیوڑھی میں آن براجمان ہوئی جسے لفظ سے علاقہ تھا نہ خیال سے سرکار۔ بس اُسے درہم و دینار لُٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے کا ہڑاک تھا۔ اِدھر ناشرین اور ادبی کاریگروں کی ایک ٹولی اُن کے سواگت کے لیے آنکھیں اور رال (دونوں) بچھائے تیار کھڑی تھی۔ چنانچہ سخن کے صرافے میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ غدر مچا کہ پیتل تانبہ کوٹھوں چڑھا اور سونا پاؤں کی مٹی ہوا۔ حرف کی بے توقیری اور "کاتا اور لے دوڑی" کے انترے کو ادبی ترانہ بنانے کی کارگذاری پورے جوش و خروش سے جاری ہے اور ریاضت کے بغیر شہرت بٹورنے کا یہ تعویذ خود پاکستان کے اندر موجود نئے شعرا کی بڑی تعداد کو بھی مرغوب ہو چلا ہے۔ ایسے میں ادب کو جوگیوں اور درویشوں کا محکمہ سمجھنے والے اُجّل نقش گروں کا معمہ یہ ہے کہ وہ اپنی دُنیا کی خرابی اور عاقبت کی بربادی کا ذمہ دار خود کو ٹھہرائیں یا اُس لفظ کو جس کی حُرمت، انہیں ایمان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

آپ نے استفسار فرمایا ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں بہتری کے لیے بیرونِ پاکستان مقیم شعراء و ادبا کو کیا کرنا چاہیے تو اس ذیل میں عرض ہے کہ خواہش اور لوبھ کی بھینسوں کے آگے مشورے کی بین کم ہی بجا کرتی ہے۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل میں معروض ہوں کہ ادب میں مختصر راستوں کی تلاش، بالآخر پینڈا کھوٹا کر دیتی ہے اور یہ کہ

رعایتی نمبر اور سفارشی بیساکھیاں زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دیتیں۔ سو اس کوچے میں جس کسی کو ذرا اعتبار کی تلاش ہے اُسے سچے طالب علم کی طرح سخن کی تند خوندی میں گہری غواصی کا خوگر ہونا چاہیے اور اُتھلے پانیوں میں شہرت کی چمکیلی مچھلیوں کے شکار سے گریز کرنا چاہیے۔ یوں بھی ہمارے اردگرد کی زندگی اور اُس کے علائم بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ایک نیا انسان اور نیا علم الکلام ہمارے دل و دماغ پر دستک دے رہا ہے۔ ہم اور ہمارا قبیلہ کب تک فعلن، فعلن کی مالا جپتا رہے گا۔

ڈاکٹر غلام یسین (لودھراں)

کسی زبان کے بڑے ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس زبان کا حلقۂ قرأت کتنا وسیع ہے۔ جتنے زیادہ لوگ اس زبان کے سمجھنے، بولنے اور لکھنے والے ہوں گے، وہ اتنی بڑی زبان تصور ہو گی۔ انگریزی، چینی، اردو، فرانسیسی اور عربی دُنیا کی بڑی زبانیں مانی جاتی ہیں۔ زبانوں کی جدید سروے کے مطابق اُردو دُنیا کی تیسری بڑی زبان تسلیم کی جا رہی ہے۔ اُردو کو یہ حیثیت اور مقام دلانے میں بیرونِ ملک مقیم پاکستانی شعرا و ادب کا کردار مسلمہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو بولنے والے حصولِ روزگار، تعلیم یا دیگر قومی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے ہیں۔ پاکستانی جہاں بھی گئے ہیں وہ اپنی پاکستانیت اور اپنی زبان اُردو کے ساتھ گئے ہیں۔ اس طرح دنیا کے تمام براعظموں میں اُردو زبان پہنچ گئی ہے۔ پاکستانی سفارت خانے تمام دنیا میں اپنا مذہبی، سماجی، تہذیبی اور لسانی تشخص متعارف کرانے میں شب و روز کوشاں ہیں۔ بیرونِ ملک روزگار کی تلاش میں جانے والے پاکستانی اور سرکاری ذمہ داریاں نبھانے والے سفارت کار جہاں اردو کی ترویج کے لیے کام کر رہے ہیں۔ وہاں موجود پاکستانی شعرا و ادبا بھی اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستانی ادیب جن

ممالک میں مقیم ہیں، وہاں اُنھوں نے اردو زبان کو مقبول بنانے کے لیے کئی ایک اقدام کیے ہیں۔ ان تمام ممالک میں جہاں اردو بولنے والے یا پاکستانیوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ بہت سی اردو ادبی تنظیمیں اور سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ تنظیمیں اردو زبان میں پیش کی گئی تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کرانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ مختلف مواقع پر ادبی تقریبات اور مشاعروں کا اہتمام کرتی ہیں۔ اس طرح کی ادبی تقریبات کی خبریں، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، یو۔ اے۔ ای عمان، قطر، بحرین، سعودی عرب اور ترکی سے آئے دن سُننے کو ملتی ہیں۔ ان ادبی تقریبات میں نہ صرف بیرونِ ملک مقیم پاکستانی عوام اور فن کار شریک ہوتے ہیں، بلکہ مقامی باشندوں کی بھی خاصی تعداد شرکت کرتی ہے۔ پاکستان سے بھی نامور شعرا و ادبا کے وفود کو ان تقریبات میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ ادبی وثقافتی وفد ان تقریبات میں شریک ہو کر جہاں اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہاں اپنی شاعری، مضامین اور تنقیدی مقالوں کے ذریعے اُردو کی ترقی و ترویج کا باعث بھی بنتے ہیں۔

وطن سے محبت کا جذبہ ہر انسان میں موجود ہے۔ چاہے وہ اپنے ملک میں موجود ہو یا بیرونِ ملک۔ جب ہم اپنے ملک میں موجود ہوتے ہیں تب ہمیں اس بات کا احساس اس شدت سے نہیں ہوتا جتنا پردیس جا کر ہوتا ہے۔ جہاں وطن کی ہر چیز یاد آتی ہے۔ اپنے ملک کی صبحیں، شامیں، کھیت، کھلیان، کھیل کود، رسم و رواج، مذہبی تہوار، رشتہ دار، دوست احباب، ہم جماعت اور ہم پیشہ۔ وطن سے دور بیٹھا عام شخص جب اتنا کچھ محسوس کر سکتا ہے تو اس بات کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ ایک فن کار جو عام آدمی سے کہیں زیادہ حساس شخص ہوتا ہے۔ وہ وطن سے دور جا کر کس طرح اپنے وطن کو یاد کرتا ہو گا۔ ہمارے اُن کستانیوں کی تخلیقات جو بیرونِ ملک جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ اُن کی تخلیقات میں بڑی شدت کے ساتھ وطن سے محبت کا جذبہ سامنے آتا ہے۔ بیرونِ ملک پاکستانی ادیب و شاعر تمام صناف ادب میں تخلیقات پیش کر رہے ہیں خصوصاً بیرونِ ملک مقیم افسانہ نگاروں اور شعراء کا

کام قابلِ ستائش ہے۔

ہمارے یہ فن کار اپنی نگارشات میں جہاں اپنے موجودہ ملک کے حالات و واقعات نشاندہی کرتے ہیں، وہاں اپنے ملک پاکستان سے محبت سے سرشاری بھی نظر آتی ہے۔ان کا کوئی فن پارہ ایسا نہیں ہوتا جس سے خاکِ وطن کی خوشبو محسوس نہ کی جاسکتی ہو۔

آج کا دور الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ پیش آمدہ واقعات کی خبریں برق رفتاری سے دنیا بھر میں پھیل جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں پاکستانی ادیب اپنے ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی صورتِ حال سے کیونکر بیگانہ رہ سکتے ہیں۔ان کے دل ہمیشہ پاکستانیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ہمارے اور اُن کے دُکھ سُکھ ساجھے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوں پہلے پاکستانی ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کی اولین شناخت اُن کا ملک پاکستان ہے۔ وہ اپنے ملک کے عوام میں بھی پاکستان کے لیے خیر سگالی کے جذبات پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ ادیب و شاعر ہی پاکستان کے اصل سفیر ہیں۔ان کی تخلیقات کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ بیرونِ ملک رہنے والوں کے کئی ایک فن پارے ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔جن کے مطالعہ سے یہ احساس ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ تخلیقات کسی ایسے مقام سے منظرِ عام پر آئی ہیں، جہاں کے بسنے والوں کی زبان اردو نہیں۔

موجودہ عہد کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا عہد ہے۔ انٹرنیٹ کی اہم ایجاد نے دنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارے فن کار بھی اس سہولت سے پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ میں بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کے کام سے مطمئن ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ لوگ اپنا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رکھیں اور اردو زبان ہی ان کی شناخت کا پہلا اور آخری حوالہ ہو۔ بیرونِ ملک پاکستانی ادبا و شعرا میں باہم روابط کا قدرے فقدان نظر آتا ہے۔ میری رائے میں انھیں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ یہ آپس میں روابط رکھیں۔ پاکستان میں موجود ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے بھی ان کا واسطہ برقرار

رہے۔ معلومات اور کتابوں کا تبادلہ ہو۔

الغرض بیرونِ ملک پاکستانی ادیب و شاعر ہی ہمارے صحیح معنوں میں سفیر ہیں۔ ان کی نگارشات اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے بہت ہی مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اِن کی تحریروں میں وطن سے محبت کا جذبہ فطری ہے۔ ہم اس جذبے کی شدت اِن کے فن پاروں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ بیرونِ ملک اردو زبان میں لکھاریوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ ان کے کام پر اظہارِ خیال کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن جو نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں نیز اللہ تعالیٰ بھی ان کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس موضوع کا انتخاب "اردو شعر و ادب کے سفیر" ایک بڑا منفرد اور اہم کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی تکمیل پر میں اُنھیں خلوصِ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو خواندہ طبقہ اُن کی اس علمی و ادبی کاوش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھے گا۔

محمد ضیا اللہ قریشی (میانوالی)

ادب کا خیال آتے ہی انسان کے ذہن میں ایک وسعت کا تصور اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے ایک ایسی وسعت جسے حدوں اور سرحدوں کی قید میں نہیں لایا جا سکتا۔ ادب کا کام صرف اور صرف انسان اور انسانیت کا احترام کرتا ہے اور یہ ادب ہی ہے جو انسان کو ہر قسم کے مذہبی، لسانی اور نسلی تعصبات سے چھٹکارا دلا دیتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان ایسی نہیں جس کے پاس اپنا ادبی سرمایہ نہ ہو۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے تو یہ زبان اس حوالے سے بہت زیادہ خوش قسمت ہے کہ اسے ایک عرصہ تک فارسی اور عربی زبان و ادب کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس لیے آج اُردو برصغیر اور دنیا کے دیگر کئی ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

پاکستان سے باہر ادب شناس اور ادب پرور پاکستانی اپنی ذمہ داریوں کا احساس

کرتے ہوئے دیارِ غیر میں فروغ ادب کے لیے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پاکستان سے باہر اُردو ادب کی ترقی و ترویج ایسے سفیرانِ ادب کی بدولت ہی ممکن ہو سکتی ہے اور ایسے لوگوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ور اُن کے کام کی پذیرائی کرنا ہمارے ادبی اور اخلاقی فرائض میں شامل ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ہمیشہ شہروں سے لے کر مضافات اور وطن عزیز سے لے کر دیارِ غیر تک آباد پاکستانی اہلِ قلم کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ اپنی تخلیقات سے اُردو ادب کو تازگی بھی بخشی ہے۔ کچھ شاعر اور ادیب وسائل اور وقت کی عدم دستیابی کے باعث صرف تخلیقی عمل تک ہی محدود رہ جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔ لیکن کچھ لوگ جن کے پاس خوش قسمتی سے تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ وقت اور وسائل بھی موجود ہوتے ہیں وہ لوگ ادب کی بہترین خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔ دیارِ غیر میں آباد ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی ادب شناسی اور ادب پروری سے وہاں اُردو ادب پروان چڑھ رہا ہے اور اُن کی خدمات کا صلہ دینے کے لئے ہمارے پاس سوائے دُعاؤں کے اور کچھ بھی نہیں۔

میں آخر میں اُن تمام سفیرانِ اُردو ادب کو عقیدت بھرا اسلام پیش کرنا چاہوں گا جو دیارِ غیر جا کر اپنی زبان کے وقار کو بڑھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم (سرگودھا)

۱۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار واقعی مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ بظاہر وہ روزی روٹی کمانے کے بکھیڑوں میں اُلجھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر اُن ممالک میں اردو زبان کے تعارف، فروغ اور ترویج میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے ایثار کی داد دینی چاہیے کہ وہ سلسلہ روزگار سے کچھ نہ کچھ وقت نکال کر علم و ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل دنیا بھر میں اردو

زبان و ادب کے ماضی کے سرمائے سے تعارف کا باعث بن رہا ہے۔ ان تقریبات سے عہد حاضر میں اردو کی فتوحات سے شناسائی ہو رہی ہے اور بیرونِ ملک اردو کتب کی موجودگی سے اس کے مستقبل کی تابناکی کے اشارے ملتے ہیں۔

اردو، جو محض (مغربی) پاکستان کی زبان بن کر رہ گئی تھی، انھیں سفیرانِ اردو کی شبانہ روز محنت سے عالمی سطح پر اجاگر ہو گئی ہے۔ اب دنیا کا کون سا گوشہ ہے، جو اردو کے نام اور کام سے آشنا نہ ہوگا۔

۲۔ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں نے اردو ادب میں عالمی مسائل اور امور کو غیر شعوری طور پر شامل کیا ہے، جس سے دامنِ اردو کو مزید وسعتیں نصیب ہوئی ہیں۔ اب اردو محض ایک خطے کے جذبات و احساسات کی حامل نہیں رہی، اب وہ فقط برصغیر کی تہذیب سے ہی واقف نہیں ہے، اب اس میں صرف ایک دو ملکوں، ایک دو نسلوں، ایک دو قوموں کی ہی بو باس نہیں، بلکہ متنوع اور دلچسپ رنگوں اور ذائقوں نے اس کی شیرینی و حلاوت میں سرچند اضافہ کر دیا ہے۔

۳۔ جہاں تک معیار کا تعلق ہے، اندرون ملک تخلیق کاروں کے ہاں معیار پر کوئی رائے دی جا سکتی ہو تو بیرون ملک تخلیق کاروں پر بھی تبصرہ کرنا چاہیے۔ معیاری اور غیر معیاری کا تعلق اندرون و بیرون ملک سے نہیں، تخلیق کاروں سے ہے۔ وہ کہیں بھی ہوں۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کے کارناموں سے کون واقف نہیں۔ سید تقی عابدی کی تصنیف "چوں مرگ آید" کے مقابلے میں اندرونِ ملک کون ہے؟

۴۔ میں کیا اور میرا اطمینان کیا، البتہ مجھے ذاتی طور پر ان سفیرانِ اردو سے بہت دلچسپی ہے۔ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اردو زبان و ادب کے

لیے جو قربانی دی ہے اور جو اہم کردار ادا کیا ہے، وہی کافی ہے۔

۵۔ میرے خیال میں ان تخلیق کاروں کو دیگر زبانوں کے مطالعات، دیگر ملکوں کی ثقافت، دیگر تہذیبی روایات، دیگر مذاہب کی روحانیات، عالمی سیاسی امور اور بیرونِ ملک پاکستانیوں کے ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، معاشرتی، روحانی اور نفسیاتی و جسمانی مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی نگارشات کا حصہ بنانا چاہیے۔

پروفیسر صدف چنگیزی (کوئٹہ)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اردو ادب کے ایک پرجوش تعمیری تنقید نگار اور ہم درد محقق ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اُس کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہیں اور ہر پہلو سے مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں ادب کو تنقید اور تنقید کو ادب بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ہماری تنقید میں اس قسم کا اشتراک پیدا ہو جائے تو بڑے مسائل حل ہو جائیں گے مگر ہمارے یہاں اس قسم کا اشتراک شاذ ہی نظر آتا ہے۔

شبیہ سب کو ساتھ لے کر چلنے کے قائل ہیں۔ وہ زیادہ تر مضافاتی گوشہ گیر یا نظر انداز شدہ جو ہر قابل اور دل گرفتہ "بیدل" ہوتے ہیں۔ یہ عمل آہستہ آہستہ ایک قافلہ بن رہا ہے جس میں اردو ادب کے نئے امکانات اور وسعتیں پوشیدہ ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جب آپ درد کی راہوں پر نکل پڑتے ہیں تو خود بخود ایک قافلہ بنتا جاتا ہے۔

دل گرفتہ اور لاکھوں کارواں ہم کو ملے
درد کی راہوں پہ جب نکلا تو میں تنہا نہ تھا

شبیہ کی تعمیری تنقید "مضافاتی ادب" میں سورج بن کر ابھری ہے۔ اس سے ایک

مرتبہ پھر اردو ادب میں ایک نئے انداز سے تعمیری بحث کا آغاز ہوا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعے ہمیں نئی جہات سے آشنا کیا ہے۔ ہم ابھی مضافاتی ادب کے سحر میں گرفتار تھے کہ انہوں نے اپنی ایک نئی کتاب ''اردو ادب کے سفیر'' پر لکھنے کی دعوت دی

ع دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

۱۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ وطن سے دوری انسان کو بہت حساس اور محتاط بنا دیتی ہے۔ یہ دونوں باتیں انسان کو نہ صرف مثبت کردار میں ڈھال دیتی ہیں بلکہ تخلیقی قوت کو بھی دو آتشہ بنا دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بیرون ملک زیادہ تر تخلیق کاروں کی تخلیقات میں نئے خیالات اور احساسات ملتے ہیں۔ یقیناً ایک مثبت اور مستحسن عمل ہے۔ دراصل وہ اردو کو گلوبل ویلج کا حصہ بنانے میں مصروف ہیں۔

۲۔ انسان وطن سے دور ہو اور کلام میں وطن کی خوشبو محسوس نہ ہو، ناممکن ہے بلکہ اس کے کھانے پینے، سونے جاگنے، اُٹھنے بیٹھنے میں بھی ...... بشنواز نے چون حکایت می کند کی مسرور کن شکایت ملتی ہے۔ دراصل دوری کسی چیز کی اہمیت کے احساس کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ جس طرح دیکھی ہوئی جنت، ان دیکھی حسین وادی کی صورت میں نسلِ انسان کے DNA میں شامل ہے اور نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح وطن کی یاد بھی انسان کبھی نہیں بھولتا۔ کبھی کبھی تو اس کی یاد ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

یقیناً اردو شعر و ادب کے سفیروں کے کلام میں وطن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

۳۔ ان کی تخلیقات کا معیار بہتر ہے اور بہتری کے آثار بھی ظاہر ہیں۔ جس قدر

میری نظر سے اُن کی تخلیقات گزری ہیں یا گزرتی ہیں (کلی طور پر نمونے ہمارے سامنے نہیں) ان میں بعض چیزیں بہت معیاری، بعض کمزور اور بعض بہت کمزور ہوتی ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی حوصلہ افزا ہیں۔

۴۔ جب تک "فیکون" کا عمل جاری رہے، اُس وقت تک اطمینان ممکن نہیں کیونکہ یہ مسلسل پر فکشن کا عمل ہے۔ اس لئے خوب سے خوب تر کی تلاش ہی دراصل اطمینان کی ایک بے چین صورت ہے۔ جس چیز پر بھی نظر پڑتی ہے ایک حسین کمی، شاید۔ کاش۔ یوں وغیرہ کی صورت میں ضرور اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

صرف احساسِ تکلم کی کمی ہے اِس میں
اے مصور تری تصویر بہت اچھی ہے

آپ نے دیکھا کس قدر سلیقے سے ایک کمی کے احساس کو اُبھار کر حُسن پیدا کیا گیا ہے۔ اسی احساس کا نام تغزل یا شعریت ہے۔ بہرحال دراصل نامطمئن ہونا مطمئن ہونے کی ایک حسین اُمید کا نام ہے۔ میں بھی ان سفیروں کے کلام کو پڑھ کر کبھی خوش ہوتا ہوں، کبھی پر جوش ہو جاتا ہوں، کبھی حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہوں...... اور کبھی خاموش ہو جاتا ہوں...... کیونکہ داناؤں نے کہا ہے کہ ؏ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

اب شبیہ بھائی کا کام سامنے آئے گا تو ہم اُن کے کلام کے نئے نئے اور چھپے پہلوؤں سے آگاہ ہو جائیں گے۔

۵۔ ان سفیروں نے بہت کچھ کیا مگر پھر بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ گویا وہ آٹے کو اچھی طرح گوندھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ صرف نمک کے ذائقے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک رسمِ دنیا کے تحت صرف زیادہ تر مشہور شعرا اور

ادبا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سفارت چند محدود حلقوں تک رہتی ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ مضافات کی طرف توجہ دیں تاکہ ادب میں ایک مثبت ادب دوست روایت کی بنیاد پڑے۔

صوفیہ بیدار (لاہور)

ہجرت کی شام...... زندگی کا جام جس قدر خالی ہو دل اسی قدر لبریز ہو جاتا ہے...... معاونت، آشنائی، درماندگی اور قربت کی فضائیں قدرتی اظہار پر آمادہ رہتی ہیں لہٰذا اس کے لیے ذرائع کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ''نارسائی'' ہی ''اوجِ رسائی'' ہے۔ محبت نقش نہیں احساس ہے۔ ''مسافرت'' اسے ''دوتا'' کر دیتی ہے۔ وصل کا مقام ہجر کی شاموں میں طے ہوتا ہے۔

سمندر پار کر جانا براعظم پھلانگ جانا فضاؤں میں معلق ہو جانا انسانی خواہشات میں احسن ترین ہے خواہش کبھی بے قیمت نہیں ہوتی لہٰذا عوضانے میں ہجرت کی ''پیڑ'' سہنا پڑتی ہے۔ ''مسافرت'' کا ''چلہ'' کھینچنے والے خود کو جدائی کے کنوئیں میں لٹکا لیتے ہیں۔ ریاضت بھری چیخ میں رفاقتوں کے نہیں جدائیوں کے رنگ بھرے ہوتے ہیں اسی لیے سارے ٹپے بول ماہیے نفیس شاعری میں ڈھل کر ادبی تقاضے بھی پورے کرتے ہیں اور لوک دانش سے بھری حیاتی شاعری بھی نبھاتے ہیں......

بیرونِ ملک جانے والے یا جا کر بس جانے والے شعراء نے شاعری کو سنجیدگی سے اپنا رکھا ہے جس کی مثال دوحہ (قطر) میں منعقد ہونے والا سالانہ سیمینار اور مشاعرہ ہے جو وہاں کے ناظرین کی اعلیٰ ترین بلند ذوق و سوچ کا مظہر ہے۔

ہم بیک وقت دو طرح سے سوچتے ہیں فرد اور گروہ کی صورت ہم اپنی انفرادی سوچ کو مکمل طور پر اجتماعیت پر قربان کرنے سے گریزاں رہتے ہیں مگر ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے اور

جو چند مٹھی بھر افراد ایسا نہیں کرتے وہ اپنی شناخت و انفرادیت کی قیمت چکاتے ہیں۔
درحقیقت کوئی نئی بات کہنے کے لیے دائرے سے باہر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

اجتماعی سوچ محدود دائرے میں بند کر دیتی ہے۔ ادب راستے نکالنے کی ترغیب دیتا ہے اُن افراد کی فطرت میں قدرتی تغیر ہوتا ہے جو ''ہجرت'' کی شام میں بسر کرنا جانتے ہیں لہٰذا اپنے 'دوحہ' قیام کے دوران مجھے ایسے بلند پایہ اشعار سننے کو ملے۔ علاوہ ازیں بھارت اور دیگر اردو سمجھنے والی آبادی والے ملکوں میں جو شعر و نثر پڑھنے سننے کو دستیاب ہو رہی ہے وہ کافی بلند پایہ ہے۔ میں نے انٹرنیشنل مشاعروں میں محسوس کیا کہ مسافرت محض احساس نہیں موضوعات کی دنیا کے لیے ایسی 'کھاد' ہے جس سے زمین اور بھی زرخیز ہو جاتی ہے۔ موضوعات کا تنوع اور زندگی برتنے کا نیا ڈھنگ ادب میں نئے قرینے سے در آتا ہے۔

بمبئی کے ایک شاعر مقیم ہیں دوحہ میں نبیل مگر وہ اردو صاف بولتے ہیں اُن کے دو شعر رقم کر رہی ہوں:

عادتاً سلجھا رہا تھا گتھیاں کل رات کو
دل پریشاں تھا بہت اور مسئلہ کوئی نہ تھا

(شامِ ہجرت)

میں اگر ٹوٹا تو سارا شہر بکھرے گا نبیل
ایسا پتھر ہوں فصیلِ شہر کی بنیاد کا

(زندگی سے نبرد آزما)

یہ دونوں احساس متضاد نہیں برعکس نہیں متصادم نہیں روبرو ہیں یہ آئینے سے بھی مکالمہ نہیں دو احساس کا ایک ساتھ پرورش ہونا ہے۔

مسافر شاعر کی شامِ ہجر گتھیاں سلجھانے کی ایسی ریزہ کاری ہے جو ایک عادت کی

طرح اُنگلیوں کی پوروں پر تسبیح کا لمس بن جاتی ہے۔ مسافر شاعر و ادیب کو جن معاملات روزگار سے وہاں نپٹنا پڑتا ہے وہ اُسے فصیلِ شہر کی بنیاد کا ایسا پتھر بنا دیتے ہیں جو شہر اُلٹا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

موسیقی میں بھی دو ہی طرح کے ''سُر'' لگتے ہیں۔ ''کومل'' اور ''تیور'' آواز یا چیخ ہے یا سرگوشی یہ دو انتہائیں ہمیں دیارِ غیر میں بسنے والی اپنائیت بھری شاعری میں ملتی ہیں۔

جن کے جسم ہجرت نہیں کرتے اُن کے دل سینوں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔

ایسے میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا ایک ایک شعر اور ایک نظم پتھر ہوتے انسان اور انسان ہوتے ہوئے پتھر کے درمیان ہے۔ نظم ''پتھر'' مصرعہ

آنکھ نیلم کی بدن کانچ کا دل پتھر کا

یہ وہ سارے احساس ہیں جو ٹھہر جانے کی صورت ہوتے ہیں ''حرکت'' پتھر کو انسان کرتی ہے، مسافرت میں دل پگھلتے ہیں تو بحرین میں رہنے والے شاعر طاہر عظیم کہتے ہیں:

میرے چہرے پہ لکھا ہے کیا کیا
سچ بتا تو نے پڑھا ہے کیا کیا

....

صرف اک آنچ کی ضرورت ہے
حرف کتنے ہی منجمد مجھ میں

....

تیرے چہرے پہ ٹھہر جاتا تھا
اور نظروں کو کدھر جانا تھا

....

بہت سوچا جہاں تک سوچنا تھا
ہمیں کیا آسماں تک سوچنا تھا

ساقی فاروقی کی شاعری اور شہرت کا سفر بھی وطن اور بے وطنی کے احساس سے مربوط ہے۔ کبھی جب وطن میں پردیسی ہوتے تو اور ڈھنگ کہا اور کبھی جب پوری دنیا وطن ہو گئی تو وسعت یہاں تک سمٹ آئی۔

وقت ابھی پیدا نہ ہوا تھا تم بھی راز میں تھے
ایک سسکتا سناٹا تھا ہم آغاز میں تھے

....

میں اپنے زخم دیکھتا تیرا ماتم کرنے کے لیے
مری آنکھوں میں آنسو آئے تیری آنکھیں نم کرنے کے لیے

....

مٹی سے ہوا منسوب مگر آتش کھانے سے جلتا ہوں
کئی سورج مجھ میں ڈوب گئے میرا سایہ کم کرنے کے لیے

....

احمد مشتاق اشعار اور تصور کا کینوس اس قدر وسیع کر دیتے ہیں جو مسافرت کے بنا ممکن نہیں۔

ہجر اِک وقفۂ بیدار ہے دو نیندوں میں
وصل اک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں

....

بہت اداس ہو تم اور میں بھی بیٹھا ہوں
گئے دنوں کی کمر سے کمر لگائے ہوئے

....

افتخار نسیم اِفتی دو پگڈنڈیوں کے مسافر ہیں...... احساسات سے لبریز ہیں وہ اپنی پیدائش پہ کڑوے لڈو بٹنے کی بات شاعری میں رقم کرتے ہیں...... جو جھجک سچ بولنے سے روکتی ہے اُس سے گریزاں رہتے ہیں۔ ''گریز'' اور ''بند آنکھ کا سفر'' زندگی کے دو اُبھرے ہوئے نقوش حسن کو نما . آ قلمبند کیا ہے افتخار نسیم

کٹی ہے عمر کسی آبدوز کشتی میں
سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا

....

لہروں کے ساتھ پھول بھی آتے ہیں اس طرف
رہتا ہے کوئی میرا سمندر کے پار بھی

....

سیالکوٹ کی زرخیز مٹی نے جہاں ہمارے قلم کی آبیاری کی ہے وہیں ایک نوجوان شاعر زوار حسین زائر کو دردِ ہجرت سے آشنا کر کے صحراؤں میں پھولوں کی پنیریاں چنوادیں...... وہ عرب کی فضاؤں پر تحریر کر رہے ہیں۔

جو مہرباں ہو تو پھر بدگماں نہیں ہوتا
زمیں پہ ہو تو پھر آسماں نہیں ہوتا
یہ بات طے ہے کہ مجھ کو تری محبت میں
فنا تو ہوتا ہے پر رائیگاں نہیں ہوتا

....

آئینہ تو مطمئن تھا عکس دکھلانے کے بعد
میں پریشاں تھا حقیقت سامنے آنے کے بعد

....

یہ کہہ کے پھول کو کانٹوں پہ رکھ دیا اُس نے
میں تھک گیا ہوں تری دیکھ بھال کرتے ہوئے

....

پیڑ تو بویا تھا زائر ہم نے سائے کے لیے
اُس نے دیواریں گرا دیں پرورش پانے کے بعد

....

اے ساعتِ حاضر میں مجھے ڈھونڈنے والے
میں لمحہ ہوں اور صدیاں ہوئے بیت چکا ہوں

....

قیدِ مکاں سے پرواز کرتی لامکاں کے سفر میں یہ شاعری اُن دلہیزوں سے نکلتے قدموں کی دین ہے جو کبھی محبت تو کبھی روزگار کے لیے بے سمت ہوئے وہ جنہوں نے راہیں تلاش کیں وہ جو "بے انت" کی تلاش میں ہیں۔

ڈاکٹر اختر ہاشمی (کراچی)

علام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ پاکستان میں مقیم شعرا اور ادبا اپنے ملک کی تخلیقی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیتے تاہم جب وہ کسی سبب سے بیرون ملک چلے جائیں تو ان کا تخلیقی رویہ تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ جوش و خروش کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل قابلِ تعریف بھی ہے اور لائقِ صد تحسین بھی۔

بیرون ملک مقیم تخلیقی کاروں کو چاہیے کہ وہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کریں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور اپنے شعر و ادب کو اسلامی تہذیب کی آواز بنا دیں۔ ادیبوں کو چاہیے کہ وہ تحقیق اور تنقید کے نئے نئے زاویوں کو پیش کریں اور جس ملک میں وہ مقیم ہوں وہاں کی زبان کو سمجھنے کے بعد وہاں کی شاعری اور ادب کے تراجم اپنی زبان میں پیش کریں۔ میں بیرون ملک مقیم تمام شعرا و ادبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔

شاکر کنڈان (سرگودھا)

سفیر صرف وہ لوگ ہی نہیں ہوتے جو کسی ملک کے حکومتی سطح پر کسی دوسرے ملک

میں نمائندوں کے طور پر بھیجے جاتے ہیں بلکہ ہر وہ شخص اپنے وطن کی جانب سے سفیر کی حیثیت رکھتا ہے جو کسی دوسرے ملک میں رہ رہا ہوتا ہے۔ ان سفیروں کے کئی درجے اور کئی شعبے ہوتے ہیں۔ انہی شعبوں میں ادب بھی ایک شعبہ ہے اور یہ ایسا شعبہ ہے جس سے متعلق شخصیات سفارت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتے ہیں۔ ان شخصیات کا کردار دوسرے شعبوں کے لوگوں سے اہم اور برتر ہوتا ہے۔

پاکستان کے جو ادباء اور شعراء دنیا کے دیگر ممالک میں گردشِ روزگار یا زندگی کے کسی بھی سلسلے میں مقیم ہیں وہ ایسے سفیر ہیں جو اپنے وطن کے تمام شعبۂ ہائے زندگی اور مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سو اُن کی اہمیت اور مراتب کی وجہ سے اُن پر ذمہ داریاں بھی دوسرے لوگوں سے زیادہ عائد ہوتی ہیں۔

ہمارے وطنِ عزیز کے جو اہلِ قلم دوسرے ممالک میں مقیم ہیں انہیں اپنے نمائندے ہونے کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ اپنی اہمیت سے واقف ہیں وہاں اپنے فرائض کو بھی سمجھتے ہیں لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہاں اپنا کردار بڑی عمدگی سے ادا کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جو کردار حکومت کے مقرر کردہ سفرہ کو ادا کرنا چاہیے یہ لوگ اُسے بھی باحسن ادا کر رہے ہیں۔

آج دنیا ایک نقطے پر آ کر سمٹ گئی ہے۔ ہم ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھ کر ہر حرکت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ پاتے ہیں۔ سیٹلائٹ اور میڈیا نے ہمیں ایک دوسرے کے پہلو میں لا بٹھایا ہے۔ الیکٹرونک میڈیا جہاں مناظر ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے وہاں پرنٹ میڈیا اُن کی تفصیل سے آگاہ کر دیتا ہے۔ پالیسیاں، بحثیں، گفتگو، زبان و ادب کی نمائندگی، تحریریں، مزید یہ کہ رسائل، جرائد اور اخبارات کی اشاعت ہمیں ہر روز کی کارگزاریوں سے واقفیت دلاتے رہتے ہیں۔ غیر ممالک میں بسنے والے ادب کے سفراء کی آئے دن شائع ہونے والی کتب اُن کی اپنی شعبے Commitment آگاہ کرتی ہیں

اور ہمیں وطن میں رہتے ہوئے ایک گونہ سکون ملتا ہے۔ کہ جو کچھ ہمیں اپنی زبان کے تعلق سے اظہار کرنا چاہیے وہ ہو رہا ہے اور یہ بہت اطمینان بخش عنصر ہے۔

ایک اور مثبت چیز یہ بھی ہمارے روبرو ہے کہ دنیا کے کونے کونے میں ادبی تنظیمیں اور انجمنیں کام کر رہی ہیں جو اپنے وقت اور پیسے کا صحیح استعمال کر رہی ہیں۔ کچھ انجمنیں تو دانشوروں کو گاہ گاہ اکٹھا کر کے ایک دوسرے سے مل بیٹھ کر ادب کے لئے کچھ کرنے کے لائحہ عمل کو تیار کرتی ہیں۔ خیالات کا تبادلہ کرنے اور نئے نئے پہلوؤں پر مباحث سے ادب کو آگے بڑھانے کے مواقع مہیا کرتی ہیں۔ نیز جہاں بہت کچھ سیکھنے او رادب کے فروغ کے عمل کو تقویت دیتی ہیں وہاں مالی طور پر لوگوں کی امداد کو بھی انہوں نے اپنے کام کا حصہ سمجھ رکھا ہے۔

انجمنوں کے اس عمل سے اختلافات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ جن لوگوں کو امداد کی ضرورت ہوتی ہے وہ محروم رہتے ہیں اور صرف صحافیانہ ادب سے متعلق شخصیات کو نوازا جاتا ہے یا انہی لوگوں کو بار بار شاملِ بخشش کیا جاتا ہے جبکہ بہت سے ایسے لوگ جو خودداری کی زندگی گزار رہے ہیں اُن کو پوچھا تک نہیں جاتا۔

بہرحال ایسے حالات ہر شعبے میں پیش آتے ہیں اور ادباء و شعراء بھی آخر اسی ماحول اور معاشرے کے افراد ہیں۔ ایسی خامیاں، کوتاہیاں یا خودغرضیاں ان سے بھی ہو سکتی ہیں۔ فطرت کے ان حقائق کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ قلم کا تقدس اور لفظ کی حرمت کا بہرحال انہیں زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ ناموس اور وقار کا پاس اہلِ قلم کو دوسروں سے اضافی ہونا چاہیئے...... لیکن یہ احساسات اور ضمیر کی بیداری و زندگی پہ ہے۔ اگر احساس مر نہ جائیں اور ضمیر سو نہ جائے تو ہر پہلو نظروں کے سامنے رہتا ہے۔

عرصہ پہلے ایک انٹرویو کے دوران پوچھے گئے ایک سوال "کیا ادب کی حد یا سرحد ہوتی ہے؟" کا جواب دیتے ہوئے راقم نے کہا تھا:

''ادب کی حد ہوتی ہے، سرحد نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ
ادب کی حد نہیں ہوتی، کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ
ادیب کی حد بھی ہوتی ہے اور سرحد بھی۔ اور ان دونوں کو پاٹنا ادیب کو
کسی صورت زیب نہیں دیتا۔ پھر بحیثیت پاکستانی اور مسلمان ہونے
کے ہم دو حدود میں رہ رہے ہیں۔ ایک حد پاکستانیت کی ہے اور ایک
حد اسلام کی۔ اگر ان دونوں سے ہم نکلنے کی کوشش کریں گے تو وطن کے
غدار اور اللہ تعالیٰ کے باغی قرار پائیں گے لہٰذا انہیں قائم رکھنا ہمارے
فرائض میں شامل ہے۔''

لہٰذا آج بھی میں اسی بات پر زور دوں گا کہ بحیثیت مسلمان اور بحیثیت پاکستانی ہمیں اپنی حدوں اور سرحدوں کا خیال رکھنا ہے۔ اس حوالے سے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ کچھ اہلِ قلم ایسی تحریریں بھی حوالۂ قرطاس کر دیتے ہیں کہ ''ہم نے سارے مسلمانوں کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔'' تو اُن سے یہ کہوں گا کہ اگر ہم اس برادری کے دُکھ درد کا حصہ نہیں بنیں گے تو برادری ہمارا بھی حقہ پانی بند کر دے گی۔ انجام خود سوچیں۔

اب جو چند ایک آوازیں وطن سے یا وطن سے باہر دوسرے ممالک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آ رہی ہیں۔ اُن کا مقابلہ بھی ہم سب نے مل کر کرنا ہے۔

میرے وطن کے سفیر چند ایک اہلِ قلم کو بھی اپنے قلم کے تقدس کا احساس نہیں۔ انہیں احساس بھی دلانا ہے اور انہیں خود بھی چاہیئے کہ وہ اپنی حد اور سرحد کو ذہن میں رکھیں کہ اسی میں ہماری عزت اور بقا ہے۔

اکٹر صغرا صدف (لاہور)

مجھے پاکستان سے باہر کئی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے جن میں ہندوستان

(دبئی، شارجہ، ابوظہبی) امارات، برطانیہ، فرانس، ناروے، ہالینڈ، بیلجیم، امریکہ اور کینیڈا کے کئی شہر شامل ہیں۔ مجھے ایک بات ہر جگہ مشترک نظر آئی کہ جس شہر میں بھی پاکستانیوں کی تعداد ڈبل فگر میں ہے وہاں اردو زبان اور شعروادب و سماجی تنظیم ضرور موجود ہے۔ دراصل یہ پاکستانیوں کی اپنی زبان اور اپنے وطن سے محبت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے دیارِ غیر میں ایک چھوٹا سا پاکستان قائم کر رکھا ہے جہاں مختلف صوبوں کے لوگ مل کر تنظیم قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے ہفتہ وار یا ماہانہ اجلاس منعقد کرتے ہیں عموماً ایسی مجالس میں مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ تنظیمیں سالانہ بہت بڑے اجلاس کانفرنسوں اور مشاعروں کا اہتمام بھی کرتی ہیں جن میں پوری دنیا کے اہلِ ادب شرکت کرتے ہیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ بیرون ممالک مقیم پاکستانی اپنا کردار بہت مثبت انداز میں ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے غیر ملکی زبان کو اپنا کر اپنے وطن اور زبان سے تعلق منقطع نہیں بلکہ اسے مختلف سطحوں پر فروغ دیا ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ اپنے کلچر کی ترویج کر کے اپنی پہچان کو قائم رکھا ہے۔ بیرونِ ملک پاکستانی ادیبوں کی کاوشوں سے اب کئی ممالک میں اردو زبان کو آپشنل زبان کے طور پر سکولوں میں پڑھایا بھی جا رہا ہے جہاں تک ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار ہے یہ سوال تھوڑا مشکل ہے۔ اس لیے کہ جہاں غیر ممالک میں بہت سے جینوئن اور عظیم تخلیق کار موجود ہیں بلکہ اکثر ایسے تخلیق کار ہیں جو یہاں ایک تخلیق کار کے طور پر پہچان بنانے کے بعد وہاں منتقل ہوئے۔ کچھ لوگوں نے دیکھا دیکھی اور صرف اپنی زبان اپنے ملک سے جُوے رہنے اور اپنی تنہائی و ہجر کی کیفیات کو قلم بند کرنے کے لیے اس طرف آئے۔ ان کی تخلیقات کو ادب میں کوئی اعلیٰ مقام تو نہیں دیا جا سکتا مگر زبان کی خدمت کے حوالے سے خراجِ تحسین ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ بیرون ملک تخلیق کاروں کو اپنی تخلیقات کو مزید بہتر بنانے کیلئے پاکستان اور ہندوستان میں لکھی جانے والی شعروادب کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ نقد و تبصرہ کی کتب سے بھی استفادہ کرنا

چاہیے۔ انھیں ماہانہ اجلاس منعقد کر کے ایک تنقیدی اور تحقیقی نشست کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ادب میں نئے رجحانات اور اصطلاحات سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے مطالعہ کو زندگی کا حصہ بنانا چاہیے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی تخلیقات بہت کم پاکستانی قاری تک پہنچتی ہیں انہیں چاہیے کہ یہاں بھی کتب کی ترسیل کو ممکن بنائیں۔

اشرف شریف (لاہور)

ہم سے پہلی نسل آئیڈیل ازم کے ساتھ وابستہ رہی۔ یہ لوگ ذاتی زندگی میں خوشحالی اور معاشرے میں اعلیٰ جمہوری اقدار کے فروغ کے لئے جب لڑتے لڑتے بے بس ہونے لگے تو انہوں نے نئی زمین، نئے لوگ اور نئے مواقع تلاش کر لیے۔ پیدا کرنے والی ماں اور پالنے والی ماں کے پیار کا اصل رنگ انہی آئیڈیلسٹوں نے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کی ہجرت نے اردو زبان کے ادبی اثاثوں کو بھی دنیا بھر میں قابل قدر مقام دلایا۔ افریقہ، یورپ، امریکہ اور ایشیائی ممالک میں ہندوستانی اور پاکستانی ادب کی تمیز کے لیے جو کردار ان ادبی سفیروں نے ادا کیا وہ ہماری الگ سیاسی و ثقافتی پہچان کی بنیاد بنا ہے۔ جاپان، امریکہ، برطانیہ، نیدرلینڈ، کینیڈا اور متحدہ عرب امارات میں پاکستانی نژاد شخصیات نے ادبی و علمی تنظیمیں بنا کر وہاں اردو کی ترویج کو منظم کرنے پر توجہ دی ہے۔ اردو زبان کو دوسرے ممالک میں فروغ دینے کی ان کوششوں کے پیچھے شاید ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ لوگ یہاں پرورش پانے والے اپنے بچوں کی وطن سے وابستگی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اردو ادب سے تعلق جوڑے رکھنا ضروری ہے۔

غالباً نومبر ۲۰۰۸ء کی بات ہے امریکہ سے ڈاکٹر ابراہیم تشریف لائے۔ میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اردو ادب کے لئے بھی امریکہ میں کئی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان سے ملاقات ممتاز رقاصہ اور استاد محترمہ زریں پنا کے توسط سے ہوئی۔ ڈاکٹر

صاحب پچھلے چند برسوں میں اردو ادب کو بطور پراڈکٹ امریکہ میں متعارف کرا رہے ہیں۔ خود شاعر یا ادیب ہونے کے دعویدار نہیں لیکن اردو ادب کو دوسرے ممالک تک پہنچانے کی فکرمندی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا کہ اگر کسی تحریر کی رائلٹی فی جملہ کے حساب سے ہو تو یہ معاوضہ کیا ہونا چاہیے؟ میرا جواب تھا "تین روپے"۔ ڈاکٹر صاحب نے امریکہ میں کئی دہائیوں سے مقیم ایک سینئر ادیبہ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ان کی رائے میں بھی معاوضہ یہی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب میری اس رائے سے بھی متفق دکھائی دیے کہ فی جملہ رائلٹی طے ہونے سے جملے کی شان و شوکت پھر لوٹ آئے گی اور یوں ضرورت سے زیادہ سادہ بیانی کی جگہ نئی ادبی چاشنی سے بھرپور تحریریں سامنے آئیں گی۔

پچھلے دنوں ایک سیمینار میں بڑی طاقتوں کی سیاسی و ثقافتی اجارہ داری کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اس سیمینار میں اردو الفاظ کی جگہ اشتہاری بورڈوں پر رومن الفاظ کے استعمال اور فیشن انڈسٹری کا ذکر بھی رہا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ اگرچہ ہم نے مغربی موسیقی کو جگہ تو دی لیکن ہمارے ساز اور سر ابھی تک اتنے طاقتور ہیں کہ انہوں نے مغربی چیزوں کو مشرقیت عطا کر کے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ لیکن یہ بات واقعی باعث فکرمندی ہے کہ بیرون ملک آباد پاکستانی خاندان اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے کے معاملے میں پریشان ہیں۔ کمپیوٹر اور موبائل فون کی میسجنگ نے بھی رومن اردو کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ کئی ممالک کی حکومتیں اس سلسلے میں ہم سے تعاون کرتی ہیں۔ جاپان اور ایران کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کے شعبے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح ازبکستان کے نامور ادیب تاش مرزا اور ان کی لائق دختر سوویت یونین کے زمانے سے اردو کے خدمت گار ہیں۔ تاش مرزا نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ پاکستانی حکومت اور اہل علم سے تعاون بڑھانے کی درخواست کرتے رہے ہیں۔ نامور محقق ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے "فرہنگ مشترک" کے عنوان سے ایسی فرہنگ ترتیب دی ہے جس میں اردو کے دس ہزار الفاظ درج ہیں اور یہ سارے الفاظ وسط ایشیائی

ریاستوں میں ان ہی معانی میں مستعمل ہیں۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا کہ ہم سے پہلی نسلوں نے کچھ بچی روایات کی خاطر ہجرت کی۔ یہ لوگ اپنے تئیں اب بھی ادبی حلقے بنا کر وہاں مقیم شاعر اور ادیب دوستوں کو جمع رکھتے ہیں لیکن نئی ٹیکنالوجی اور نئے میڈیا نے ان کے بچوں کو اردو تحریر سے دور کر دیا ہے۔ انگریزی زبان پر مہارت سے اچھی ملازمت اور بہترین کیریئر یقینی ہونے کی وجہ سے بھی اردو تحریر اجنبی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ بیرون ممالک مقیم شاعر اور ادیب نئے معاشرے سے کشید تجربات کو ادبی حساسیت کے ساتھ اپنی تخلیقات کا حصہ نہیں بنا پائے۔ چند نام جن میں سلیم الرحمٰن (برطانیہ)، عرفانہ عزیز، منصور آفاق (برطانیہ)، افتخار انی (کینیڈا)، اشرف شاد (آسٹریلیا و یو اے ای) ہیں وہ بھی اپنی ادبی شناخت پاکستان سے بنا کر گئے تھے۔

وطن سے دوری تو ان پرندوں کو بھی بہت تڑپاتی ہے جو ہر برس سائبیریا سے نکلتے ہیں، ہزاروں کلومیٹر کا سفر کرتے ہیں، پاکستانی اور بھارتی زمینوں پر اُڑتے ہیں، ٹھکانے بناتے ہیں اور پھر سائبیریا پلٹ جاتے ہیں۔ ادیب اور شاعر اپنے ماحول سے جدا نہیں رہ سکتا۔ اگر معاشی یا سیاسی جبر اسے کہیں اور لے جائے تو وہ چادر کی طرح اپنا ماحول اوڑھ کر ساتھ لے جاتا ہے۔ اردو شعر و ادب کے سفیر اپنی تخلیقات میں گھر اور وطن سے دوری کا تجربہ بیان کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

سلیم الرحمٰن پچاس برسوں سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ ان کے ہاں مابعد جدیدیت، تخلیقی اور فکری منظر بہت واضح ہیں۔ اردو، پنجابی اور انگریزی پر عبور ہے۔ نظم، ڈرامہ، غزل اور مصوری کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کی کتاب ''منظر جاگتا سوتا ہوا'' سے ایک نظم ''تیسری دنیا کا چہرہ'' وطن سے دوری کے تجربے کو طبقاتی اُفق تک لے جاتی معلوم ہوتی ہے۔

میں نے دیکھا ہے اُسے
اورلی اور "ہیتھرو روڈ" پر
ہاتھ میں تھامے ہوئے کاغذ کے پرزے
ورک پرمٹ، اجنبی گمنام لوگوں کے پتے
مفلسی کا بوجھ غم کے سوٹ کیس
آنکھ میں مانگا ہوا دنیائے نور کا خواب
خوب صورت، بے تعصب روشنی ہی روشنی
کتنے میلوں دور لیکن ایک دھڑکن سے قریب
کوئی ہلتا ہاتھ، روتی آنکھ، کتنے الوداع
اب سو کے موڑ پر ہے
بے مروت یخ بدن، بادِ شمال
نفرتوں کا زہد ہونٹوں پر لئے ریشہ ریشہ چیر دے گی
تیسری دنیا کا چہرہ
بے ضمیری کی علامت اک بھکاری، اک سوال
رات دن تنہائیوں کے
"بولے وارڈ" اور "ایوے نیو" پر
پتی پتی اس کے ہر خواب کو بکھرائے گا

منصور آفاق اور ان کی اہلیہ یاسمین دونوں شعر و نثر سے وابستہ ہیں۔ منصور آفاق کی کتاب "نیند کی نوٹ بک" سے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہم نہیں جانتے روبوٹ سے کچھ وصل وصال
ہم ترے چاند شاید نئے آئے ہوئے ہیں

اے بھوربن کی شکار گاہ عزیز
مرا لشکری کوئی پانی پت نہیں چاہتا

....

باندھ کے رکھتا ہوں مضبوط گرہ میں لیکن
پاکستانی نوٹ کی قیمت گر جاتی ہے

....

عرش تک میانوالی بے کنار لگتا تھا
دیکھتا جسے بھی تھا کوہسار لگتا تھا

....

بارشوں کے موسم میں جب ہوا اُترتی تھی
اپنے گھر کا پرنالہ آبشار لگتا تھا

....

عرفانہ عزیز کو مردانہ وزنانہ ادبی تقسیم سے بالاتر ہو کر دیکھیں تو آج کے اردو شعر میں ان کی آواز بہت بلند اور نمایاں ہے۔ نظریاتی پختگی اور فرانس، اٹلی، یونان اور کینیڈا میں برسوں کی اقامت نے ان کو ثقافتی تنوع سے واقف کیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

''ہجرت نے اگر مجھے لامحدود کرب دیا ہے تو سرمدی لطافتوں سے بھی آشنا کیا ہے۔ تھکے قدموں سے جب بھی کسی چشمے کے پاس ٹھہری ہوں تو ہجرتوں کے زخم دھو لیے ہیں۔ مجھے ہر سرزمین سے محبت ہے اور میرا تعلق ہر سمت سے ہے۔ البتہ میری بسط آرزوئیں ایک مرکز اور ایک نقطے پر سمٹ جانا چاہتی ہیں اور یہ مرکز میرا وطن ہے۔''

عرفانہ عزیز کے مجموعۂ کلام ''کفِ بہار'' سے ''رنگِ شکستہ'' پڑھ لیں۔ یہ نظم دیارِ غیر میں وطن سے دوری کا کرب خوب بیان کرتی ہے۔

آج بھی کافی پھولوں سے مہکتا ہوگا
چاندنی رات میں آنگن گھر کا
اور پھولوں سے پرے
سبز ستوں سے لپٹی
برگ آبی کی سکوں ریز دبیل
خوش نصیبی کی علامت تھی کبھی
جس کے سائے میں جواں سال محبت میری
راحت دید سے مخمور رہی
جام گلگلوں کی طرح
کنجِ گلپوش میں آویزاں تھی
پھر کوئی خواب نما شمع حسیں
روشنی جس کی گواہی دے گی
میں نے ہر پھول کو سینچا تھا لہو سے اپنے
پھر کسی رنگ شکستہ کی طرح
میرا لہو
اجنبی دیس کی مٹی سے شناسا نہ ہوا

عرفانہ عزیز کی شعری خوبیوں کی داد فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی دے چکے ہیں۔ ان کی شاعری نے پاکستانی شعر و ادب کے انقلابی اور جدید خیالات کو بھی بیرونی دنیا میں متعارف کرایا۔

اسد رضوی فرانس میں مقیم ہیں محبت، پاکستانی سماج، یہاں کی اقدار اور قابل نفر - طریق سیا ا کے موضوعا مں ''خزاں خزاں موسم'' کی ایک غزل کے۔

اشعار ملاحظہ کریں:

پگھلا سونا منہ میں ڈالا جاتا ہے
جو بھی اپنوں سے غداری کرتے ہیں
جھنڈوں والی کاریں نیچے ہوتی ہیں
کام مگر سارے بازاری کرتے ہیں

....

افسر اپنے ذاتی کام کی خاطر بھی
باہر کے دورے سرکاری کرتا ہے۔

....

ارشاد قمر مدت سے ہالینڈ میں مقیم ہیں۔ چھ اردو مجموعہ ہائے کلام، ایک پوٹھوہاری شعری مجموعہ اور ایک سفرنامہ تصنیف کیا ہے۔ ان کی نظم "خدایا! یہ زمیں تیری" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

خدایا! یہ زمیں تیری
نظام بحر یا تیرا
اس دنیا کے دامن میں
وطن میرا چمن میرا
مرض ہے جس کو لالچ کا
جکڑ رکھا ہے پنجوں میں
یہی ہے عارضہ جس نے
وفائیں بیچ ڈالی ہیں
مرے بچوں کو لوٹا ہے

تو مائیں بیچ ڈالی ہیں
یہاں انصاف بکتا ہے

....

عدیل شاکر ہالینڈ میں مقیم ہے۔ اس نوجوان شاعر کے پہلے مجموعہ کلام ''تم مجھے روک لو'' سے چند اشعار وطن کے حوالے سے پیش خدمت ہیں:

مار ڈالے گا سفر جانے دے
گھر ہے جیسا بھی ہے گھر جانے دے

....

اسے کیا فیض، اقبال اور غالب
جسے روٹی کے لالے پڑے گئے ہوں

....

یہی تقاضا بھی تھا بقا کا سو رہ گئے ہیں مشین بن کر
وطن سے دوری میں ایسا ہے اب کہ روح مردہ تو دل ہیں بنجر

....

ان تمام شعرا کی اقامت مختلف ممالک کی ہو سکتی ہے لیکن وطن کی محبت، وطن کے حالات اور نئے حقائق کا تجربہ ان سب کے ہاں کسی نہ کسی صورت موجود ہے۔

بیرون ملک ادبی سرگرمیوں کے لیے محدود ماحول اور غیر ملکی زبان کے اخبارات و ٹی وی چینلز سے اردو ادب کے ناکافی تعارف نے مجموعی معیار کو بہتر بنانے کے لیے اس طرح مدد نہیں دی جیسا کہ پاکستان میں معیار سامنے آ رہے ہیں۔ روزگار وہاں اولین ترجیح ہے۔ وہاں کے ادبی ماحول میں عمومی طور پر اس وقت ارتعاش پیدا ہوتا ہے جب پاکستان سے کوئی ممتاز علمی و ادبی شخصیت ان ممالک میں تشریف لے جاتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ

صورت حال اچھی خاصی کاروباری سی معلوم ہونے لگتی ہے۔کوئی ادبی مجلس یا حلقہ پاکستان سے چند شاعروں کو مدعو کرتا ہے اور پھر دیارِ غیر میں مقیم پاکستانی پرستار روپے خرچ کر کے ان کا کلام سنتے ہیں۔ یہ چلن ہرگز برا نہیں لیکن ٹھیکیداری نظام اپنا کر اسے غیر معیاری اور بازاری بنایا جا رہا ہے۔ پاکستان میں کچھ ادبی شخصیات بیرون ملک تعلقات پیدا کر کے ایک طرف کچے پکے شاعروں کو مستند شاعر بنانے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں تو دوسری طرف بڑے نامور شعرا اور نقاد حضرات ان نوآموزوں کی کتابوں کے تحسینی فلیپ لکھ رہے ہیں۔ پاکستان سے معیار کی جعلی سندیں لے کر یہ لوگ جب واپس جاتے ہیں تو اپنی کتاب شائع کرنے والے سے لے کر فلیپ لکھنے والے تک کے ہاتھ میں دعوت نامے کی امید تھما جاتے ہیں۔ایک گروہ بیرونی ممالک کی سیر کر لیتا ہے تو دوسرا اپنی اقامت والے ملک میں ادبی بنیاد پر نمایاں ہونے کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ یوں دونوں کا کام چلتا رہتا ہے لیکن ادبی تخلیقات کا معیار بہتر نہیں ہو پاتا۔

ہم نے یہاں جن شعرا کرام کی منتخب نظمیں اور اشعار ملاحظہ کیے ان میں سے سلیم الرحمٰن، عرفانہ عزیز اور منصورآفاق کا معیار ایک طرف جبکہ اسد رضوی، ارشاد قمر، عدیل شاکر کو دوسری طرف رکھ کر دیکھیں۔ پہلے تینوں کی زبان، روایت، مطالعہ اور شعری ہنر کی سطح باقی تینوں سے کہیں پختہ ہے۔ اسد رضوی، ارشاد قمر اور عدیل شاکر ابھی نوجوان ہیں یقیناً اپنا آپ منوانے کے لئے ان کے پاس بہت وقت ہے۔انہیں اردو شاعری کے نئے قاری کی توقعات پر پورا اترنے کے لئے بہت محنت کرنا ہوگی۔ رہی بات افتخار نسیم (کینیڈا) اور اشرف شاد (آسٹریلیا) کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی تو دونوں کو اچھا لکھنے والا کہا جا سکتا ہے لیکن کہانی کے ساتھ وہ جو خاص اسلوب ہوتا ہے وہ ان دونوں کے ہاں غیر معمولی نہیں۔افتخار نسیم کے متعلق نیلم احمد بشیر اور اشرف شاد کے بارے میں اطہر ندیم صاحب کی رائے بہت اچھی ہے ممکن ہے کہ دونوں دوستی کی بنا پر ان حضرات کو زیادہ نمبر دے رہے

ہوں۔ اشرف شاد ''مسٹر پریذیڈنٹ''، ''مسٹر پرائم منسٹر'' جیسے ناول لکھ چکے ہیں۔

جہاں تک بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کام سے مطمئن ہونے کا سوال ہے تو میرے خیال میں ہمیں اس کے لئے کوئی معیار رکھنے ہوں گے۔ ایک معیار یہ ہوسکتا ہے کہ بیرون ملک مقیم کس تخلیق کار نے ہندوستانی اور پاکستانی نقاد حضرات کی توجہ حاصل کی؟ دوسرا معیار یہ ہوسکتا ہے کہ کس تخلیق کار نے دعوتیں کھلائے بغیر اپنی حیثیت منوائی؟ تیسرا معیار اردو بولنے اور لکھنے والے عام لوگوں میں اس کی مقبولیت ہوسکتی ہے بلکہ ترتیب کے لحاظ سے اگر شعری روایت، زبان، محاورہ اور پختگی کو پہلے نمبر کا معیار قرار دے کر باقی تین معیار ساتھ رکھیں تو ہمیں اپنے دل میں ان کے کام سے مطمئن ہونے کی سطح کا پتہ چل جائے گا۔

بیرونی ممالک میں بہت سال علمی و ادبی کام پاکستانی صحافیوں نے انجام دیا ہے۔ نامور صحافی و شاعر اطہر ندیم ۱۹۷۳ء میں کویت گئے تو اس وقت وہاں سے اردو زبان کا کوئی اخبار اور میگزین شائع نہیں ہو رہا تھا۔ اطہر ندیم نے اشاعتی ادارے ''دارالصوت الخلیج'' کے لیے ہفت روزہ ''صوت الخلیج'' کا خوبصورت اردو ایڈیشن جاری کیا۔ یہ مشرقِ وسطیٰ کا پہلا اردو ہفت روزہ تھا جو ایک سال تک باقاعدگی سے نکلتا رہا پھر بھارتی پروپیگنڈے کے باعث کویتی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ اطہر ندیم نے ہمت نہ ہاری اور وہاں سے ہی ہفت روزہ جاری کیا۔ ۱۹۸۰ء میں انہوں نے کویت سے پہلا باقاعدہ روزنامہ ''صحافت'' جاری کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مشرقِ وسطیٰ میں اردو صحافت کے بانی اطہر ندیم ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں مرحوم خلیل ملک، طاہر پرویز بٹ اور کئی دوسرے صحافی بھیان کے ساتھ وابستہ رہے۔ اطہر ندیم نے کویت میں اقامت کے زمانے میں اردو اور پنجابی سنگت قائم کیں۔ دنیا بھر سے آنے والے اردو و پنجابی اہلِ علم و ادب کو ان مجالس میں مدعو کیا جاتا۔ اطہر ندیم کے دوست اور شاعر کیدار ناتھ کیدار اور ہارون ندیم ایسے پروگراموں

میں خاصے سرگرم رہتے۔

بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے پاس اعلیٰ شعری و نثری ادب کے کلاسیکل نمونے نہیں۔ آج انٹرنیٹ پر بہت سی اعلیٰ تخلیقات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے مگر بیرون ملک مقیم دوست اس جادوئی کتاب سے استفادہ نہیں کر رہے۔ ایک بار کچھ دوست امریکہ سے آئے انہوں نے بتایا کہ سیاسی گپ شپ کے لیے انہوں نے امریکہ میں ایک انٹرنیٹ گروپ بنایا ہے۔ جس کے تمام ارکان ہفتے میں ایک روز مقررہ وقت پر انٹرنیٹ کھولتے ہیں اور مخصوص روم میں جا کر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ ادبی حلقوں کو بھی یہ طریقہ آزمانا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس فن اور ہنر کو کاروباری سرپرستی مل جائے وہ خود بخود بہتری کی جانب رواں دواں ہونے لگتا ہے۔ بیرون ملک رہنے والے اردو شعراء اور ادباء کا کام ترجمہ کروا کر ان ممالک کے اہل ادب تک پہنچائیں، اس سے ان کا کردار ایک پل جیسا بن جائے گا۔ اردو ادب مقبول ہو گا تو اردو کتاب فروخت ہوگی، ہماری شناخت بہتر ہوگی۔

پروفیسر اشتیاق احمد (قصور)

بیرون ملک جانے والے افراد کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جن کی ساری سرگرمیاں معاشی آسودگی کے حصول تک محدود رہتی ہیں۔ دوسری قسم ان اصحاب پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نوع کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وطن عزیز کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ وطن سے محبت کا اظہار تین نمایاں صورتوں میں ہوتا ہے۔ ایک صورت ادبی محافل بالخصوص مشاعروں کا انعقاد ہے۔ دوسری صورت اخبارات اور رسائل کا اجرا اور تیسری صورت متفرق موضوعات پر مشتمل تصانیف کی اشاعت ہے۔ اردو زبان و ادب سے متعلق یہ سرگرمیاں اپنے اپنے دائرہ کار کی مناسبت سے افادیت کا کچھ نہ کچھ پہلو ضرور رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

صاحب نے بجا طور سے ان اصحاب کو" اردو شعر و ادب کے سفیر" قرار دیا ہے۔

ان تینوں سرگرمیوں کا اگر باہم موازنہ کیا جائے تو کتب و رسائل کی اشاعت کو نسبتاً تفوق حاصل ہے کیوں کہ کتب و رسائل سے وہ اصحاب بھی مستفید ہو سکتے ہیں جو براہ راست بوجوہ ان سرگرمیوں میں شمولیت سے محروم رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں سنجیدہ فکری موضوعات پر تحریر کردہ تصانیف سے نئے مباحث پر مکالمے کی تحریک بھی پیدا ہوتی ہے مثلاً ''عالم گیریت' کے موجودہ مباحث کے ضمن میں ان اصحاب کی تحریروں کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

بیرون ملک رہنے والے اصحاب کے تخلیق کردہ ادب کی کیا اہمیت ہے؟ اس سلسلے میں معروف نقاد جیلانی کامران کے ایک مضمون ''تنقید کی بدلی ہوئی توقعات'' سے چند سطور کا اندراج بے محل نہ ہوگا۔ جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> '' ہمارا ادب دو مختلف کہانیاں قلم بند کر رہا ہے۔ ایک کہانی ملک کے اندر لکھی جا رہی ہے جس کا انسان شکستہ پا ہے اور دوسری کہانی سمندر پار کے ملکوں میں ہمارے ملک کے باشندے لکھ رہے ہیں جو محنت اور لگن کی کہانی ہے۔ یہ دوسری نوع کی کہانی لکھی بھی جا رہی ہے اور اس میں جیا بھی جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے سمندر پار کے پاکستانیوں کی کہانی ایک سچی کہانی ہے کیوں کہ یہ ہمارے اصل انسان کا چہرہ دکھاتی ہے۔''

انسان کے جس وجود کو سمندر پار پاکستانیوں کی کہانیاں اور نظمیں آشکار کرتی ہیں اس کے ساتھ ہمارے مستقبل کا رشتہ نمایاں ہوتا ہے۔

محمد اعجاز خاور (لاہور)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی علم پرور کاوشیں ہمیشہ نہاں خانۂ دل میں ان کی فنی بلند قامتی

اور اردو زبان کے فروغ واحیاء کے حوالے سے ہر بار اضافے پر ہی منتج ہوتی ہے۔ ہر بار میں سوچتا ہوں کہ اب آئندہ اس سے بڑھ کر کچھ کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو کچھ توقف اور وقت تو درکار ہوگا مگر اردو ادب کا یہ حاتم طائی، مجھے ایسے بضاعت، لفظ کم شناس اور بے فکرے انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں، لفظوں سے رزق کشید کرتے کرتے حیات کو لطافت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کی دعوت وتحریک کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کا مربیانہ مسکاہٹ لئے مہربان و مشفق چہرہ تمام مصروفیات کو تیج دین کی ترغیب ہے کہ عصری ادب کے تقاضوں اور تخلیق کے عمل کو زندہ رکھنے کے لئے ان کی جستجو میں پہلے سے زیادہ جوش اور تڑپ ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب نے عالمی مجلسِ ادب پاکستان کے تحت ایک اور کتاب شائع کرنے کی ٹھان لی ہے۔ کتاب کا عنوان ''اردو شعروادب کے سفیر'' طے کیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع بیرون ملک اردو ادب میں ہونے والا کام ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک پانچ نکاتی سوالنامہ بھی احباب کو دیا ہے جس میں پوچھا گیا ہے کہ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لئے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟ ان تخلیقات کا معیار کیا ہے؟ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کام سے مطمئن ہیں؟ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہئے؟

یہ پانچ نکاتی ایجنڈا بذات خود ایک مکمل کتاب کا تقاضا ہے۔ جس میں اردو ادب کے وہ فکری وفنی محاسن جو بیرون ملک تخلیق کاروں کے نوکِ قلم اور ذہن رسا میں موجود ہیں۔ انہیں جانچنا اور پرکھنا گویا اک پوری زندگی کا تقاضا ہے جبکہ ہم ٹھہرے لمحوں میں زندہ رہنے والا پل، سو میں نے ڈاکٹر صاحب کا حکم سرآنکھوں پر رکھتے ہوئے ایسے راستے کا تعین کیا ہے جس کی راستی پر بہت کم لوگ معترض ہوں گے۔ من آنم کہ من دانم کے مصداق، اگر ذوق سلیم کی تشنگی برقرار رہے تو اس کی دو وجوہات ہوں گی۔ ایک یہ کہ میرے خواندگان کی

فکری اپج بلند پایہ ہے ثانیاً یہ کہ یہ تخلیقی و تحقیقی عمل ہے اس میں تشنگی برقرار رہے تو یہ اس کے ارتقاء اور نمو کی نشانی ہے لہٰذا میں جان کی امان پا چکا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ معاف کر دیا جاؤں گا۔ میں نے پانچ سوالوں سے جو ایک موضوع کشید کیا ہے وہ یہ ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو کیا کرنا چاہئے۔ کام تو وہ کر رہے ہیں۔ کسی تخلیقی عمل کی سمت متعین کرنا فطری میلان کے زیر اثر اول درجے کا تخلیقی عمل نہیں ہوگا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو میرا یہ کہنا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے؟ بھی قابل گرفت قرار پاتا ہے مگر جب میں ڈاکٹر صاحب کے سوالات سے اپنا جواب کشید کرتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ اردو ادب کے ان سفیروں کی تخلیقات میں عالمی مکالمہ ہونا چاہئے کہ انہوں نے وطن عزیز کی سرحدوں کو عبور کر کے دیارِ غیر کو مسکن بنایا۔ وہاں کی معاشرت میں اپنے جینے کی راہیں تلاش کیں۔ تہذیبی و ثقافتی تفاوت کا کلیجہ چیر کر خود کو سمو دیا۔ اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو جو اپنے وجود میں سمیٹ کر لے گئے تھے اسے مہکانے کی شعوری و لاشعوری کوشش ان کی تخلیقات میں کس قدر نظر آئیں۔ اس پر نقاد کی نقد و نظر اپنی جگہ مگر تخلیق کار کی واردات ایک مکمل سچائی ہے جس کے تخلیقی کرب سے وہ یہی گزرتا اور متشکل کرتا ہے۔ تخلیقی عمل میں جہاں اطمینان شامل ہو وہاں جمود طاری ہو جاتا ہے۔ تخلیق ہمیشہ اپنے خالق کو اپنی جانب پکارتی ہے۔ مائیکل انجلو سے کسی نے کہا کہ آپ مجسمے بہت اچھے بناتے ہیں تو اس نے جواب دیا تھا "مجسمہ تو پتھر میں موجود ہوتا ہے میں تو صرف فالتو پتھر ہٹا دیتا ہوں۔" تخلیقی عمل میں تخلیق کار کی تہذیب اور میلان خوبصورتی اور نئے پن کا احساس پیدا کرتی ہے۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی ادبی کاوشیں اور تخلیقات کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر کے رچاؤ میں ان کی ذات اور فطری جودت کا اظہار ہے۔ ایک فرد جب اپنے معاشرے کو خیر باد کہتا ہے تو اپنے ساتھ اقدار و روایات کا پورا نظام لے کر جاتا ہے پھر اس نئی معاشرت کی اجتماعیت میں کہیں گم ہو جاتا ہے مگر ایک تخلیق کار اپنی اقدار و روایات کو جس شدت کے ساتھ دیارِ غیر میں محبت اور لگاوٹ محسوس کرتا ہے اس کا

اظہار وہ اپنی نگارشات میں کرتا ہے۔ اس سفر میں اُس کا وژن اور مشاہدہ جن نئی جہتوں سے روشناس ہوتا ہے ان کا اتصالی نکتہ تہذیبوں اور تمدن کے ملاپ پر منتج ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر میں جب مغرب و امریکہ نے تہذیبوں کے تصادم کا انسانیت کش فلسفہ پیش کیا ہے میرے خیال میں ان تخلیق کاروں کا موضوع یہی ہونا چاہیے۔ میں یہ بات قطعاً نہیں کہہ رہا کہ ان کی نظر اس جانب نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ اس تھیسس کا اینٹی تھیسس معذرت خواہانہ انداز کی بجائے اگر باقاعدہ فکری بنیادوں پر استوار ہو تو یہ ادب کی فکری آبیاری کا کام ہے۔

ہم تہذیبوں کے تصادم میں جس فکری بے یارومددگاری کی زد میں ہیں، وہ ہمیں نہ تو جارحانہ انداز میں جواب دینے کی راہ دکھاتی ہے اور نہ ہی ہم اُس کا دفاع کر پا رہے ہیں۔ ہماری تہذیب خوں آشامی نہیں ہے کہ ہمیں پوری عالمی برادری شک کی نظر سے دیکھے۔ ہمارے فکری و تہذیبی سوتے امن و آشتی سے پھوٹتے ہیں۔ ہماری تہذیب کے وارث کیا جنگجو ہیں؟ کیا ہماری تہذیب نے جنگ جوئی سے نمو پائی ہے؟؟ ممکن ہے کہ میری اس رائے سے خواندگان اتفاق نہ کریں کہ یہ جنگ جو ہر عہد میں طالع آزمائی اور عالمی غلبے کے لئے نکلتے رہے ہیں وہ مسلمان تھے جس کے پاس وسائل اور طاقت ہے۔ وہ دنیا کو درس دینے کی ذمہ داری از خود قبول کر لیتا ہے جس سے دنیا کا امن و سکون اس کی ہوس جہاں گیری کے باعث برباد ہوتا ہے۔ اس بات کا اینٹی تھیسس بدھا کی تعلیمات اور ان کی مملکت کا ایک خاص وقت کے بعد ختم یا محدود ہونا ہو سکتا ہے کہ عدم تشدد نے انہیں شکست خوردگی سے دوچار کیا۔ آج عالمی امن کی بات کرنے والے عدم تشدد کی بات نہیں کرتے بلکہ بہت زیادہ نرمی اختیار کریں تو وہ کم سے کم دفاع کی بات کرتے ہیں۔ اس لئے دفاعی حکمت عملی عصرِ حاضر میں لازم سمجھی جاتی ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس دھرتی کے فرزندوں کی تخلیقات میں جارحیت تو نہیں مگر دفاع کا عنصر تو غالب ہونا چاہیے۔ اس لئے اپنی فکری

اساس پر اگر ہمارا ادیب اور شاعر ایک واضح سوچ اختیار کرے تو اس کی یہ خدمت صرف اپنے خطے کے لئے گراں قدر ہی نہیں ہوگی بلکہ عالمی برادری کو غور وفکر کی نئی جہتیں اور مسافتیں میسر ہوں گی۔ اس کے وہ تجربات جو اُس نے اپنی معاشرت سے نکل کر ایک بدیسی معرض میں حاصل کئے۔ ان کا بیان ایک خاص پس منظر ہے۔ ہمارے ہاں صوفیاء اور بزرگانِ دین کا کردار اور فکر، دین کے اساسی اصولوں پر مہمیز ہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دربار سرکار اور بادشاہوں کے اعمال پر کڑی تنقید کی اور عوام کی فکری وروحانی رہنمائی کی۔ جب مسلمان فاتحین نے مشرق ومغرب میں گھوڑے دوڑائے اس وقت متوازن فکر ہمارے انہی بزرگان نے فراہم کی۔ اس معاشرت میں ان کا اختلافی ردعمل اور لوگوں کو متوازن کردار کی طرف مائل کرنے کی مساعی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تھی۔ اس وقت ہمارے صوفی شعراء کا جو بھی اثاثہ یا ورثہ ہمارے پاس موجود ہے، وہ اس عہد کے ان مسائل کا احاطہ کرتا ہے جو خوں آشامی کا راستہ روکنے کا باعث تھا۔

میرے خیال میں عصرِ حاضر کا تخلیق کار خواہ وہ اندرون ملک ہے یا بیرون ملک ہے اس کی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ فکری توازن کو قائم رکھنے کے لئے اپنے مخاطب کو ایسی اُلجھنوں سے چھٹکارا دلائے جو اس معروض کو پراگندہ کرنے کا باعث بن رہی ہیں۔ یہ فکری گتھیاں سلجھانا کسی طالع آزما کی تلوار یا بندوق کا کام نہیں بلکہ اسے نوکِ قلم سے نئی روشوں، روشنیوں اور خوش فکریوں سے روشناس کروانے کے بعد ایک قابلِ قبول اور زندہ رہنے کے لائق معاشرہ بنانے کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔

سلمان سعید پروڈیوسر (لاہور)

آپ نے اپنی زیرِ طبع کتاب کے حوالے سے نہایت اہم سوالات اٹھائے ہیں جن کے مختصر جوابات حاضر خدمت ہیں:

ا۔ ہاں، بیرون ملک میں رہنے والے پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج اور ترقی کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جواز جعفری نے بہت عمدہ ریسرچ ورک کیا ہے۔ حال ہی میں بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانیوں کے افسانوں پر مشتمل اُن کی ایک نہایت ضخیم کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ اگر آپ اس کتاب سے استفادہ کریں تو آپ کو اپنے آپ بہت سے سوالات کا جواب مل جائے گا لیکن جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے عصرِ حاضر میں جرمنی میں مقیم معروف افسانہ نگار منیر احمد بین الاقوامی تناظر میں بہت خوبصورت افسانے تحریر کر رہے ہیں۔ اُن کا ہر افسانہ پڑھتے ہوئے ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ کافی سال پہلے مکتبہ میری لائبریری نے ان کا افسانوی مجموعہ ''سبز ستارہ'' شائع کیا تھا۔ اُس افسانوی مجموعے کے تمام افسانے انتہائی متاثر کن تھے۔ منیر صاحب زیادہ تر ''ادبِ لطیف'' میں شائع ہوتے ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں آپ صدیقہ بیگم صاحبہ یا شاہد بخاری صاحب سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک بیرون ملک میں مقیم شاعروں کی تخلیقات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں جرمنی میں مقیم ساقی فاروقی کی شعری خدمات سے کون واقف نہیں۔ ساقی فاروقی صاحب کی شاعری کی ماڈرن سینسبلٹی کے تو منیر نیازی مرحوم جیسے خود پسند شاعر بھی قائل تھے۔

۲۔ جی ہاں، منیر احمد اور ساقی فاروقی دونوں کی تخلیقات میں ہمیں اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو بدرجہ اتم محسوس ہوتی ہے۔

۳۔ منیر احمد صاحب آج کی گلوبل ویلج کے حوالہ سے بہت خوبصورت اور معیاری افسانے تحریر کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر آج منٹو زندہ ہوتے تو وہ بھی منیر احمد کے فن کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتے کیوں کہ

لاشعوری طور پر منیر صاحب منٹو کے اندازِ تحریر سے خاصے متاثر ہیں۔ لیکن کسی بڑے ادیب کی کسی خوبی سے انسپائر ہونے کو میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں سمجھتا۔

۴۔ منیر احمد کے علاوہ ملک میں مقیم نہایت منفرد افسانہ نگار ہیں۔ قیصر تمکین صاحب ان کے تین چار افسانوی مجموعے صدیقہ بیگم (مدیرہ ادبِ لطیف) نے شائع کیے ہیں۔ انہوں نے بھی نہایت اچھوتے موضوعات پر نہایت عمدہ افسانے تحریر کیے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سے افسانہ نگار اچھا ادب تخلیق کر رہے ہیں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بیس پچیس سال پہلے محمد صفدر میر صاحب نے مجھے امریکہ میں مقیم ایک پاکستانی ناول نگار کا ناول دکھایا تھا ''مدار''۔ اس ناول پر میر صاحب نے ''ڈان'' میں بھرپور مضمون لکھا تھا۔ میر صاحب نے مذکورہ ناول کو انٹرنیشنل لیول کی تحریر قرار دیا تھا۔ اتفاق دیکھیے مجھے ناول کا نام تو یاد ہے لیکن ناول نگار کا نام ذہن سے محو ہو گیا ہے۔

بہر کیف جیسا میں نے اس مراسلے کی ابتدا میں تحریر کیا ہے، اس سلسلے میں اگر آپ ڈاکٹر جواز جعفری سے رابطہ کریں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ ہاں یاد آیا، شکاگو میں مقیم افتخار نسیم صاحب کی شعری خدمات کو تسلیم نہ کرنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ میری ذاتی رائے میں وہ جتنے بڑے شاعر ہیں ہم نے انہیں اتنا بڑا مقام نہیں دیا۔ نثری ادب میں فرحت پروین صاحبہ کے امریکہ کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوی مجموعوں ''منجمد'' اور ''ریستوران کی کھڑکی سے'' میں نہایت Grim موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ نیلم احمد بشیر صاحبہ بھی امریکہ میں ہوتی ہیں کبھی پاکستان میں۔ عجیب اتفاق ہے کہ امریکہ کے پس منظر میں تحریر کیے ہوئے اُن کے تمام افسانے منفرد اہمیت کے حامل بھی ہیں اور قابلِ توجہ بھی۔

۵۔ بیرونی ممالک میں مقیم تمام افسانہ نگاروں اور شاعروں کو پاکستان کی ''موجودہ'' صورتِ حال پر احتجاج کے طور پر ضرور قلم اٹھانا چاہیے کیونکہ قلم ایٹم بم سے کہیں زیادہ متاثر ہتھیار ہے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ادبی تاریخ اُنہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

عمر گل عسکر (کوئٹہ)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک نام جو دوستوں کے ذریعہ معرفی ہوا، اور کام کے ذریعے نمایاں۔ ابھی ہم ان کے مضافاتی شعروادب کی کتاب پر ہی سر دُھن رہے تھے کہ ان کے ''اردو شعروادب کے سفیر'' نامی کتاب کا غلغلا اُٹھا۔ طریق شہرت مختلف، مگر یہ بھی کیا کم باعث توصیف کہ انہوں نے ایک اہم کام کرنے کا بیڑہ تو اٹھایا اور مضافاتی شعروادب کی کتاب میں ان تمام رنگوں کو یکجا کر کے ذہنی اُفق کے کناروں پر ایک ایسی قوس وقزح کھینچ ڈالی جو پائیدار بھی ہے اور دائمی بھی، جو سورج کے کسی زاویہ بدلنے سے معدوم نہیں ہوگی۔

۱۔ اور اب ''اردو شعروادب کے سفیر'' جس کا تعلق بیرون ملک پاکستان اردو کے شعرا اور ادبا سے ہے۔ دنیا بھر کے حوالے سے یہ احاطہ کیوں کر ممکن ہوگا یہ تو ہم نہیں جانتے۔ اس کے لئے ساری مشقت ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو ہی اٹھانی ہو گی۔ لیکن یہ بات بہر طور شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لئے نہ صرف اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ کارزارِ حیات کے اجنبی ماحول اور جدید سائنس وٹیکنالوجی کے وسیع پھیلاؤ میں ان کے فکری احکامات اور توجیہات کا دائرہ بھی وسیع تر ہو چکا ہے۔ ایسے میں مشرقی فکر کے امتزاج کے ساتھ وہ کس حد تک مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہوگا لیکن جو کچھ اور جس قدر بھی حاصل ہوگا وہ

فکری بلندیوں کا حامل ہوگا۔

۲۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار وطن کی محبت سے ہی سرشار نہ ہوں ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس نہ ہوتی ہو۔اس پر کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا۔ اپنے رگ وخون میں وطن سے محبت کے باعث ہی تو وہ وطن کے سفیر کہلاتے ہیں۔

۳۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کی تخلیق کا معیار تو ناقدین فن ہی کر سکتے ہیں اور فن چونکہ اکتسابی ہوتا ہے اس لئے اس میں ہمہ وقت بہتر سے بہتر کی گنجائش موجود رہتی ہے پھر چونکہ اس کے لئے ماحول کا ہونا بھی بہت ضروری ہے اور وہ بیرون ملک مشینی ماحول میں کس طرح استوار کیا جاتا ہے، یہ بھی پریشانی اور مشکلات کا باعث ہوگا تاہم اگر ان کے لئے معیار کا پیمانہ فکر کی بنیاد پر رکھا جائے، تو یہ کہیں زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کی حساسیت کا درجہ وطن کی محبت میں ہم سے زیادہ ہی ہے۔

۴۔ اطمینان کی جہتیں مختلف ہوسکتی ہیں ایسی بھی کہ بقول شاعر جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے، اور ایسی بھی، کہ ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسو برسنا شروع ہو جائیں اور بعد ازاں دل وجگر میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے۔ ہم نے بہت سے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے بشمول اردو پشتو تخلیق کاروں کی تخلیقات کے پڑھنے سے کچھ ایسا ہی اطمینان قلب پایا ہے اور وہ سب دامے درمے سخنے جو کچھ بھی اپنے جانب سے پیش کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔

۵۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے تخلیقی عمل کو جاری رکھیں بلکہ اس میں بہتری لانے کے لئے آپس میں اخوت ومحبت وباہمی یگانگی کے لئے انہیں اپنے حلقۂ احباب کو بھی وسعت دینا ہوگی، جو شہروں سے ہٹ کر مضافات میں بھی پھیلا ہو یہ ہم

اس لئے کہہ رہے ہیں کہ شہر کے لوگ بہت زیادہ کاروباری بن کر بانجھ پن کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر کوئی نئی چیز سامنے نہیں آتی، اور جو ہوتی ہے وہ بھی ہمہ وقت ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہے اور بوسیدگی کا شکار بن کر تعفن پھیلاتی ہے۔ اس لئے بیرونِ ملک پاکستانیوں سے ہی امید کی جا سکتی ہے کہ وہاں وہ ہر لمحہ نئے نئے ایجادات کے طفیل اپنی فکر کو بلندیوں کی خبر لانے کا پیمبر بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا (لاہور)

شعروادب کی بنیاد حسیات اور تاثرات پر ہونے کی بنا پر اسے بلاشبہ ایک ''آفاقی قدر'' کے طور پر ہر دور میں اہلِ دانش نے توجہات کا مرکز بنائے رکھا ہے۔ عصرِ حاضر میں بھی تلاشِ روزگار کے حوالے سے سمندر پار مقیم صاحبانِ ذوق نے تلخیٔ ایام کو ہنس کر پی جانے کا ایک ایسا راستہ تلاش کرلیا ہے جو ایک جانب تو ان کے فطری میلانات اور خداداد صلاحیتوں کی آبیاری کا ذریعہ بن گیا ہے اور دوسری جانب وہ اس بہانے دیارِ غیر میں اپنی مادری زبان کے فروغ کی علمی و ادبی سعی جاری رکھے ہوئے ہیں جو یقیناً سعیٔ مشکور بھی ہے۔

حُسنِ اتفاق سے وہ اہلِ قلم جو ایک بہتر زندگی کے خواب آنکھوں میں سجائے وطنِ عزیز سے دور ہیں وہ اپنے جسم و جاں کو (فکروخیال کو) ارضی فاصلوں کی کربناک ٹیسوں سے اس وقت محفوظ کر لیتے ہیں جب ان کے قلم سے اردو شعروسخن کے نمائندہ رجحانات مترشح ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو بھی بطریق احسن نبھا رہے ہیں اور کمالِ ہنرمندی سے اپنی متاعِ سخن کے در وا کر کے چشمِ تخیل سے ارضِ پاک کی مٹی کی سوندھی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کرتے ہوئے اس شعر کی مصداق ہو جاتے ہیں۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

بیرون ملک مقیم اہل قلم کی شعری ونثری خدمات ایک طویل عرصے سے صاحبانِ نقد ونظر سے داد وتحسین حاصل کر رہی ہیں۔ بیرونی دنیا کے نت نئے بدلتے ہوئے تناظر، زمانے کی حیران کن تبدیلیوں اور Lifestyle میں ہر نئے طلوع ہونے والے آفتاب کے ساتھ ان صاحبان علم وفن کے موضوعات واسالیب میں بھی جدت طرازیوں اور فنی محاسن کے نئے زاویوں کی پیش کش نے انہیں معتبر بنا دیا ہے۔

ناقدین شعر وسخن کے کڑے معیارات پر یہ ادبی تخلیقات کس مقام ومرتبہ کی اہل قرار پاتی ہیں یہ رائے دینا تو انہی ناقدین کا منصب ہے۔

حسن اتفاق سے مجھے اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کی غرض سے ڈنمارک، ناروے اور انگلستان جانے کا موقعہ ملا تو وہاں یہ امر انتہائی خوشگوار حیرت کا سبب ثابت ہوا کہ احباب نے مغرب کی چکا چوند میں بھی شعر وسخن کے چراغ روشن کر رکھے ہیں ان میں سے جن چند احباب تک رسائی ہوئی ان میں ناروے میں تو محترم المقام عطاء الحق قاسمی صاحب نے نہ صرف بطور سفیر اپنی سفارتی ذمہ داریوں کو کمالِ مہارت اور حُسنِ خلق سے نبھایا بلکہ اپنی شاعرانہ اور ادیبانہ شخصیت کے محاسن بھی عیاں کیے۔ اس دوران ادھر زبان و ادب کے فروغ کے لیے ان کی خدمات یقیناً نہ صرف ناروے بلکہ پورے اسکنڈے نیویا میں مقیم اہلِ ذوق کے لیے ان کی یادوں کا ایک انمول تحفہ ثابت ہوا۔

اسی طرح ناروے میں مقیم جمشید مسرور صاحب بھی ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں جو اردو زبان وادب کی بے مثال خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ دنیا بھر میں ہونے والے مشاعروں میں ان کی شرکت اور پذیرائی انہیں اردو زبان وادب کا حقیقی نمائندہ بنائے ہوئے ہیں۔ (کوپن ہیگن) ڈنمارک میں ایک علم دوست اور ادب پرور شخصیت

عابد علی صاحب ہیں جو ایک پختہ فکر شاعر ہیں اور پاکستان اور ہندوستان سے آنے والے اردو شعرا و ادبا کی میزبانی میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اسی طرح انگلستان (لندن میں مقیم) ایک نوجوان احسان شاہد کے نام سے مقیم ہے جس سے مجھے زمانہ طالب علمی سے رفاقت کا شرف حاصل ہے۔ یہ ادب دوست شخصیت حقیقی معنوں میں اس وقت ادب کے سفیر کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس شخص کو وطن سے آنے والے ہر صاحب ذوق کی میزبانی کا جنون کی حد تک شوق ہے اور عزت مآب عطاء الحق قاسمی صاحب تو اپنی تحریروں میں اکثر و بیشتر اس کی ادب دوستی کے معترف نظر آتے ہیں۔

نہ صرف احباب بلکہ دیگر تمام ارباب فکر و دانش کی نگارشات یقیناً ہر لحاظ سے لائق صد تحسین ہیں۔ بلاشبہ ان کے شعری و نثری منظر نامے اردو کی کلاسیکی روایت سے لے کر عصر حاضر کے ادبی تقاضوں تک کا سفر بخوبی طے کر رہے ہیں۔

ان احباب کا فرض منصبی یہ ہے کہ ملک کی ثقافتی و ادبی نمائندگی کرتے ہوئے اسلام اور پاکستان کے دانستہ طور پر مجروح کردہ تصور کو درست کرنے کی سعی کریں۔ ان کے لفظوں پر دنیا کو اعتبار ہے اور یہ اس اعتبار کی بدولت کھوئے ہوئے قومی اور ملی وقار کو یقیناً بحال کر سکتے ہیں۔

پروفیسر یونس حسنی (قصور)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن عصر حاضر کے ایک نامور محقق، نقاد، انشاء پرداز، مترجم اور تخلیق کار ہیں۔ اُن کا تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی سفر پچھلی تین دہائیوں پر محیط نظر آتا ہے۔ انہوں نے اُردو ادب کی متعدد اصناف پر کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ یہ کام اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے کسی بھی سطح پر تقلید کو گوارہ نہیں کیا اور نہ ہی اوروں کے وضع کیے

رستے کو اختیار کیا ہے بلکہ اپنے لیے الگ اور جداگانہ راہ کا انتخاب کیا ہے اور اُس پر چل کر دکھایا ہے۔ اس زاویے اور رجحان نے اُن کے کام کو ایک منفرد شناخت اور پہچان عطا کی ہے۔ علمی وادبی حلقوں میں اُن کے کام کو ہر سطح پر سراہا گیا ہے۔ اب یہ کام محققین کے لیے ایک حوالے کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب شبانہ روز محنت اور لگن سے اپنا تحقیقی کام کیے جا رہے ہیں۔ اس میں کسی بھی سطح پر جمود اور ٹھہراؤ نہیں آیا۔ انہوں نے جس صنف پر بھی کام کیا ہے ڈوب کر کیا ہے اور کھوج اور تلاش کو اپنا وطیرہ بنایا ہے۔ کھوج اور تلاش کے اس سفر میں انہوں نے بہت سی مشکلات جھیلی ہیں اور مصائب برداشت کیے ہیں لیکن کسی بھی سطح پر مایوس اور بددل نہیں ہوئے اور نہ کبھی کام سے اکتاہٹ اور بے زاری کا اظہار کیا ہے۔ کھوج اور تلاش کا یہ سفر انہیں نئی نئی منزلوں کی جانب لے گیا ہے۔ وہ منزلیں جن پر قدم قدم پر چیلنج ہیں۔ انہوں نے اپنی راہ میں آنے والے چیلنجوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے اور ہر سطح پر ثابت قدم رہے ہیں۔ اپنی اسی ثابت قدمی، عزم، حوصلے اور محنت سے انہوں نے کامیابی وکامرانی کے کئی ایک ہفت خواں طے کیے ہیں۔

اپنے کام سے عشق کی حد تک وابستگی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے بہت سے ناممکنات کو ممکنات میں بدل دیا اور وہ تحقیقی کام اور موضوعات جن پر پیش رفت نہیں ہوئی تھی اور اگر ہوئی بھی تھی تو اُدھوری، اُن پر کام کا آغاز کیا اور بہت قلیل عرصے میں اُن کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ میرے خیال میں ایسا محض وہی شخص کر سکتا ہے جس نے ہمہ وقت اپنے آپ کو تحقیق کے لیے وقف کر رکھا ہو جس کی نظر عمیق اور گہری ہو۔ فکر رسا اور ذہن روشن ہو جو مفروضات کو چھوڑ کر صرف اور صرف حقائق پر نظر رکھتا ہو اور ان تک رسائی کا حوصلہ اور بصیرت رکھتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مَیں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بصیرت بھی رکھتے ہیں اور علم بھی۔ آگہی بھی رکھتے ہیں اور گہرا

تہذیبی، تاریخی، سیاسی اور سماجی شعور بھی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور خوبی جو مجھے اُن میں نظر آئی وہ اُن کا بڑا پن ہے۔ وہ حقیقت میں ایک بڑے انسان ہیں۔ میں نے کسی معاملے میں اُن کے اندر تعصب اور تنگ نظری نہیں دیکھی۔ اگر کچھ دیکھا ہے تو وہ رواداری اور محبت ہے جو اپنوں اور بیگانوں سب کے ساتھ ہے۔ رواداری اور محبت کے اس پیغام کو انہوں نے ہر سطح پر پروموٹ کیا ہے۔ اس چیز نے انہیں تمام مکتب فکر اور نظریے کے لوگوں میں ہر دلعزیزی عطا کی ہے۔

راقم نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں جو ایک اور بات دیکھی وہ اُن کی تہذیب اور شائستگی ہے۔ یہ تہذیب اور شائستگی اُن کے تمام تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کاموں سے بھی عیاں ہے۔ اُس کے ساتھ اُن کی شخصیت کا دھیمان پن، اُن کا اسلوبِ تکلم، اُن کی نشست و برخاست، اُن کی مہمان نوازی، اپنائیت، ان کا رکھ رکھاؤ اور سب سے بڑھ کر اُن کی ذات اور باطن کا اُجلا پن ملنے والوں کو اُن کے قریب کرتا چلا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب چیزیں اور صلاحیتیں قدرت نے اُن کی ذات میں رکھ چھوڑی ہیں اور اُنکا علمی اظہار ڈاکٹر صاحب کے نظریات و افکار سے برابر ہو رہا ہے۔ راقم کے اس موقف کی تائید وہ تمام لوگ کریں گے جو ڈاکٹر صاحب سے ملے ہیں یا اُن کا ڈاکٹر صاحب سے تحقیق کے سلسلے میں واسطہ پڑتا رہتا ہے یا وہ جو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کالج میں پڑھا رہے ہیں اور اُن کے قریب ہیں۔

میرے خیال میں انسان کو جو چیز بڑا بناتی ہے وہ اُس کی اعلیٰ ظرفی، وسیع المشربی اور اُس کے اندر کی چاہت اور خلوص ہے اور اگر یہ نہ ہو تو انسان بڑا نہیں بن سکتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا شاعر یا ادیب یا محقق کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ عوام میں حقیقی پذیرائی اور مقبولیت اُس کو ملتی ہے جس کی سوچ اور فکر کے زاویے محدود نہیں ہوتے۔ جس کا دل اوروں کے لیے دھڑکتا ہو اور جو ہر اچھے اور بُرے وقت میں اُن کے ساتھ کھڑا ہو جسے

دولت کی چمک دمک خیرہ نہ کرتی ہو۔ اور نہ ہی نمود و نمائش اچھی لگتی ہو جس کی سوچ اور فکر کا محور صرف اور صرف انسان رہتا ہو۔ اُس کے مصائب، اُن کے دُکھ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب بھی انہی معدودے چند لوگوں میں ایک ہیں جنہوں نے اپنا رابطہ اول و آخر اپنے جیسے دوسرے لوگوں سے جوڑے رکھا ہے اور اُس کو کسی بھی سطح پر منقطع نہیں ہونے دیا۔ یہ وصف انہیں اپنے ہم عصروں اور ہم چشموں سے منفرد بنا دیتا ہے۔

جیسا کہ آغاز میں اُن کی تحقیقی کاوشوں کا ذکر ہوا ہے میں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اُن کے ایک نئے تحقیقی کام ''اُردو شعر و ادب کے سفیر'' پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تحقیقی کام جو سراہنے کے قابل ہے اس کا موضوع بدیس میں رہنے والے شعرا، ادیبوں، انشائیہ نگاروں، افسانہ نگاروں کا تذکرہ مرتب کرنے کے ساتھ اُن کی کتب کا احاطہ کرنا ہے جو تواتر سے وہاں کے سیٹ اپ میں چھپتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں بدیسی ادب کی ترقی اور رفتار کا صحیح اندازہ اور ادراک ہے۔ کبھی کبھی اخبارات میں کسی اپنے ہم وطن شاعر یا ادیب کی کسی کتاب کا تذکرہ پڑھنے کو ضرور مل جاتا ہے لیکن بدیسی فضاؤں میں ہماری اُردو زبان میں کیا کچھ تخلیق ہو رہا ہے اور کس طرح اُردو زبان دن بدن فروغ پا رہی ہے اور تارکین اور مقامی افراد کے درمیان اظہار اور ابلاغ کا وسیلہ بن کر سامنے آ رہی ہے۔ اس ضمن میں بحیثیت مجموعی ہمارا علم بہت محدود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی حالیہ تحقیقی کاوش نے ہمارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یورپ، امریکہ، متحدہ امارات اور دوسرے ممالک میں مقیم ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی جو تخلیقات سامنے آ رہی ہیں وہ اس بات کی غمازی کر رہی ہیں کہ دیارِ غیر میں مقیم ہونے، وہاں کا کلچر، تہذیب و تمدن، رسوم و رواج اختیار کرنے کے باوجود ان ادیبوں اور شاعروں نے اپنی جداگانہ پہچان اور شناخت کو قرا کھا ا اپنی تخلقا - کے ذریعے اُردو زبان اور ملک کے نام کو

سر بلند کیا ہے۔ یہ اس بات کی بھی غمازی ہے کہ انہیں اپنے ملک کے ساتھ اپنی قومی زبان سے محبت اور عشق ہے۔ دیارِ غیر میں مقیم ہونے کے باوجود ان قلم کاروں اور تخلیق کاروں کی جڑیں اپنی دھرتی کے اندر ہیں۔ وہ شعوری اور لاشعوری سطح پر اپنے آپ کو اس دھرتی سے جڑا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اپنی دھرتی اور اُس کی مٹی کی خوشبو اُن کی ہر صنف میں مہک رہی ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے اس پہلو کا بخوبی جائزہ لیا ہے کہ ان ممالک میں اُردو زبان و ادب اور دیگر اصناف سُخن پر کام کی رفتار کیا ہے؟ کام کی نوعیت اور اُس کا تخلیقی و تنقیدی معیار کیا ہے؟ اس حوالے سے انہوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے؟ تمام اصناف سُخن کے تحقیقی و تنقیدی معیار کو جانچنے کے لیے اُن کی کھوج اور تلاش کا سفر جاری ہے۔ یہ کھوج اور تلاش ایک ایسے سچے اور کھرے محقق کی ہے جو خود ہر معاملے میں بے لاگ اور غیر جانبدار ہے جو صرف اور صرف اعلیٰ اور اچھے کام کی تحسین کرتا ہے۔ چاہے یہ کام اُن کے کٹر سے کٹر مخالف اور حریف کا کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تخلیقات کا ایک قابلِ قدر سرمایہ اکٹھا کرلیا ہے۔ یہ سرمایہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا اور یقیناً اوجھل رہتا اور بہت دیر کے بعد سامنے آتا ڈاکٹر صاحب کی کھوج، عرق ریزی اور جگر کاوی کی وجہ سے نمایاں ہوکر سامنے آگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کام اس سلسلے میں ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ دستاویز جس کے مطالعے سے ہمارے سامنے ایک فلم سی چلتی نظر آتی ہے۔ یہ فلم جو متحرک ہے۔ اس کے اندر نظر آنے والی تصویریں زندہ اور حقائق پر پورا اُترتی ہیں۔ یہ تصویریں مختلف ادوار میں اجنبی سرزمینوں میں تخلیق ہونے والے ادب کو ہماری نگاہوں کے سامنے لے آتی ہیں۔

اجنبی سرزمینوں اور خطوں میں جا کر کام کرنا کتنا مشکل اور کٹھن ہے یہ وہی جانتا ہے کہ جس نے وہاں جا کر کام کیا ہو۔ اپنے شب و روز بتائے ہوں اور بہت سی ناکامیوں کا سامنا کیا ہو۔ قدم قدم پر مصائب کو جھیلتے ہوئے آگے بڑھا ہو۔ لائبریریوں

کی خاک چھاننے کے ساتھ جو نگری نگری پھرا ہو اور جہاں جہاں سے مواد ملنے کی اُمید ہو وہاں پہنچا ہو۔ جب ہم ڈاکٹر صاحب کے کام کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کیسے متنوع قسم کے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کام سرانجام دے رہے ہیں؟ اُن کی شائع ہونیوالی ہر کتاب اپنے موضوعات تنوع، مواد کی ندرت، تحقیق کے اعلیٰ معیار کو سامنے لا رہی ہے۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ علم و ادب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا جو مقام بنایا ہے وہ سراسر اپنی محنت اور کوشش سے بنایا ہے۔ اُن کا یہ کام ہی اُن کی عظمت اور رفعت کی گواہی دے رہا ہے۔

''اردو شعروادب کے سفیر'' بدیسی شعرا اور ادیبوں کے تخلیقی سفر کی ایک روداد رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے ہمارے سامنے کچھ نئی دنیاؤں کے در وا کیے ہیں۔ یہ دنیائیں کس قسم کے علمی وادبی ذخیرے سے معمور ہیں؟ کیسے کیسے نامور اور نابغۂ روزگار ہستیاں وہاں تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیوں میں مشغول ہیں؟ اور ان کے حسن پارے نہ صرف ہمیں اُن کے سیٹ اَپ اور کلچر سے متعارف کروا رہے ہیں وہاں اس پہلو کو بھی سامنے لا رہے ہیں کہ اُردو زبان نے وہاں ہر صنف میں اپنے اظہار کے لئے نئے وسیلے ڈھونڈے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لسانی حوالے سے جہاں بدیسی شعرا کے کلام کو جانچا اور پرکھا ہے وہاں اُردو زبان کے ارتقا، اور اس میں بدیسی زبانوں اور اُن کے الفاظ کی آمیزش اور اس سے بننے والے نئے مرکبات اور محاورات پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بدیسی زبانوں اور الفاظ سے کماحقہٗ آگہی ہے۔ وہ اُن زبانوں کے مزاج اور کلچر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ''اُردو شعرو ادب کے سفیر'' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

''اردو شعروادب کے سفر'' کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے عہد جدید کے

محققین اور ناقدین کو جہاں ایک نئے Topic اور موضوع سے متعارف کروایا ہے وہاں اُن کے اندر یہ تحریک پیدا کی ہے کہ وہ بھی روایت سے ہٹ کر نئے نئے موضوعات پر کام کرنے کو اپنا شعار بنائیں۔ لکیر کے فقیر بننے کی بجائے کھوج، تلاش اور جستجو کے اصول اور پہلو کو اختیار کریں اور اصول کو بنیاد بنا کر تحقیق کے سفر میں آگے بڑھیں۔ خود ڈاکٹر صاحب اس اصول پر کاربند رہتے ہوئے اپنا تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اُن کے کام کی پذیرائی نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان اور یورپ کے ان تمام ممالک میں ہوتی ہے جہاں اُردو زبان بولی بھی اور پڑھی جاتی ہے۔ یہی اُن کے اچھے اور معیاری کام کی سند اور دلیل ہے۔

ڈاکٹر عطاء الرحمن (لاہور)

تہذیب انسانی کے ارتقائی مراحل اس بات کے غماز ہیں کہ انسان اپنی پیدائش سے ہی نغمہ وسرور کا دلدادہ رہا ہے۔ نغمہ طیور، آبشاروں کے جھرنوں سے پھوٹتی موسیقی، ہواؤں کی سرسراہٹ، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، خود اپنے قدموں کی آہٹ، بچوں کی بلبلاہٹ، معصوم لبوں کی کھلتی مسکراہٹ، رونا دھونا، پرندوں کا چہچہانا، قمریوں کا گیت گانا، تیتروں کا سبحان تیری قدرت کا پاکیزہ راگ الاپنا، پپیہا کا اللہ اللہ کہہ کر اللہ سبحان تعالیٰ کی کبریائی بیان کرنا، یہ سب اس بات کا مظہر ہیں۔ کہ خالق کائنات نے مظاہر فطرت کے ذریعے نفس انسانی کی تربیت کا سامان فراہم کیا۔

اہل عرب اپنی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کے سامنے سب کو ہیچ سمجھتے تھے اور غیر عربوں کو عجمی کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے انھیں چیلنج کیا۔ تو وہ قرآن پاک کے مقابلے میں اپنی بے بسی و بے چارگی کا اظہار کرنے لگے۔ اور بہت سے نامور شعراء نے تو

شاعری کے فن سے توبہ کرلی۔

قبل مسیح میں بھی شاعری کا وجود مسلم رہا ہے اور بہت سے یونانی مفکرین نے شاعری کے ذریعے ہی اپنے کتھارسس کا اظہار کیا ہے۔ مسیح موعود کے بعد بھی شعر وشاعری کی کونپلیں مرجھانے کی بجائے خوبصورت برگ و بار سے آراستہ رہی ہیں۔ مغرب میں جہاں ورڈز ورتھ، کیٹس، شیکسپیئر، شیلے، بائرن اور دیگر شعرا نے اپنی تخلیقات کے ذریعے قوم کی رہنمائی کی، دکھ درد بانٹا، ہجر و فراق اور مظاہر فطرت کو اپنے stanzas میں پینٹ کیا وہاں اہل مشرق بھی اس میدان میں ان سے پیچھے نہ رہے، بہمنی شاہیہ دور ہو یا عادل شاہی دور حکمرانی، سلاطین دہلی کا دور سلطنت ہو یا سلاطین تیموریہ کی بادشاہت، حتیٰ کہ مسلمانوں کے عہد زوال میں بھی اردو شاعری پوری سطوت و ثروت کے ساتھ اپنے وجود کا لوہا منواتی رہی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد فکر معاش کی تلاش میں بہت سے اہل وطن دیار غیر میں جا کر بس گئے۔ ان سمندر پار بسنے والے پاکستانیوں میں زندگی کے مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگ شامل ہیں۔ جو نہ صرف بیرون ملک رہ کر اپنے وطن کی سفارت کاری کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں بلکہ وہاں رہتے ہوئے اپنی مشرقی اور اسلامی اقدار کی ترویج و ترقی کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ اپنی معاشی مصروفیات کے باوجود شعر و ادب سے انھیں والہانہ لگاؤ ہے۔ بسا اوقات تو ان کی شاعری کا عمیق تجزیہ اس بات پر دال ہے کہ برس ہا برس سے سمندر پار رہنے والے ان پاکستانیوں کے دلوں سے وطن کی دھرتی کی خوشبو کم نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے اشعار میں وطن سے دوری کی کسک صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

بقول انور سدید ان کی شاعری میں وطن سے محبت، معاشرے کی عکاسی، شخصیت کی اہمیت، حزن وملال، عزم وہمت، ادراک حقیقت، زندگی کا تصور، داخلیت، خارجیت، نشاطیت، ایسے رویے ملتے ہیں۔

شاعری میں غم دوراں زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ وقت کے چاک پر نرم و ملائم مٹی سے مورتیوں کو شکل پذیر ہوتا دیکھتے ہیں اور پھر یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ زمانے کی دیمک ان پر کیسے کیسے تبصرے لکھتی ہے اور کوزہ گر کی بنائی شکل اس قدر تبدیل کر دیتی ہے کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ پردیسی شعراء ان مناظر، مظاہر اور اشیاء سے اپنا تاثر کشید کرتے ہیں۔ اور اسے شاعری کی صنف میں یوں پروتے ہیں کہ کبھی یہ شاعری مہکنے لگتی ہے اور کبھی اس کی چبھن سے دل میں درد کی ٹیس اٹھنے لگتی ہے۔

ظہور رضا بخاری کی شاعری انسانی رویوں اور جذبات سے عبارت ہے۔ اس میں موسموں کی سی تبدیلی جہاں قارئین کو دلچسپی لینے پر مجبور کرتی ہے وہاں وطن عزیز کے حالات کا نوحہ بھی ہے۔ لیکن یہ نوحہ یاسیت کے بجائے رجائیت سے بھرپور ہے۔

نظم دیکھیے:

یہ مانا اب تلک ہر سو خزاؤں کا بسیرا ہے
دھواں ہے غم کے بادل ہیں
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
کہیں کوئل چہکتی ہے نہ بلبل گاتی ہے
مگر یوں کب تلک ہوگا
ذرا ٹھہرو
چمن خوشبو سے مہکے گا، پرندے گیت گائیں گے
یہ بادل چھٹ ہی جائیں گے
یہ بادل چھٹ ہی جائیں گے
مجھے پورا بھروسا ہے، بہاریں لوٹ آئیں گی
ذرا سی دیر باقی ہے

ذرا سی دیر باقی ہے

لہو کو رنگ لانے دو

نیا منظر بسانے دو

یہ اٹل حقیقت ہے کہ ہر تخلیق کار کے اندر ایک خلا ہوتا ہے جو اسے تخلیق پر اکساتا ہے ایک وحشت، ایک کرب، ایک ادھورا پن، تخلیق وحشتوں کو ختم نہیں کرتی، دبا دیتی ہے انسان تھوڑی دیر کے لیے سب غم کاغذ پر اتار کر مطمئن تو ہو جاتا ہے مگر پھر rebound ہوتا pheno menon ہے۔ پہلے سے زیادہ ایجی ٹیشن، اوکشن کی طرح، تخلیقی سفر میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب انسان مستقل ریاضت سے تھک جاتا ہے ناشنیدہ آرزوئیں آگ کی مانند سارے بدن میں پھیل جاتی ہیں۔ خواہش امید کا دامن چھوڑ کر وحشت کا رنگ اپنا لیتی ہے۔ ہجر کی گیانی مسکراہٹ، میں ایسی دیوانگی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ تب شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کوئی ایسا ہو جس کی ذات کے پردے میں سب دکھ سمیٹے جا سکیں۔ تخلیقی سفر میں خالد ادریس بھی اس مرحلے سے دو چار ہوا ہے۔ شاعر نے سنجیدہ اور معیاری شاعری کو اہمیت دی ہے۔

نمونہ دیکھیے۔

ذرّے ذرّے میں ہے بس تیری جستجو

ذرّہ ذرّہ کہے اللہ ہو، اللہ ہو

تو ہی مشکل کشا تو ہی حاجت روا

تو ہی رکھتا ہے ہر شخص کی آبرو

باغ میں، پھول میں، چاند کے نور میں

جا بجا ہے تو ہی، بس تو ہی چار سو

....

غم دوراں ستائے تو مجھے آواز دے لینا
جو وحشت لوٹ آئے تو مجھے آواز دے لینا
کسی کی یاد کا جگنو، کسی کے پیار کا سایہ
تمھیں شب بھر جگائے تو مجھے آواز دے لینا
برکھا رت میں تیری یادیں مجھ کو پاگل کر دیتی ہیں
پھیکا موسم بھیگی راتیں مجھ کو پاگل کر دیتی ہیں

پروین شیر گل کا شعری مجموعہ ''کرچیاں'' خوبصورت شاعری کے ساتھ ساتھ مصوری سے بھی عبارت ہے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت ہے کہ قلم، برش، لفظ اور رنگ باہم مل کر ان کی شخصیت کا نادر پہلو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا اعجاز ہے کہ تخلیقی قوت کے ساتھ ان کے اندر ایک خوبصورت فنکارہ اور مصور بھی موجود ہے۔

انور سدید کے مطابق: ''مصوری اور موسیقی'' پروین شیر کے فن کے اختصاصی زاویے ہیں۔ انھوں نے مصوری کی تربیت منی ٹوبا یونیورسٹی میں فائن آرٹس کے پروگرام میں شمولیت کر کے حاصل کی۔ لیکن شاعری اور موسیقی میرائے فیاض کا عطیہ معلوم ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی سیاحت نے انھیں دنیا کے متضاد رویوں، دوہرے معیاروں اور سماجی انصاف کے غیر مساوی پیمانوں سے متعارف کرایا۔ اور ان کے باطن کو درد سے بھر دیا۔ جو صرف ایک مشرقی عورت ہی کے دل ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جو بیک وقت بیٹی اور بہن بھی ہے۔ لیکن جس کا سراپا ماں کے فرض میں لپٹا ہوا ہے۔ پروین شیر نے خود اپنا تجزیہ کیا تو لکھا۔

''یہ دنیا ایک تجربہ گاہ ہے۔ جس میں ہر گھڑی نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں کبھی کبھی حالات کے تیزاب سے احساسات کے جسم مجروح ہو جاتے ہیں۔ شیشے کا پیمانہ دل سنگ حقیقت سے ٹکراتا ہے تو اس کی کرچیاں دور دور تک بکھر جاتی ہیں۔ انھیں سمیٹنے کے

لیے مجھے میرے تین ہم سفروں نے ہمیشہ سہارا دیا۔ میرا قلم، موئے قلم اور ستار، میرے یہ تین ساتھی میرے ذہن کو منجمد ہونے اور سوچوں کو منتشر ہونے سے بچاتے ہیں۔ جب بھی احساس کے آنچل کو دل کی انگلیوں نے تھام لیا اور خوابوں کے گلاب شاخ مژگاں پر کھل اٹھے تو سچائی نظموں اور غزلوں کی شکل میں سامنے آ گئی۔ کینوس پر رنگوں کی دنیا ئیں ابھر آئیں۔ ''کرچیاں'' میرے تجربوں کا آہنگ ہے''......

چار سطروں کی ایک دردناک نظم ''بے چارگی'' یوں ہے۔

منزلوں کی جستجو میں آبلہ پا

چل رہا تھا کب سے وہ دشت بلا میں

آنسوؤں کی ٹھنڈی چادر میں سمٹ کر

اب سلگتی ریت پر بے سدھ پڑا ہے

(۳۰ مئی ۲۰۰۸ء......نوائے وقت لاہور)

....

جدہ میں مقیم محمد سبطین شاہجہانی بھی عرصہ دراز سے وطن کی آغوش سے دور رہ کر شعر و ادب کے ذریعے سے اردو ادب میں ثروت کا اضافہ بن رہے ہیں۔ جدہ کا نظارہ ان کے جذبات کو مہمیز لگاتا ہے تو ان کا قلم حجاج کرام کی آمد کی اس طرح عکاسی کرتا ہے۔ نظم ''جدہ میں'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

رواں ہے کیف کی وہ آب شار جدہ میں

کھلا ہے راز سرور و خمار جدہ میں

بوقت شام کئی لاکھ قمقموں کی ضیاء

رواں ہے صورت لیل و نہار جدہ میں

ہر ایک ملک سے حجاج آتے جاتے ہیں
کہ تلبیہ سے ہے روشن مطار جدہ میں
طواف کعبہ کے پر کیف منظروں کی قسم
فقیر بنتے ہیں سب تاجدار جدہ میں
جو اک مثال میں شاہان ذی چشم کے لیے
ملیں گے ایسے بھی کچھ خاکسار جدہ میں
جناب حوا کے مرقد کی برکتوں کے طفیل
فضا ہے بہت مشکبار جدہ میں
سکوں تلاشتے ہیں سب سکوں کے دیوانے
قرار ڈھونڈتے ہیں بے قرار جدہ میں
وطن سے بڑھ کے یہاں ہے سکون و آسائش
غریب کب ہیں غریب الدیار جدہ میں

بیرون ممالک میں مقیم پاکستانیوں کا آپس میں سلوک اور رویہ، بے غرض، پر خلوص اور ایثار و محبت سے عبارت ہوتا ہے۔ وہ وطن سے دور رہ کر بھی وطن کے حالات سے باخبر رہتے ہیں اور کیوں نہ ہو وہ اس پاک دھرتی کے باسی ہیں جہاں ان کی جنم نال گڑھی ہے۔ یوں دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبوان کے من میں ہر لحہ نئی جوت جگائے رکھتی ہے۔ وطن عزیز سے کوئی شاعر، ادیب یا فنکار چلا جائے تو یہ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ خاطر تواضع کے ساتھ ساتھ اس کے اعزاز میں پر وقار تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اگر شخصیت ادبی قد کاٹھ کی حامل ہو تو تقریب کا رنگ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور پھر سننے سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک تقریب منعقدہ ''دوحہ'' میں ماہانہ طرحی مشاعرہ کی روداد دیکھئے۔ جس کی صدارت بزرگ شاعر عزیز رشیدی نے کی، مہمان خصوصی عبداللہ العمودی جبکہ شریف

ناصر مہمان اعزازی تھے۔

وہ جس نے قیصر و کسریٰ کو کر دیا معدوم
وہی ہے پختگی اب بھی میرے ارادوں میں

(عزیز رشیدی)

ہم ایسے لاکھوں کروڑوں میں ایک ہیں راشدؔ
شمار جن کا فقیروں میں ہے نہ میروں میں

(ممتاز راشدؔ)

یہ پھول پھل یہ حسیں وادیاں، یہ جھیل پہاڑ
جمال مظہر فطرت ہے استعاروں میں

(شاد اکولوی)

ہمارے ملک کی تاریخ نے جو کروٹ لی
مکاں کے ساتھ مکیں جل گئے مکانوں میں

(یوسف کمال)

ہمارے وصل کی شب تھی جو گزری لمحوں میں
تیرے فراق کا لمحہ بھی گزرے سالوں میں

(شفیق اختر)

طلب گلاب کی ہو، ربط خار سے رکھنا
گلاب کھلتے ہیں یارو ہمیشہ خاروں میں

(ارشاد اعظمی)

وہ پیڑ گاؤں کا اب سونا ہو گیا ہے نازؔ
پرندے جتنے تھے سب جا بسے ہیں شہروں میں

(شوکت علی نازؔ)

کہاں گئے کیں شہر دل کی گلیوں کے
ہوائیں چیخیں پھرتی ہیں خالی گلیوں میں

(محبوب قاضی)

ہمیں یہ ضد ہے کہ منازل کو پا کے دم لیں گے
انھیں یہ دھن کہ وہ کانٹے بچھائیں راہوں میں

(افتخار راغب)

رہ حیات میں یوں تو بہت سے لوگ آئے
جچا نہ کوئی بھی محسنؔ مری نگاہوں میں

(محسن حبیب محسن)

''دوحہ'' میں منعقدہ اس مشاعرہ کے لیے معروف شاعر امجد اسلام امجد کے ایک شعر کا مصرع اولیٰ برائے مصرع طرح ''ہمارے اشک چمکتے ہیں ان کی آنکھوں میں'' دیا گیا تھا۔ جس کے لیے مذکورہ شعرا کرام نے اپنے اپنے انداز سے طبع آزمائی کی۔ یوں درج بالا اشعار نہ صرف بہترین تخلیقی قوت کا اظہار ہیں بلکہ ان اشعار میں شاعری کے سارے لوازمات، صنائع بدائع، علم بیان، رمز و ایمائیت اور نفسیاتی، جمالیاتی، عمرانی، تاثراتی، مارکسی تنقید کے اجزاء بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ اشعار ایک طرف فن برائے فن/حسن کاری کا عمدہ نمونہ ہیں تو دوسری طرف مقصدیت سے بھی لبریز ہیں۔

پیڑ، گلاب، پرندے، خار ایسی علامات کے استعمال سے انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

درج بالا اشعار سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ کہ اوورسیز پاکستانی اپنی گوناگوں، مصروفیات اور مشینی/ روبوٹ ایسی زندگی گزارنے کے باوجود شعر و ادب کے فروغ/ ترقی و ترویج کے لیے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں اور وطن عزیز

سے بھی نامور شعراء کو مع زادراہ بلا کر اپنی محفلوں کی رونق کو دوبالا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یوں جہاں وہ اپنے اشعار کے ذریعے سے وطن کی فرقت لی ہجر و فراق کی سلامتی اور امن و آشتی کے لیے دعائیہ انداز میں پایا جاتا ہے۔ یوں ان کے اشعار سے وطن کی سلامتی اور امن و آشتی کے لیے دعائیہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ یوں ان کے اشعار سے وطن کی خوشبو با آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر امان اللہ خاں قصوری پچھلے چالیس سال سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ یوں انھوں نے عمر عزیز کا سنہری پُر شباب دور امریکہ میں گزارا ہے۔ اس دوران ان کا پنجابی شعری مجموعہ ''تکر گنیاں نہیں چھاواں'' فروری ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ۲۰۰۶ء میں وہ وطن عزیز میں تشریف لائے تو خاک وطن کو چومتے ہوئے ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اہل قصور نے ان کے اعزاز میں مختلف تقریبات کا انعقاد بھی کیا۔ ان کا مجموعہ کیا ہے۔ بچپن کی سنہری یادوں کا خوبصورت البم ہے۔ وہ اپنی اُن گلیوں، محلوں، بچپن بیلیوں کے سنگ بیتے لمحات کو ''ٹھنڈریاں یاداں'' کے پیرائے میں یاد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ٹھنڈڑیاں یاداں

نکے ہوندیاں بنائے سی محل جیہڑے اَج مڑ کے بناوّن نوں جی کردا
جیہڑی گلی وچ بچیاں توں وچھڑے سی اوتھے پھیرا لون نوں جی کردا
بھواں آلے روالے چاچے دے سناں لمیاں کہانیاں راتاں نوں
کنے چہ دیاں سُتیاں یاداںنوں فراج جگون نوں جی کردا
نہیں بھلدے دن او موجاں دے اونگی بیلی اوہ چاہواں
فرجا کے اج اس ملے تے اک بھنگڑا پون نوں جی کردا

ان کی نظم ''تن شعر'' ''رات اکلاے دی'' بھی اپنے اندر وطن کی کسک، تڑپ اور

وطن کی خوبصورت یادوں کا عکس لیے ہوئے ہے اور یہ آواز ایک سچے اور کھرے پاکستانی کے جذبات کی عکاسی ہے۔ انداز ملاحظہ ہو۔

ترن بشعر

سجن بیلی دور ہکتے نیں یاداں دین دلاسا
میں جھلا اوہنوں لبھن ٹریا چھڈیا کوئی نہ پاسا

....

اوڑک مڑ آیا میں اوتھے جتاں پیار سکھایا
ورھیاں بعد میں ہسیاساں فریاراں کول بٹھایا
ہن وی ویکھاں پار سمندر دن پار پرانے
ہن وی میریاں اکھیاں وچوں لشکن پار سہانے

....

رات اکلاپے دی

کئی ڈاڈھی سٹ وچھوڑے دی ایدھے بھٹ وی کنے ڈونگھے نیں
اوہ جاہے جس دے ہڈ بیتے سب ٹھیک سیانے کہندے نیں
بڑی اوکھی رات اکلاپے دی پردن لے لنگھ جاندے نیں
کئی ممسن گھیرے سوچاں دے سب چیبیں میر الٹ لیندے نیں
جدوں نیر اکھاں دے سک جاندے فر دل اتھرو بن جاندا اے
پی جاندا اے وقت وی ہو کیااں نوں پر غم عمراں تائیں رہندے نیں

ڈاکٹر امان اللہ خاں ایک ماہر سرجن کے طور پر امریکہ کے مستند معالج مانے جاتے ہیں۔ امریکہ کی جدید تہذیب یافتہ سوسائٹی میں رہتے ہوئے بھی انھیں وہ لڑکپن اور جوانی کے کردار نہیں بھولے۔ جو مشرقی معاشرے خصوصاً قصبات میں اپنی الگ پہچان رکھتے

تھے۔ ماچھی کا کردار ہمارے معاشرے کا ایک پسے ہوئے پس ماندہ طبقے کا کردار ہے۔ جو گاؤں کے وڈیروں، چودھریوں کے ڈیروں پر چھڑکاؤ کرتا ہے۔ اور غریبوں کے گھروں میں گاؤں کے وسط میں واقع کنویں سے مشکیں بھر بھر کے پانی گھڑوں میں بھرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ خود بھی پیر ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ماچھی کے اس بے لوث کردار اور سراپا کو بھلا نہیں پائے۔ اسی طرح اپنے شہر کے مشہور نائی "حاجی نائی" سے وابستہ یادیں ابھی تک ان کے دل میں خوشی کی جوت جگاتی ہیں۔ انھوں نے بڑی محبت اور خلوص سے دونوں کرداروں کی عظمت کو نہ صرف خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ ان کی فنی مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اپنی نظموں کا لافانی کردار بنا دیا ہے۔ جو اہل وطن اور وطن کے باسیوں سے محبت کا عمدہ نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

ماچھی

مینوں ماچھا یاد پیا آوے ماچھی ساڈے پنڈ دا سی
مشکاں بھر بھر پانی لے آوندا پیسہ لیندا بنڈ دا سی
پانی کرتی ننگے پیریں دُھپ وچ ٹردا آوندا سی
آپ تاں اوہدے پیر سی سڑدے سانوں ٹھنڈاں پاوندا سی

....

حاجی نائی

قصور دے مشہور حاجی نائی دا حمام سی
پوہ دے مہینے جتھے تتا پانی عام سی
بڈھیاں دی ٹنڈاں اُتے وسما لگاندا سی
شہر دیاں بابیاں دا ایہی تاں حجام سی

ریگاں دے مسالے اوندے دکھرے ای ہوندے سَن

باقی سارے ناتیاں وچوں اُچا ای مقام سی

اسی طرح ان کی نظمیں، ''پیار دی وتی''، ''لاڑا''، ''قصور دیاں کجھ اور گلاں'' بھی صوری و معنوی اعتبار سے شاعری کی آبرو قرار دی جا سکتی ہیں۔ یہ نظمیں حسن کاری کے حوالے بھی عمدہ شاہکار نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ جس میں شاعر نے دیسی رسم ورواج، یہاں کی اپنی لوکل بولی کو بروئے کار لاتے ہوئے پیش کیے ہیں۔ ان نظموں میں کبھی شاعر اپنے ''پنڈ'' کی سیر کی دعوت دیتا ہے۔ تو کبھی ''پنڈ دی الھڑ کڑیے'' کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے دلہا کو دیکھنے کی ناآسودہ خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ نظم ''قصور دیاں کجھ ہور گلاں'' عوامی جذبات کی ترجمان ہے۔ مصنف امریکہ کی طلسم ہوشربا زندگی سے فرار حاصل کر کے پھر سے قصور آنے کی تمنا کرتا ہے۔ جہاں اس کے بچپن کے یار بیلی موجود ہوں، وہ ان کے سنگ کھیلے، کودے، موج اڑائے، بچپن کے سارے کھیل، ایڑی ٹپہ، گلی ڈنڈا، اخروٹ بازی بنٹے کھیلنا، کتوں کی لڑائی، مرغوں کی لڑائی، نہر میں پیراکی کرنا، کھیت سے گنے توڑ کر چوپنا، اناروں کا رس پینا پیلو کھانا، بیروں کی تلاش میں مارے مارے پھرنا، ایسی معصوم خواہشات کو وہ پھر سے عملی جامہ پہنانے کا متمنی دکھائی دیتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیار غیر کی مٹی نے اسے وہ اپنائیت نہیں دی، جس سے انسان کا قلب طمانیت سے لبریز ہو، اس لیے شدت جذبات کی لہر اس کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ انداز دیکھیے:

پیار دی وتی

تینوں سیر کراواں اُس پنڈ دی جتھے پیار ای پیار سی ہر پاسے

خوشیاں دیا گڈیاں اُڈ دیاں سَن جیون دی بہار سی ہر پاسے

جے پنڈ وچ کے نوں دکھ آوندا سارا پنڈ وی سوگ مناندا سی
بوہے کھلے چھڈ کے سب سوندے کنا دل دا نکھاری ہر پاسے
جتھ جنھاں رہا خیر منگاں اس پنڈ نوں فر توں وسا دیویں
ایہہ جگ اس پنڈ نوں اج ویکھے جتھے وسدا پیاری ہر پاسے

....

لاڑا

کدآوے گا شبھ دیہاڑا
ویکھاں گا میں تیرا لاڑا
میرے پنڈ دی الھڑ گوریے
حُسن دے امرت دی بندُوریے

....

دساں کیہ کیہ جگ دے رونے
لوکی دِسن مینوں بونے
اُتوں لشکن وچوں کوہجے
بُسی روٹی ستھرے پونے
جھوٹے موتی جھوٹھے، ہیرے
اس توں چنگے تیرے لیرے
اوہ دن اڑیے شالا آوے
غربت دا کوئی مول نہ پاوے
قصور دیاں کجھ ہور گلاں

ولا چل اُٹھ چلیے قصوروں نوں
جانے موقع فر ملے یا نہ ملے کل نوں
موری گیٹ والے بھلے نئیں اوہ کٹھ یاراں دے
ریڑھی والے کولوں پینے جا کے رس ناراں دے
کدی ریوڑیاں تے کدی اساں گنے چوپنے
کدی شرلیاں پٹاکیاں تے پیسے پھو کنے
کرے دل اوتھے جا کے میرا پیلو کھاں نوں
پیاں ستو یاراں نال پوے ٹھنڈ جان نوں

اردو کے نامور شعرا منیر نیازی اور عطاء الحق قاسمی نے بڑے خوبصورت انداز میں امان اللہ خاں کی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ منیر نیازی کے بقول:

''دوری بھی ایک عجیب چیز ہے۔ ایک بندے سے دور ہو جائیں تو اس کی یاد زیادہ ستاتی ہے۔ اپنے وطن سے کسی دوسرے ملک میں جا کر بسنے سے اپنا ملک زیادہ یاد آتا ہے۔ ڈاکٹر امان اللہ کی شاعری اپنے وطن میں گزرے ہوئے لمحات، بچپن، لڑکپن کی خوبصورت یادوں سے عبارت ہے اوائل عمری کی شرارتیں، اپنے وطن اور اپنے گھروں کو خوبصورت دیکھنے کی تمنا، اللہ کے حضور دعائیں مانگنا، اپنے ہم عمروں کے ساتھ بیتے ہوئے خوبصورت لمحات اور ان سے وابستہ خوبصورت یادیں، ہڈ بیتیاں، ان کی شاعری کا خاص اوصاف ہیں۔ اپنے ملک کی شان و شوکت میں اضافہ اور ترقی کا خواب اور ملک میں اسلامی اقدار کے احیا کا جذبہ ان کی شاعری کو دینی و دنیاوی لحاظ سے رفعت عطا کرتا ہے۔''

عطاء الحق قاسمی کے مطابق:

''ڈاکٹر امان پچھلے پینتیس سال سے امریکہ میں رہتے ہوئے بھی اپنے وطن سے وابستہ سنہری یادوں کو بھلا نہیں پائے۔ان کی جڑیں اسی دھرتی سے جڑی ہوئی ہیں۔ان کی شاعری میں پنجاب کے رسم ورواج، میلے ٹھیلے، سماجی اقدار، اور چاچا، چاچی، ماسی، نانے اور دوستی کے خوبصورت کردار نظر آتے ہیں۔ پنجابی شاعری کو انور مسعود کے بعد ایک نئی طرز کا نظیر اکبر آبادی مل گیا ہے۔''

آخر میں ہم مجموعی طور پر یہ بات پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اوورسیز پاکستانی انتہائی باصلاحیت اور زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں جہاں مشرقی روایات کی پاسداری کو بڑے احسن طریقے سے نبھایا ہے وہاں اچھی مغربی اقدار سے بھی استفادہ کیا ہے۔اپنوں سے دور ہوکر، دھرتی کی محبت کا فرض ادا کرنا یقیناً سہل بات نہیں، مغرب کی چکا چوند روشنیاں، نائٹ کلبوں سے وابستگیاں، شراب وکباب کے رسیا تھکے ماندے اجسام کے درمیاں رہتے ہوئے کلمہ اعلائے الحق کہنا، اپنی دھرتی کی بوباس سے جڑے رہنا، اپنی اقدار کی خوشبو سے اجنبی دیس کے باسیوں کو متاثر کرنا اور اپنے تخلیقی فن پاروں کی مدد سے وطن عزیز کی سفارت کاری کا فریضہ انجام دینا ایسے کارہائے نمایاں ہیں، جن کی تحسین نہ کرنا یقیناً ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔یہی دعا ہے اب توان سب اوورسیز پاکستانیوں کے لیے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

یہ اپنی خوبصورت تخلیقات کے گلدستوں سے یونہی سدا گل سجائے اور شعروادب کی دنیا کو مہکاتے رہیں۔

شاعر علی شاعر (کراچی)

جب ہم اُردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کے ارتقا پر بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کے ادبی سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں تو چونکے بغیر نہیں رہتے۔ اس حیرانی کی وجہ وہ تخلیقات، تالیفات اور ترتیب کاری و صحافت کے علاوہ دیگر اصنافِ نظم و نثر میں وہ کام جو ہمارے سامنے آتا ہے اس میں جدت طرازی اور نت نئی معلومات ہوتی ہیں۔ وہ چونکہ عالمی تناظر میں ہر شے کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور مختلف تلخ و شیریں تجربات سے گزر رہے ہیں اور یہی تجربات اور مشاہدات بیرونِ ملک مقیم شعرا و ادبا کی سخن طرازیوں اور نثری شہ پاروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھ کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے ان کے ذہن کی کشادگی قدرے زیادہ ہوتی ہے ان کے تخیلات کی پرواز فلک بوس ہوتی ہے۔ وہ کمپیوٹر کے ذریعے، ای میل اور انٹرنیٹ کے استعمال سے جلد روابط قائم کر لیتے ہیں۔ وہ دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے جدید ترین مواصلاتی نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں جو چاند پر اپنی بے پناہ معلومات اور عزم و حوصلے کی بنیادوں پر قدم رکھ چکے ہیں اور دیگر سیاروں کو مسخر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں۔

بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار مختلف قوموں کے بے شمار ایسے افراد کے ساتھ دن بھر میل جول رکھتے ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں جن کی تہذیبیں مختلف ہوتی ہیں جن کا رہن سہن اور رسم و رواج علیحدہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا واسطہ ایسے افراد سے پڑا ہے جو واقعی انسان کی قدر کرتے ہیں اور ان کے دل میں انسانیت کا درد پنہاں ہوتا ہے۔ وہ زبانی جمع خرچ کرنے والوں میں سے نہیں بلکہ عملی اقدام کرنے والوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ با اخلاق اور با کردار لوگوں کے میل جول اور واقعی کچھ کر دکھانے

والے اور حوصلہ مند لوگوں کے ساتھ رہ کر ان میں بھی ہمت مجتمع ہوتی ہے، اس طرح آگے بڑھنے کی لگن پیدا ہوتی ہے جس سے دشوار گزار راستے بھی سہل اور آسان ہو جاتے ہیں۔

ان کو نہ صرف اپنے بلکہ طرح طرح کے لوگوں کے دُکھ درد کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور مسرت وشادمانی کی محفلوں میں بھی شرکت کر کے بہت کچھ سیکھنے کا موقع میسر آتا ہے۔ اس طرح سے ان کے تجربات میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مشاہدات سے نگاہ ونظر و دل کی روشنی بڑھتی ہے۔ ذہن کو وسعت، دل کو کشادگی ملتی ہے اور یہ سب چیزیں علم میں اضافے کا باعث بنتی ہیں جب زندگی کو ہر قدم پر اک نیا موڑ ملے تو پھر یہ تمام رویے شاعری اور نثری شہ پاروں اور مختلف اصناف نظم ونثر میں در آتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں جدت طرازی نمایاں ہو جاتی ہے۔

جبکہ پاکستان میں مقیم تخلیق کاروں کو اول تو غم روزگار سے فرصت نہیں ملتی اور دوم وہ لسانیت، گروپ بندیوں اور لابنگ کا شکار رہتے ہیں جن کی بنا پر نہ صرف ادب روبہ زوال ہو رہا ہے بلکہ تخلیق کاروں کو شدید نقصانات بھی اٹھانا پڑ رہے ہیں۔ ناآسودگی، بے روزگاری، دہشت گردی، تخریب کاری اور حسد انہیں لے ڈوبا ہے۔ جبکہ بیرونِ ملک شعراو ادبا نہ صرف خوش حال ہوتے ہیں بلکہ آسودگی میں زندگی گزارتے ہیں اور عمدہ تخلیقات کے لیے عمدہ ماحول، سازگار فضا، یکسوئی اور فرصت کے اوقات ان کے ذہن کو وسعت دے کر اپنی تخلیق پیش کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی حالات کسی بڑے شاعر وادیب کو مہیا کرنے کے ضامن بن جاتے ہیں۔

ا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے "کیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں تو عرض گزار ہوں کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کا ۹۵ فی صد ادب کا سرمایہ تو ان کی اپنی تخلیق ہے۔ ان کے غزل، نظم، قطعات اور رباعیات یا دیگر اصناف نظم کے مجموعے ہوتے ہیں یا پھر ان میں

افسانے، ناول، ناولٹ، رپورتاژ، انشائیے اور دیگر اصناف نثر شامل ہیں۔ پانچ فی صد میں دو چار کتابیں ایسی بھی سامنے آتی ہیں جن میں اُردو ادب اور اُردو زبان کے حوالے سے پیش رفت ملتی ہے یا اُردو ادب کی کسی صنفِ نظم ونثر پر کام کی ابتدا نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار اپنی بساط بھر کوشش کرتے ہیں کہ ان کا شعروادب کی ترویج وارتقا میں مثبت کردار ادا ہو اور ان کی تخلیقات اور تحقیقی کام اُردو زبان وادب کی ترویج وارتقا میں نمائندگی کرے۔

۲۔ ''کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے؟''

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کے تخلیقی کام میں وطن کی مٹی کی خوشبو پائی جاتی ہے اور ان کے اشعار میں جذبۂ حب الوطنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جتنی شدت سے ان میں اپنے وطن کی عقیدت سمائی ہوتی ہے۔ اتنی شدت سے ان کے کلام میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے طرزِ تکلم، زورِ بیان، خوش اسلوب اور الفاظ کی نشست وبرخاست کے رویوں سے اپنے پیارے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک پائی جاتی ہے۔ بھلے ان تخلیق کاروں کو پردیس میں شہریت ہی کیوں نہ مل گئی ہو مگر وطن کی محبت اور مٹی کی چاہت انہیں ہر چھ ماہ نہیں تو سال میں ایک بار ضرور مقناطیسی قوت کی طرح کھینچ لاتی ہے اور وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی کشش کے کچے دھاگے سے بندھے چلے آتے ہیں۔

۳۔ ''ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟''

ان تخلیق کاروں کی تخلیق کا معیار وہ تو نہیں جو ایک پاکستان میں بسنے والے مشہور ، معروف، فعال اور کہنہ مشق شاعر کا ہوتا ہے اور نہ ہی کسی پختہ کار نظم گو اور مشاق نثر نگار کا اور نہ ہی جید نقاد اور ایک کامیاب اور عالم صحافی کا۔ کیوں کہ بیرون ممالک میں شاعرانہ ماحول وہ میسر نہیں آتا جو پاکستان میں ہے۔ وہاں کی ادبی فضا مکمل طور پر ادبی نہیں ہوتی کیوں کہ

وہاں کے لوگ اپنی گونا گوں مصروفیات کی بنا پر زیادہ وقت اور تمام تر توجہ شعروادب کو نہیں دے پاتے۔ اور پھر ان کے پاس اساتذہ فن اور ادارے بھی موجود نہیں ہیں جن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے جائیں یا باقاعدہ وہاں جا کر سیکھا جائے اور علم وفن و ہنر کے موتیوں سے دامن کو بھر لیا جائے۔

بیرون ممالک میں اس قدر شعروادب کی محفلیں برپا نہیں ہوتیں جس قدر پاکستان میں ہوتی ہیں۔ شعروادب کی یہ نشستیں بھی درسگاہوں کا درجہ رکھتی ہیں اور ان سے بھی شائقین شعروادب، شاعری کا شغف رکھنے والے، تازہ کار اور نوآموز شاعر بہت کچھ سیکھتے ہیں اور حریفانِ علم وفن اپنے دامن کو گوہرِ تابدار سے بھر لیتے ہیں۔ ایسا ماحول حاصل کرنے کے لیے دیگر ممالک سے شعرا اُدبا پاکستان تشریف لاتے ہیں۔ اپنے مجموعہ ہائے کلام شائع کراتے ہیں اور رونمائی کی محفلیں منعقد کر کے کسی حد تک اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ ''کیا آپ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں۔

بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے اس حد تک تو اطمینان ہے کہ وہ مسلسل شعر کہہ رہے ہیں، باقاعدگی سے نثری مضامین، افسانے اور بہت کچھ لکھ رہے ہیں جن کا ثبوت ان کی آئے دن سامنے آنے والی تخلیقات، تالیفات، ترتیب کاری کی کتابوں کے علاوہ رسائل و جرائد شامل ہیں جن میں وہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ باقاعدگی تخلیق ارتقا کی حد تک باعث اطمینان ہے۔

۵۔ ''آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟''

میرے خیال میں ان تخلیق کاروں کو اُردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں تحقیقی نوعیت کے کاموں پر قلم اٹھانا چاہیے اور ماہرین ادب اور اہلِ علم و ہنر کی سرپرستی میں ریسرچ ورک کی ابتدا کرنا چاہیے تاکہ کام آگے بڑھے اور شعروادب کی ترویج کے لیے

اشاعتی اداروں سے بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لانا چاہیے جو بغیر کسی لالچ، صلہ، ستائش اور بلاتفریق جینوئن تخلیق کاروں کو تلاش کرے اور ان سے اعلیٰ ادب تخلیق کروانے کے مواقع اور سہولیات مہیا کرے تا کہ وہ ہمہ جہت صلاحیتوں سے تمام تر توانائیاں صرف کر کے اُردو کے گیسوؤں کو مزید سنواریں۔ ان کی تمام تر توجہ مبذول کرانے سے نہ صرف اردو زبان وادب کو فروغ ملے گا بلکہ اسا س کے سرمائے اور ورثے کی عالمی سطح پر ترویج واشاعت ہو سکے گی جس میں دنیا کا گوشہ گوشہ ہماری زبان وادب کی روشنی سے منور ہو جائے گا اور رہتی دنیا تک نئی نسلیں اس سے بھی استفادہ کرتی رہیں گی تب کہیں ہمارا ضمیر مطمئن ہوگا کہ ہم نے اُردو زبان وادب کی ترویج وارتقا میں اپنا حصہ شامل کرتے ہوئے مثبت کردار ادا کر دیا ہے۔

آفتاب احمد ملک (چکوال)

یہ جان کر بے پایاں مسرت ہوئی کہ ادبی دنیا میں پہلی مرتبہ ''سفیرانِ شعروادب'' کو کتابی شکل میں مجتمع کیا۔ بیرون ممالک میں بکھرے نکھرے گلہائے رنگارنگ کو ایک تحریری خوبصورت مالا میں پرونا اور اعزازی قیمتاً نسخہ جات کو احباب میں مفت مطالعہ کی میز پر سجا آنا بھلا کسی جن، پری، دیو کا کام نہیں ہے۔ جی لاہور جیسے بختاور علمی وادبی آماجگاہ کے بانی وباسی اعلیٰ حضرت سیادت مآب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے کڑے خوبصورت انتخاب کا نتیجہ اسم اعظم کے عامل وکامل ہستی کا مستقلاً یادگار ادبی کارنامہ ہے بلکہ تشنگانِ شعروادب بالخصوص نوآموز نوخیز شعرا کیلئے انسائیکلو پیڈیا بھی ہے۔ بیرون ممالک جہاں جہاں شعرا وشاعرات تخلیقی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف کار ہیں ان کے Biodata کی Collection چیلنج تھا جو صاحب موصوف نے آناً فاناً قبول کر کے ''شام وسحر'' کے ایک شمارے میں مختصراً تعارفی و تمہیدی مضامین اگلے شمارے کی اشاعت سے قبل شب وروز کی محنت کاری اور جان سوزی

کے بعد جان گداز مرحلے طے کرتے ہوئے تاریخ ساز یادگار کارنامہ بطریق احسن سرانجام دے کر صدقہ جاریہ کی ادبی و تحقیقی ڈائریکٹری (اعمال نامے) میں نام نامی اسم گرامی فیڈ ہو گیا۔ ڈاکٹر خیال امروہوی کا ایک شعر کہ :

میں نے تاریخ تو لکھ دی ہے کھرے لفظوں میں
حاشیے بعد میں لکھیں گے پرکھنے والے

سفیران شعروادب کی طویل فہرست ہے۔ راقم کے ضلع کے معروف شاعر شبنم مناروی جتنا عرصہ جدہ میں مقیم رہے۔ رحلت کے بعد بے حس سیم تھور معاشرے میں تعزیتی ریفرنس منعقد نہ کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب جیسے جی یہ ادبی معرکہ سر کر چلے ہیں۔

ہم ''اسیران شعروادب'' صاحب موصوف کے احسان مند ہیں کہ ''مضافاتی شعروادب'' کے بعد نئی کتاب بعنوان ''سفیران شعروادب'' ۲۰۱۰ء نئے سال کا تحفہ قارئین وطن کی نذر کر رہے ہیں۔ ریڈیو ٹی وی پر آواز وقتی طور پر کانوں میں گونجتی ہے لیکن کتاب زندہ ہے۔ بقول شاعر کہ :

میرے یہ لفظ مجھے مَر مَر کر بھی مرنے نہیں دیں گے
مَیں چپ ہو کر بھی لہجے کی روانی چھوڑ جاؤں گا

اس معیاری، معلوماتی دلچسپ کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جی کی کاوشیں صد تحسین اور دلی مبارک باد کی مستحق ہیں۔

ڈاکٹر خیال امروہوی کا ایک قطعہ فاضل مرتب، دانشور مورخ، مصنف، شاعر، محقق شاہ جی کی نذر ہے کہ

فن کے معیار سے تحریر عبارت کیجیے
اپنے افکار میں تخلیق مہارت کیجیے
لفظ و معنی تو عنایات خداوندی ہیں
ان کی تفہیم سے تخلیق حرارت کیجیے

علی بابا تاج (کوئٹہ)

۱۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ بیرون ملک مقیم ہمارے ادیب اپنی بہترین کوشش میں مصروف عمل ہیں۔ وطن سے دور رہ کر ادیب ولکھاری زیادہ حساس دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جس ملک اور خطے میں رہتے ہوں گے وہاں کے سماجی وسیاسی تصورات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ملک کے بارے میں وہاں کوئی بھی خبر انہیں گہرے غور وفکر اور احساسات اور جذبات کی دنیا میں لے جا سکتی ہے۔

۲۔ ان کی تخلیقات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ وطن کی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۳۔۴۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی یہیں سے وہاں منتقل ہوئے ہیں البتہ وہاں کے مشاعروں کی رپورٹوں اور ویڈیوز کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات اطمینان بخش ہیں اور ان کا معیار پاکستان کے لکھنے والے خواتین و حضرات سے کچھ مختلف نہیں۔ البتہ اگر ان کا جغرافیہ چھپا دیا جائے تو وطن سے دوری اور بے سروسامانی کے موضوعات کو چھوڑ کر کوئی خاص فرق نظر آنا مشکل ہے۔

۵۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے مختلف ممالک میں مختلف النوع مسائل ہو سکتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں۔ انٹرنیٹ آج کا بہترین آلۂ اظہار ہے لیکن اگر اس کے لئے پاکستانی سرکاری ونجی ادارے ترجیحاً کام کریں گے تو اچھی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے ہاں چھوٹے موٹے اخبارات و رسائل چھپتے رہتے ہیں انہی کو "اپ گریڈ" کیا جائے اور مختلف ٹی وی چینلوں کو چاہیے ان کے لئے وقت مختص کریں۔

جمشید اقبال (بہاولپور)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تازہ کتاب ''اُردو شعروادب کے سفیر'' ...... واقعی سفارت کاری میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔ یہ کتاب نہ صرف معاشرتی لحاظ سے سفارت کار بنے گی بلکہ دلوں کی سفیری و روح پذیری میں بھی نمایاں کردار ادا کرے گی۔ کچھ عرصہ پہلے ''شام وسحر'' میں ایک شعر پڑھا تھا، پڑھتے ہی دل و دماغ میں نقش ہو کر رہ گیا اور آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شاعر کا نام تو یاد نہیں، البتہ شعر یہ ہے ۔

تحائف جب نرالے دیکھ لینا
ہاتھوں کو چھالے دیکھ لینا

شعر کیا ہے؟ ہمارے عہدِ انتشار و بے اعتبار و زیاں کار کی ایک داستان ہے جو ان دو مصرعوں میں بیان کر دی گئی ہے۔ ایک درد ہے، جو سینے کو چیرتا ہوا روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ ایک نشتر ہے، جو آنکھوں کی سفیدی کو سُرخی میں بدل دیتا ہے۔ اپنا گھر بار، اپنی دوستیاں، اپنے لختِ جگر، اپنے آرام و آسائش ...... اور پھر اپنی مٹی کو چھوڑ کر دیارِ غیر کی ہواؤں، فضاؤں کو سجانے، سنوارنے والے، جب اذیت ناک لمحوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ جب درد و الم کی دبیز تہوں میں کھو جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی اشعار تخلیق ہوتے ہیں اور ہزاروں کے مقابلے میں ایک ایسا شعر، کسی بھی زبان و ادب کو عالمی سطح پر، تر و تازگی اور ہمیشگی بخشنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔

دیارِ غیر میں بسنے والے ''ستم ہائے روزگار'' کے مارے ہوئے، اپنے جذبات و احساسات اور خواہشات کی بے پناہ قربانیاں دے کر جہاں رہ رہے ہیں ...... یقیناً ...... یہ ایسا ہی ہے، جیسے کہ گوشت کو ناخن سے جدا کرنا۔ اپنی مٹی، اپنے وطن سے جدا ہونا کوئی آسان کام ہے؟ ...... اگر کوئی بھی اس کو فارمیلٹی سمجھتا ہے یا ...... انجوائے ...... کا نام دیتا ہے

تو وہ احمقوں کی جنت کا ہی باسی ہوگا...... وہ میر صادق و میر جعفر کے قبیلے سے تعلق رکھنے والا ہوگا۔

چٹھی آئی ہے...... آئی ہے چٹھی آئی ہے

بڑے دنوں کے بعد

ہم بے وطنوں کو یاد

وطن کی مٹی آئی ہے

چٹھی آئی ہے...... آئی ہے، چٹھی آئی ہے

.... جیسے الفاظ سماعت سے ٹکراتے ہیں پلک پلک کر رونے والوں سے کوئی پوچھے، اپنے وطن کی یاد۔ اپنے وطن کی خوشبو۔ اپنے وطن کی ہوا۔ اپنے وطن کے غم۔ اپنے وطن کی خوشیاں۔ کیا ہوتی ہیں؟ کیسی ہوتی ہیں؟

اپنی مٹی سے بچھڑنے کے بڑے دُکھ ہیں یارو!

اس سے ملنے کی کسک دل میں رہا کرتی ہے

یہی کسک، یہی ٹیسیں، یہی آہیں، یہی نالے۔ ایک اچھا، بہترین اور اعلیٰ ادب تخلیق ہونے میں معاون و مددگار بنتے ہیں۔ یہی اعلیٰ ادب ایک اعلیٰ معاشرہ بناتا ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے وطن کی مٹی کا ذرہ ذرہ چمکدار و شاندار بنتا ہے اور "پاکستان کھپے" جیسے لفظ بامعنی دکھائی دیتے ہیں۔

فرقان احمد قریشی (لاہور)

ادبی دنیا میں ایسے بہت سے شاعر اور ادیب ہیں جنہوں نے دیارِ غیر میں ادبی شمع روشن کی اور اسکی لو کو کم نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے دور رہ کر اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کو اپنے رگ و پے میں بسائے رکھا اور معیاری ادب تخلیق کرنے پر قادر رہے۔

ان شاعروں اور ادیبوں نے ملک سے باہر رہ کر جہاں زرِ مبادلہ کی صورت وطن کی معاشی طور پر خدمت کی وہاں اپنوں کی جدائی، ملک سے دُوری، غیر ملکی ماحول کی اجنبیت جیسے مسائل و مصائب اور غم و الم کے سامنے سینہ سپر، اپنے کام کی لگن میں مستقل مزاجی سے مگن اور پائے استقامت میں بنا لرزش وطن کے استحکام اور خوشحالی کے لئے دعا گو بھی رہے۔

ان احباب نے نہ صرف شعر و ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں بلکہ یہ اپنے ملک کے سفیر کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں، جذبہ حب الوطنی سے سرشار انکی سانسوں میں ارضِ پاک کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ملتی ہے جو کہ ان کے جملوں کے سانچے میں ڈھل کر ان کے حرف حرف اور لفظ لفظ سے عیاں بھی ہے اور اہلِ دل ونظر کی آنکھوں کو خیرہ اور اربابِ فکر کے مشامِ جاں کو معطر کر دینے کی بھرپور صلاحیت سے معمور بھی۔

یہ شاعر اور ادیب بطور سفیر اپنے وطن پاکستان اور اردو ادب کے لئے وہ فریضہ انجام دے رہے ہیں جو ہم یہاں رہ کر بھی بسا اوقات اُن تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ بلا مبالغہ دیارِ غیر میں مقیم یہ شخصیات جرأتوں کی امین، عظمتوں کی سفیر، حقیقتوں کی نقیب، شعر و ادب کی نمائندہ مذہبی اقدار اور ملکی وقار کی پاسباں قرار دی جا سکتی ہیں۔

شبہ طراز (لاہور)

اکثر لوگ یہ کہتے سُنے گئے ہیں کہ بین الاقوامی ادب میں اردو ادب کا فی الحال کوئی مقام نہیں۔ اس کے باوجود اردو ادب استادرِ خور اعتنا بھی نہیں کہ بین الاقوامی ادب میں اس کا تذکرہ ہی نہ ہو۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہم انفرادی اور قومی ہر دو لحاظ سے ایک خودغرض وجود سے تعلق رکھتے ہیں پھر بھی کسی نہ کسی حد تک انفرادی اور قومی دونوں سطحوں پر اردو کو بین

الاقوامی پلیٹ فارم پر متعارف کروانے اور حیثیت منوانے کے سلسلے کا کام ہوتا آیا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ مختلف ممالک کے قومی ریڈیو اور ٹی وی چینلز پر خصوصی اردو سروسز، اردو خبریں اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں جن ممالک میں اردو ایک مضمون (چاہے وہ اختیاری ہی کیوں نہ ہو) کے طور پر پڑھایا جاتا ہے وہاں بھی اردو ادب کے بہترین نظم و نثر پارے فراہم کیے جاتے ہیں۔ ہمارے سفارت خانے بھی ہر چند کہ خانہ پُری کے لئے ہی، اردو مشاعروں، کانفرنسوں اور مختلف نوعیت کے مضمون نویسی کے مقابلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ نجی سطح پر ہونے والا ادبی کام زیادہ سنجیدہ، زُود اثر اور مستند ہوتا ہے۔ اردو ادب کی ترویج کے لئے باہر کے ممالک میں بھارت اور برطانیہ کے ادیب سب سے زیادہ فعال ہیں۔ بھارت میں تو خیر اردو پیدا بھی ہوئی اور رائج بھی رہی۔ لیکن برطانیہ وہ پہلا ملک ہے جہاں برصغیر کا پڑھا لکھا طبقہ جا کر سکونت پذیر ہوا۔ اسی لئے یہاں اردو لکھنے اور بولنے اور پڑھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود رہی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں مزدور طبقہ پہنچا جس کا مقصد محض حصولِ زر ہی رہا۔ اس کے علاوہ یورپ کے بیشتر ممالک امریکہ، چین، جاپان اردو سے نہ صرف شناسائی بلکہ دلچسپی بھی رکھتے ہیں۔ برطانیہ، جرمنی، جاپان وغیرہ سے تو بہت سے رسائل بھی مسلسل اشاعت پذیر ہوتے ہیں مثلاً جرمنی سے جدید ادب، برطانیہ سے مخزن (بریڈفورڈ)، شہرزاد، لیوٹن سے سفیرِ اردو، مشرقِ وسطیٰ سے 'نشاط' وغیرہ۔ جدید ادب کے مدیرِ محترم حیدر قریشی نہایت ثابت قدمی سے عرصۂ دراز سے ادب کی خدمت بلا معاوضہ کر رہے ہیں۔ ان کا جریدہ نہ صرف نیٹ پر موجود ہے بلکہ یہ ڈاک خرچ کے ساتھ کافی ادباء کو کاغذی شکل میں بھی بھیجا جاتا ہے۔ مخزن کے محترم مقصود الٰہی شیخ اس سلسلے میں نہ صرف فعال ہیں بلکہ وہ نجی طور پر دونوں ممالک کے معروف ادباء کے درمیان رابطے اور تعارف کا بھی سلسلہ بناتے رہتے ہیں تاکہ یہاں کے رہنے والے وہاں کے لکھنے والوں کے فن سے اور وہاں کے رہنے

والے یہاں کے ادباء کی تخلیقات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ ایک محنت طلب کام ہے لیکن مطبوعہ آٹھ شماروں کی وجہ سے واقعی بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کی باہمی کاوشوں نے ادب کی تاریخ مرتب کی ہے۔

دُور دیس بسنے والے بیشتر تخلیق کاروں کی تخلیقات میں وطن سے محبت کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مخلوط معاشرے کے مسائل اور اپنی الگ زبان و شناخت کے حوالے سے یہ لوگ اپنے دیس میں بسنے والوں سے کہیں زیادہ اچھا لکھ رہے ہیں حالانکہ ہمارے اپنے ملک میں اردو زبان و ادب لکھنے اور پڑھنے ہر دو لحاظ سے زوال پذیر ہے لیکن اس زبوں حالی کا مرثیہ بھی بیرون ملک ادیب زیادہ زوردار طریقے پر بیان کر رہا ہے۔ باہر رہنے والے ادباء کو دیکھنے اور برتنے کے لئے یکسر مختلف ماحول ملا اس وجہ سے ان میں وسعت نظری کا فقدان نہیں اور وطن پرستی کا جذبہ بھی زیادہ ہے۔

اردو شعر و ادب کے یہ سفیر سنجیدہ، فعال اور اطمینان بخش کام کر رہے ہیں اور ان کا کام قابلِ ستائش ہے۔ ان کے خلوص، سادہ دلی اور بے لوث محبت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان سے گئے ہوئے جس ادیب سے بھی ملتے ہیں اس پر اعتبار کر لیتے ہیں اور سالوں اُس کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے پہلے تو انہیں یہی کوشش کرنی چاہیے کہ خوب چھانٹ پھٹک کر کے پاکستانی ادیب پر اعتماد کریں۔ دوسرا اہم مشورہ یہ ہے کہ پاکستانی اردو ادب کے تراجم نجی طور پر کر کے اپنے اپنے حال مقیم ملک کی زبان و ادب میں پیش کریں چونکہ یہ کام ہمارے ہاں قومی سطح پر جو ادارے کرتے ہیں وہ محض خانہ پُری کے لئے "نان جینوئن" اور "جینوئن" کی تمیز کے بغیر شائع کرتے ہیں جس کا انتخاب بھی معیاری نہیں ہوتا۔ ان وجوہات کی بنا پر اردو ادب ترویج پانے کی بجائے مزید زوال کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح ہمارے معاشرتی مسائل کی حقیقی تصویر بھی دنیا کے سامنے آئے گی اور نام نہاد مذہبی دہشت گردی سے خصوصاً پاکستانی قوم کو بدنامی کا جو داغ اٹھانا پڑا ہے وہ بھی دھلنے کی کوئی تدبیر بنے گی۔

پروفیسر طاہر مسعود (لاہور۔ پاکستان)

بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج میں یقیناً اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے تخلیق کاروں کی نسبت خواہ انہیں قارئین کا ادب شناس اور تربیت یافتہ حلقہ اور ماحول میسر نہیں ہوتا اور وہ خود بھی جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں، وہ اُن کے درون کی دنیا سے یکسر مختلف ہوتا ہے، تاہم وہ کسی ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر تخلیقی عمل کو جاری وساری رکھتے ہیں۔ وہ محض باطنی تحریک کے سہارے اپنی ذات میں خود کو تلاش کرنے، اپنی ذات میں زندہ رہنے اور اپنی تہذیبی وثقافتی قدروں سے توانائی حاصل کر کے باطنی آسودگی کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں اور مختلف ادبی اصناف میں اظہار کے ذریعے اپنے افکار وتصورات اور خیالات وجذبات کو دیگر ہم وطن ساتھیوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں جس کے نتیجے میں دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب کے مقابل اردو زبان کے تخلیقی ادب کے نمونے اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔

بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار بہت باصلاحیت ہیں کہ فکر روزگار اور کسبِ معاش میں ایک غیر معاشرے کی صعوبتیں برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کا طرزِ احساس مختلف اور منفرد ہے، اِن کی سوچ کا دائرہ محدود نہیں، ان کی بے تعصبی اور وسعتِ قلبی نے اعلیٰ انسانی قدروں کے پروان چڑھنے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔

بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ تخلیق ادب کے ساتھ ساتھ فروغ ادب کے سلسلوں کو بھی آگے بڑھائیں۔ وہ جس ملک میں بھی مقیم ہیں اُس کی زبان پر ایسی دسترس حاصل کریں کہ پاکستانی ادب کو دوسرے ملک کی زبان میں کامیابی سے منتقل کر سکیں۔ اس طرح پاکستانی ادب کی حدیں وسیع ہوں گی اور اردو ادب کی تحسین اور تنقیص

میں ایسے لوگ سامنے آئیں گے جو ہر طرح کی لگاوٹ سے پاک رہتے ہوئے پاکستانی ادب پر تبصرہ کر سکیں گے۔ اس طرح دوسری زبان کے ادب کو اردو میں ڈھال کر پاکستانی تخلیق کاروں اور اردو دنیا کے نقادوں کے سامنے نئے نمونے پیش کر کے نئی بحثوں کا آغاز اور فنی امکانات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ جو یقیناً اردو ادب کے لیے نیک فال ثابت ہو گا۔

پروفیسر آغا مزمل (لاہور)

اردو زبان و ادب کی آبیاری میں ہر اُس خطے کے رہنے والے کا کردار رہا ہے جہاں جہاں اردو سمجھنے، لکھنے اور بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی اردو زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ صرف مقامی ادیب ہی سرانجام نہیں دے رہے بلکہ بیرون ملک بسنے والے اہلِ قلم بھی اس خدمت میں پیش پیش ہیں۔ ان میں مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور مغرب کے دیگر ممالک میں بسنے والے دوست بہت عمدگی سے ادب دوستی کا حق ادا کر رہے ہیں۔

پُر اثر اور دیرپا ادب اسے کہا جاتا ہے جو زندگی سے قریب تر ہو جس میں معاشرے کے رجحانات اور قدروں کا عکس جھلکتا ہو۔ لکھنے والے کے احساسات اور جذبات جہاں اس کے تجربات سے فیض پاتے ہیں وہاں اس کے مشاہدات بھی اس میں اولین کردار ادا کرتے ہیں۔ ان تجرات اور مشاہدات کا دلکش انداز میں اظہار ادب کہلاتا ہے۔ بیرونِ ملک جانے والے اردو زبان میں لکھنے والے، جن میں شاعر اور نثر نگار دونوں شامل ہیں بہت خوبی سے تجربات اور مشاہدات کو شعر و نثر کا جامہ پہنا رہے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں سے اکثر کہنہ مشق شاعر و ادیب ہیں جو بہت مہارت سے اپنے تجربات و مشاہدات کو تخیل کی آمیزش سے تخلیق کا روپ دے رہے ہیں۔

ان کی تحریروں اور اشعار میں تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے ہر تلخ و شیریں رُخ کی

جھلک ہے جسے انھوں نے بہت ہنر مندی سے نثر پارہ یا نظم بنا دیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں نئی دنیاؤں کے مشاہدات اور تجربات کے ساتھ احساسات و جذبات کے نئے جہان آباد ہیں۔ ان جہانوں میں ان کی محرومیوں اور جدائیوں کے موسم اور وطن سے دوری کی بنا پر جنم لینے والی لازوال محبت کی مہک ہر سو جلوہ فگن ہے۔

حقیقی ادب وہی ہے جس میں زمانے کی دھڑکن رچ بس گئی ہو جو اپنے گردو پیش کی خوشبو سے معطر ہو اور جسے لطافتِ بیان نے پڑھنے والے کے دل کے قریب کر دیا ہو۔ یہی دلکش اظہار زندگی کے نازک اور نسبتاً کم محسوس کیے جانے والے پہلوؤں کو تخیل کی آمیزش سے تخلیق کا روپ دیتا ہے۔

بیرونِ ملک اردو لکھنے والوں میں کچھ تخلیق کار تو ایسے ضرور ہیں جو تخلیق کے اعلیٰ معیار کو چھو رہے ہیں اور جن کی تحریروں میں اپنے دور کا عکس تمام تر رعنائی اور کرب کے ساتھ جھلکتا ہے لیکن ان میں بہت سے لکھنے والے تجربے اور مشق کی کمی کا شکار ہیں۔ یہ جو دل پر گزرتی ہے، اُسے رقم کرنا تو چاہتے ہیں لیکن اپنے مطالعہ اور ریاضت کی کمی کی بنا پر اس میں کامیاب نظر نہیں آتے۔

بیرونِ ممالک میں رہنے والے شاعر و ادیب، وطن سے دوری کی بنا پر وطن کی محبت اور اپنے پیاروں کی چاہت کا اظہار بہت شدت سے اپنی شاعری اور نثر میں کرتے ہیں۔ ان میں نئی دنیاؤں کی چکا چوند کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ پرائی زمین پر پیش آنے والے امتیازی سلوک کی کسک بھی محسوس ہوتی ہے لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو معیار کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی توجہ اور کوشش سے اس خامی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ وطن اور اردو زبان و ادب کے لئے ان کی خدمات یقیناً لائق تحسین ہے۔

ارشد خالد (اسلام آباد)

میرے خیال میں بیرونِ ملک میں مقیم ادیب برادری سلسلۂ روزگار میں زیادہ اُلجھ گئی ہے اور شعروادب کو وقت نہیں دے پاتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان احباب کا مطالعہ بہت کم ہو گیا ہے جس سے بہت سے ادیبوں کی تخلیقی قوت بھی متاثر ہوئی ہے اور نئی چیز لکھنے کی بجائے وہ پرانی چیزوں سے ہی اپنی ادبی زندگی کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں اس طرزِ عمل کے باعث اردو زبان وادب میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ماسوائے چند ادیبوں اور شعرا کے جنھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ پاکستان میں گزارا اور یہیں پر ان کی تخلیقی قوتوں کی پرورش ہوئی۔ سو وہ ادیب اردو کے شعروادب کے سفیر کا کام سرانجام دے رہے ہیں لیکن نئی نسل کے بہت سے شاعر ڈالر یا بیرونی کرنسی کے زور اپنی شاعری کی کتابیں پاکستان میں بنواتے اور چھپواتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حیدر قریشی کے رسالہ ''جدید ادب'' اور میرے اپنے رسالہ ''عکاس'' میں کئی بار آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حیدر قریشی کے کئی مضامین میں بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں بیرونِ ملک آباد ادیب برادری شعروادب کے سفارت میں ناکام نظر آتی ہے۔

پروفیسر باقر علی (لاہور)

انسانی تاریخ میں لوگوں، قبیلوں اور قوموں کی نقل مکانی کا عمل معلوم تاریخ کے ہزاروں برس قبل سے جاری ہے اور رہے گا۔ البتہ کبھی یہ عمل انتہائی تیز اور کبھی سست روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اٹھارویں انیسویں صدی میں یورپ سے لاکھوں لوگوں نے ہجرت کی اور نئی دنیا میں بسائیں جیسے امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ۔ انسانی ہجرت کے پیچھے کئی وجوہ اور عوامل ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سب سے نمایاں تحفظ، معاشی مواقعوں کا حصول، مالی

استحکام اپنی اور اپنی نسل کی خوشحالی اور بقا ہیں۔ آج کے دور میں مغرب کا علم، معیشت، بین الاقوامی سیاست، بنکاری اور تجارت پر پچھلی صدی سے واضح غلبہ چلا آ رہا ہے اگرچہ مشرقی ایشیاء جاپان، چین اور جنوب مشرقی ایشیاء، انڈیا وغیرہ بھی اپنی معاشی کارکردگی کی وجہ سے باعثِ کشش اور توجہ ہیں لیکن اس کے باوجود پاکستان اور دیگر ترقی پذیر ممالک سے لوگوں کی ہجرت خواہ عارضی ہو یا مستقل وہ مغرب کی طرف ہے۔ بالخصوص علم، سائنس اور روزگار کے مواقعوں کی دستیابی کے علاوہ مغرب (انگریز) کی نوآبادی رہنے کی وجہ سے ہم ان کی زبان اور ثقافت سے بخوبی واقف ہیں۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں میں ہمارا ایڈجسٹ کرنا سہل نظر آتا ہے جبکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔

9/11 کے بعد سے مغرب اور مسلم دنیا کے درمیان ہر سطح پر تناظر بالکل ہی بدل گیا ہے۔ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں مسلمانوں کو بالخصوص مخاصمت کی وجہ قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف محاذ جنگ کھول لینا ان کے غلط زاویہ نظر کے ساتھ ساتھ دیگر سیاسی ومعاشی مفاداتی اہداف ہیں۔ اس جنگ کی آڑ میں جن کا حصول انہیں آسان اور قابلِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ اس غلط تناظر کو ہوا دینے میں ان کے سیاسی پنڈتوں اور دانشوروں کا بڑا ہاتھ ہے جیسے سموئیل ہنٹنگٹن کے نظریے "Clash of Civilization" (تہذیبوں کا تصادم) کو بنیاد بنا کر جنگ، تباہی بے رحمی سے معصوم جانوں کی ہلاکت کو روزمرہ کا معمول بنا لیا گیا ہے۔ انسانیت کے علمبردار کن اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر بہیمانہ انداز میں انسانیت کشی کر رہے ہیں۔ یہ سوال اور اس طرح کے دیگر سوالات، خوف و ہراس، عدم تحفظ اور کربناک بے یقینی کی فضا میں ہر سوچنے والے حساس فرد کے ذہن میں چنگاری بن کر سلگ رہے ہیں۔ خاص طور پر مغرب میں جا کر بسنے والے اہلِ وطن کے اذہان وقلوب میں۔

دیس سے پردیس میں بسیرا کرنے والے لوگوں کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اوّل یہ ہے کہ خواہ وہ کوئی بھی مقام حاصل کر لیں وہ ایک نمبر سٹیزن نہیں بن سکتے۔ دو

نمبر ہی رہنا پڑتا ہے۔ دوم، تہذیبی و ثقافتی فرق کے ساتھ اب 9/11 کے بعد Mind-set میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے کے باعث عدم اعتماد، شک وشبہات نے کئی نفسیاتی اور سماجی مسائل کو جنم دیا ہے۔ Alienation (بیگانگیت) فروغ پا رہی ہے۔ سوم اس متعصبانہ رویے کی وجہ سے تعلیم، روزگار او روزدیگر شعبوں میں مسلمانوں کو شدید دشواریاں درپیش ہیں۔ محرومیاں، مایوسیاں، دامن گیر ہو کر فرسٹریشن اور ڈپریشن میں اضافہ کر رہی ہیں۔ مادی سہولتوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی بے چینی، اضطراب اور ہیجان بڑھ رہا ہے۔

اس پس منظر اور پیش منظر میں رہتے ہوئے وطن سے دوری کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اپنے دیار کی مٹی کی سوندھی مہک ہر سانس کے ساتھ آتی ہے۔ اپنوں کے اور اپنے پیاروں کی یادوں کے گلاب قلب ونظر میں مسکراتے ہیں۔ "گلوبل ولیج" اور فاصلوں کے سمٹ جانے کے باوجود، دوری کا احساس انتہائی کرب ناک ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل نے آہنگ اور صوتی تعلق کی مدد سے وجودی عدم ملاقات کے درد و کرب کو کسی حد تک کم کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

اس ماحول میں ہجرت کے جبر کی تلخیاں، احساسات و جذبات میں وہ دکھ اور زہر گھولتی ہیں۔ جن کا موثر اظہار باہر رہنے والے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی نگارشات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی تحریریں نثر، شاعری، افسانہ اور ناول میں نئی زبان، نئی جہتیں اور نئے اسلوب کے تجربوں میں گراں قدر اضافہ کر رہی ہیں۔ یوں مغرب میں ہونے والی عصر حاضر کی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی مسلمانوں کے حوالے سے معاندانہ تبدیلیوں اور ان کے اثرات کا فہم و ادراک، شعور و احساس، جذبات و خیالات کی سطح پر ذاتی تجربہ بنا کر بڑے خوبصورت پیرائے اور موثر انداز میں اپنی ادبی کاوشوں میں پیش کیا ہے۔ آپ یورپ اور امریکہ میں لکھی جانے والی شاعری یا افسانوی ادب کا مطالعہ

فرمائیے آپ کو اس میں درج بالا تمام رویے اور رجحانات موجزن دکھائی دیں گے۔

اس یاسیت اور منفی سیاست زدہ عالمی ماحول کے تناظر میں جہاں حساس لکھاریوں کو حقائق و شواہد و تجربات نے مواد دیا اور مہمیز کیا ہے وہاں انہوں نے اُردو ادب میں نئے رجحانات، نئی فکر و نگاہ کو نئی تازہ توانائی کے ساتھ مؤثر انداز میں اپنی ادبی تخلیقات میں اُجاگر کیا ہے یوں اردو ادب کا پودا باہر کی دنیا میں بڑے آب و تاب کے ساتھ پھل پھول رہا ہے بلکہ ان درخشندہ روایات کو فروغ دے رہا ہے جس کا تعلق مذہب اسلام سے بالخصوص اور مسلمانوں کے بالعموم اُن ذہنی، فکری رجحانات اور تہذیبی اور سماجی رویوں سے ہے جو اسلام کی غلط تشریح و تاویل، اس کے بارے غلط فہمی کو دور کرنے اور مذہب کو اعلیٰ انسانی قدروں، جیسے رواداری، درگزر، سلامتی، امن و محبت غربت کو مٹانے اور عدل کو قائم کر کے، رنگ و نسل، اعلیٰ و ادنیٰ کی تعریف سے بالاتر ہو کر استحصال سے پاک معاشروں کے قیام کے تناظر میں دیکھنا ہے...... مغرب میں اسلام شناسی اور اسلام فہمی کا رجحان بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ یہ مناسب موقع ہے کہ ہم اسلام کی صحیح ترقی پسند تشریح و تعبیر کریں جو انسان دوستی امن اور خوشحالی پر منتج ہو۔ دوسرے ممالک میں رہنے والے ادیبوں پر دُہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پہلی وہاں خوف و ہراس، بداعتقادی، تناؤ اور ہیجان کی فضا میں دوسروں سے تہذیبی، فکری اور سماجی رویوں کو غلط فہمیوں سے پاک کر کے باہمی محبت، رواداری، حُسن سلوک پر استوار کرنا ہے۔ دوم اپنی ادبی نگارشات اور تخلیقی سفر میں ان معیارات کو قائم کرنا اور آگے بڑھانا ہے، جو انسان میں اعلیٰ ظرفی، وسعتِ قلبی اور وسیع المشربی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اور بین المذہبی ڈائیلاگ کے کلچر کو فروغ دے کر نفرتوں کی جگہ محبت، جنگ کی جگہ امن اور تباہی و بربادی کی جگہ سلامتی و خوشحالی یقینی بنائے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اس لحاظ سے ایک منفرد نقاد اور تخلیق کار ہیں کہ انہوں نے

ہمیشہ نظریاتی بلکہ ترقی پسندانہ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ایک جانب تو ہم ان پاکستانی تخلیق کاروں کی پذیرائی کر رہے ہیں جو بیرون ملک مقیم ہیں اور دوسری جانب ان کی سمت نمائی کا فریضہ بھی ادا کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی خلاقانہ صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے اور اس کتاب میں تو انہوں نے اپنی جملہ صلاحیتوں کو سلیقہ سے اُجاگر کیا ہے۔ کاش ہمارے تمام ادبا اور شعرا اسی طرزِ احساس کے حامل ہو جائیں کہ اس صورت میں ہمارا ادب بین الاقوامی سطح کو چھونے لگے گا۔

میں اپنی بات اس رجائی نوٹ پر ختم کرتا ہوں کہ ہجر اور ہجرت (خواہ عارضی ہو یا مستقل) کی باہمی آویزش سے مختلف لسانی، ثقافتی اور تہذیبی معاشروں میں زندگی کرنے والے لوگوں کو جن مسائل اور چیلنجز سے نمٹنا پڑتا ہے اس عمل کے دوران سعی پیہم کے بدولت ان لوگوں کے وہ خوابیدہ اور مخفی صلاحیتیں اور جوہر سامنے آتے ہیں جو اس کٹھالی میں انہیں کندن بنا دیتے ہیں اور وہ لوگ اجنبی معاشروں میں اپنے لئے ارفع واعلیٰ مقام بناتے ہیں اور اپنے وطن کا نہ صرف نام روشن کرتے ہیں بلکہ کثیر زرِ مبادلہ کی فراہمی کا مستقل ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

شہزاد احمد خان (احمد پور شرقیہ)

بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار جو حصولِ روزگار کے لیے یا تکمیل ملازمت کے بعد اپنی اولاد کے پاس سکونت پذیر ہیں کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ وہاں بھی اپنے ادبی ذوقِ شعری کو جلا دیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے وہاں اُردو فورم سوسائیٹز اور اس نوع کی دیگر تنظیموں میں فعال شرکت اختیار کی ہوئی ہے اور محدود پیمانے پر منعقد ہو رہی ہے۔ ادبی محافل میں وہ اپنا کردار مثبت طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔

ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے کیونکہ حساس طبیعت کے حامل یہ ادبی تخلیق کار وطن سے دور ہو کر مٹی کی محبت اور اس سے وابستہ ''نوسٹلجیا'' کا درست ادراک رکھتے ہیں۔ زمین سے محبت کی جتنی ملی شاعری ان کے ہاں ہے اُسے دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کا احساس اُس سے محروم ہونے پر ہی ہوا کرتا ہے۔

جہاں تک ان تخلیق کاروں کی تخلیقی کاوشوں کے معیار کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر ادیب و شاعر اپنی عمر، علم اور خدا کی طرف سے عطا کردہ توفیق ہنر لیے ہوئے ہے۔ سینئر ادیب و شاعر معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے اپنی تخلیقات میں نمایاں ہیں جبکہ نوزائیدہ ادیبوں اور شاعروں کے ہاں اپنی اپنی عمر کے ذائقے موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ وطن سے باہر جا کر فن وفکر میں جوہری تبدیلیاں نہیں آ جایا کرتیں۔

بیرونِ ملک مقیم پاکستانی ادیب و شاعر خواتین و حضرات کے تخلیقی کاموں میں اُن کی طرف سے جو بھی کوششیں ہو رہی ہیں وہ دیارِ غیر میں جہاں روزگار ایسے بنیادی معاملات سے ہٹ کر ٹائم نکالنا اور فن کی خدمت کرنا کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ یہ ادیب و شاعر اجنبی ماحول میں بھی اپنے تئیں علم و ادب کی شمع کو جلائے ہوئے ہیں۔ نئے ماحول کے اپنے تقاضے اور مسائل ہوتے ہیں جن کو سمجھ کر ہی ہم اُن کی کارکردگی کی قدر پیمائی کر سکتے ہیں۔ دیارِ غیر میں مقیم ادیب و شاعر اپنی اپنی capacity میں رہ کر تخلیقی مساعی کر رہے ہیں اور اُن کے تخلیقی کاموں سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ادب کے فن سے اُن کی سچی کمٹ منٹ قائم و دائم ہے۔

ان تخلیق کاروں کو چاہیے کہ دیارِ غیر میں رہ کر آج کے بین الاقوامی معاشرے میں بڑھتی ہوئی نفسا نفسی اور مادیت کے حوالے اپنے تخلیق کردہ ادب میں آواز بلند کریں اور انسانی و روحانی اقدار کو پروان چڑھائیں۔ انسان دوست اور وسیع المشربی کا پیغام

دیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقات میں نئے ہیئتی تجربات بھی لائیں۔

نصرت بخاری (اٹک)

اگر کسی پرندے کو قید کر کے قفس میں ڈال دیا جائے تو عام مشاہدے کی بات ہے کہ وہ کچھ دیر پھڑ پھڑا کر حالات سے سمجھوتہ کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔ لیکن شام ہوتے ہی جب وہ دوسرے آزاد پرندوں کو اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے دیکھتا ہے تو اس کی پھڑ پھڑاہٹ اور بے چینی دوبارہ لوٹ آتی ہے۔ وہ پنجرے سے نکل بھاگنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ وہ اس کوشش میں لہولہان ہو جاتا ہے، تھکاوٹ سے اس کا بدن چور ہو جاتا ہے لیکن وہ ان تمام مصائب سے بے نیاز ہو کر پنجرے سے نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ تاکہ باقی پرندوں کی طرح وہ بھی اپنے آشیانے تک پہنچ سکے۔ اگر ایک بے شعور پرندہ اپنے مسکن سے دوری کے کرب کو اتنی شدت سے محسوس کرتا ہے تو ایک باشعور اور حساس انسان سے کون امید رکھے کہ اس اذیت سے دوچار نہ ہوتا ہوگا۔ دوری اور جدائی کا شمار انسان کو درپیش چند بڑے دکھوں میں سے ایک ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ دکھ دیگر تمام دکھوں سے بڑھ کر اذیت ناک ہے۔ کیونکہ میں نے دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور باہم محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت روتے ہوئے کئی بار دیکھا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی اور غم ہو جو پریشانی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں آنسو بھی لائے۔ بیٹا دیارِ غیر اچھے مستقبل کے لیے جا رہا ہے، والدین خوش ہیں مگر دوری کے احساس سے آنکھیں لبریز ہیں۔ بیٹی رخصت ہو کر اپنے گھر جا رہی ہے۔ دلھن اور والدین، دونوں کے والدین کے لیے یہ خوشی کی بات ہے مگر جدائی کا خیال رلائے جا رہا ہے۔ کسی مرنے والے پر بھی ہم اس لیے روتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو رہا ہوتا ہے۔ گویا جدائی کا غم ہر ایک غم سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے اپنے وطن، اعزہ، دوست احباب سے بچھڑ کر دیارِ غیر میں کون

اداس نہ ہوتا ہو گا۔ مگر حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس دکھ کو وہ مسافر لوگ برداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیارِ غیر میں بسنے والے شعرا اپنے کلام میں اس کرب کو بڑی شدت سے بیان کرتے ہیں ۔ہالینڈ میں مقیم شاعر ارشاد قمر کہتے ہیں۔

خزاں کی چاہ میں کھلتے چمن کو چھوڑ دیا
تلاشِ رزق میں نکلے، وطن کو چھوڑ دیا (۱)

ہالینڈ ہی میں مقیم عدیل شاکر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم پڑے ہیں دیارِ غیر میں یوں
جیسے لاشیں ہیں سرد خانے میں (۲)

کیلیفورنیا میں رہنے والے خالد خواجہ کے ہاں اس دکھ کا اظہار کچھ یوں نظر آتا ہے۔

کھرے سکے کمانے کے لگن میں
مقدر میرا کھوٹا ہو گیا ہے (۳)

حمیرا شمع رضوی کینیڈا میں سکونت پذیر ہیں۔ وہ اپنے شعروں میں دوری کے اس احساس کو یوں بیان کرتی ہیں۔

ہم نے بھلا دیے تھے گزرے ہوئے زمانے
جب بھی چلے سفر کو ہر گام یاد آئے (۴)

دیارِ غیر میں رہنے والے شاعر اور ادیب اپنے دکھ کے اظہار کے ساتھ شعوری و لاشعوری طور پر دیارِ غیر میں اردو کی ترویج کے لیے بھی معاونت کر رہے ہیں۔ تخلیقی سطح پر جہاں شاعر اور افسانہ نگار اس سمندر میں اپنے حصے کا قطرہ ڈال رہے ہیں وہاں محققین بھی اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہیں۔ وہ اپنی تحقیق میں دیارِ غیر سے اردو کی ترقی کی رفتار اور اشاعت سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ مشوروں سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرؤف نیپال میں ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون ''نیپال اردو کا نیا مرکز'' (۵) میں نیپال

میں اردو کی مقبولیت پر قلم اُٹھایا ہے۔امریکہ سے نیر جہاں نے ''امریکہ میں اردو مرکز انٹر نیشنل''(۶) میں اردو کی رفتار کی اطلاع دی ہے۔''قزاقستان میں اردو''(۷) میں ڈاکٹر رؤف امیر نے قزاقستان میں اردو کی موجودہ صورتِ حال کو موضوع بنایا ہے۔کنور احمد صدیقی ''برطانیہ میں اردو درسیات کے معاملات''(۸) میں دیارِ غیر میں اپنی زبان کو زندہ رکھنے اور نئے علاقوں میں اپنی آنے والی نسلوں کا اپنی تہذیب اور زبان سے رشتہ قائم رکھنے کی پر خلوص جستجو کرتے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ دیارِ غیر سے اردو کے اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں۔''مخزن''؛''دریچہ انٹرنیشنل''اور''حسنِ خیال''کے نام فوری طور پر میرے ذہن میں آئے ہیں۔ان تمام شواہد کی روشنی میں کم از کم مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دیارِ غیر میں بسنے والے قلم کار تا بہ مقدور اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

....

حواشی

(۱) ارشاد قمر،صدائیں ساتھ دیتی ہیں،ص ۳۱،بیلا پبلی کیشنز،اسلام آباد،جون ۲۰۰۷ء

(۲) عدیل شاکر (غزل)،ماہ نامہ تخلیق،مدیر اظہر جاوید،ص ۵۶،بھگوان سٹریٹ،پرانی انارکلی لاہور،اکتوبر ۲۰۰۹ء

(۳) خالد خواجہ (غزل)سہ ماہی فنون،مدیر احمد ندیم قاسمی،ص ۲۳۱،مزنگ روڈ لاہور،ستمبر۔دسمبر ۲۰۰۲ء

(۴) حمیرہ شمع رضوی (غزل) ماہ نامہ تخلیق،مدیر اظہر جاوید،ص ۵۶،بھگوان سٹریٹ،پرانی انارکلی لاہور،اگست ۲۰۰۹ء

(۵) ڈاکٹر عبدالرؤف (مضمون)۔اخبار اردو،مدیر:محمد اسلام نشتر،ص ۷،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،دسمبر ۲۰۰۱ء

(۶) نیر جہاں (مضمون) اخبار اردو،مدیر:محمد اسلام نشتر،ص ۵۰،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،جولائی ۲۰۰۷ء

(۷) ڈاکٹر رؤف امیر،(مضمون)اخبار اردو،مدیر:محمد اسلام نشتر،ص۳۵،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،جنوری ۲۰۰۹ء

(۸) کنور احمد صدیقی (مضمون) اخبار اردو،مدیر:محمد اسلام نشتر،ص۳۰،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،اپریل ۲۰۰۸ء

پروفیسر شازیہ نصیب سومرو (بہاولپور)

بیرون ملک مقیم پاکستانی اگرچہ مثبت کردار تو ادا کر رہے ہیں مگر اطمینان کی کیفیت اتنی تسلی بخش نہیں ہے کہ اسے شعروادب کا منتہا قرار دیا جائے۔ اسی لیے حب الوطنی تقاضا کرتی ہے کہ ادب کی وسعتوں کو آزمایا جا سکے۔

تخلیق یوں تو زمان ومکاں کی قید سے ماورا ہوتی ہے لیکن مقصدیت تقاضا کرتی ہے کہ وطن کی محبت کو اپنا طرزِ عمل، شعور اور اظہار بنا لیا جائے اور سچ یہ بھی ہے کہ بیرونِ ملک میں بسنے والے ادیبوں پر ذمہ داری اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کہ وہ پوری دنیا میں اپنی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسری زبانوں کو صرف زبان کی حد تک لیا جائے نہ کہ تہذیب کو اپنا لیا جائے۔ اس لحاظ سے ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں حب الوطنی کے جذبے میں روانی کی ضرورت ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ ہے۔

بیرون ملک مقیم ادیبوں کی تخلیقات میں پاکستانیت کی کمی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان ادیبوں کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ادب اور تخلیقات کو کمرشل نہ ہونے دیں بلکہ کمالِ فن کا تقاضا تو یہ ہے کہ صرف اور صرف وطنیت کا نظریہ ہی ان کی تخلیقات کی روح ہو۔

میرے ملک کا ادب آج بھی ان شاہینوں کا متلاشی ہے جو اندرون یا بیرون ممالک میں پاکستان کی ثقافت اور تہذیب کا صحیح روپ اُجاگر کر سکیں۔ اس لحاظ سے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی تخلیقات مزید نکھار کی متقاضی ہیں۔

میرے خیال میں ان تخلیق کاروں کو اپنی ثقافت سے مضبوط رشتہ قائم کرنا ہوگا تا کہ رنگ ثقافت کی ہر جھلک عیاں ہو سکے۔ مطالعہ کی وسعت بھی ان کے ادب کو حیات جاوداں بخش سکے گی۔

پروفیسر محمد شہزاد رانا (بہاولپور)

بلاشبہ بیرون ملک مقیم پاکستانی شعروادب کی ترویج میں مثبت کردار ادا کر رہے ہیں وہ اس طرح کہ وہ خود ایسا تخلیقی مواد سامنے لے کر آتے ہیں جو جاذب نظر ہوتا ہے۔ عام طور پر عاریتاً دستیاب ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ تخلیق کار اپنی مطبوعات اعزازی طور پر اپنے اہداف تک پہنچاتے ہیں۔ یہ احباب معیاری ادبی جرائد کی اشاعت میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں اور اپنے ہاں بھی ادبی رسائل شائع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی کتب کی اشاعت میں مالی معاونت کرتے ہیں۔ بعض آسودہ تارکین وطن پاکستان سے شعرا و ادبا کو اپنے ہاں مدعو کر کے نہ صرف ادبی محافل سجاتے ہیں بلکہ ان کی اور ان کے فن کی تشہیر بھی کرتے ہیں۔ بیرون ممالک میں منعقدہ ان تقریبات کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جونیئرز اور سینئرز کا تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ یہ عمل ایک دوسرے کو Motivate کرتا ہے۔

۱۔ ہمارے ملک میں بڑھتی ہوئی گرانی نے تخلیق کار کو معاشی اور معاشرتی طور پر دیوار کے ساتھ لا کھڑا کیا ہے۔ ایسے میں بیرون ممالک میں مقیم تخلیق کار انہیں اس اعصابی تناؤ سے کچھ دیر کے لئے نکال کر نئی دنیا کی نئی جہتوں سے روشناس کراتے ہیں۔ اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ پاکستانی ادیب وشاعر کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ اسے ایکسپوئیر ملتا ہے۔ نئے نئے موضوعات اس کے نوکِ قلم سے پھوٹتے ہیں تو اس گلوبل ولیج کی دوڑ میں قلم کار دیگر اصناف میں احساس تفاخر سے چلنے کا سلیقہ ڈھونڈ نکالتے ہیں جس سے ان کا اعتماد بڑھتا ہے اور پر اعتماد ادیب وشاعر ہی با اعتبار ہوا کرتے ہیں۔

جب تحریر و تقریر میں اعتبار ہو تو فن کے سوتے صحیح انداز سے اپنا عمل مکمل کر پاتے ہیں۔

۲۔ جی ہاں! بیرون ممالک میں مقیم اہلِ قلم کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو نظر آتی ہے۔ وطن کی یاد اسے ہی آتی ہے جو غریب الوطن ہوتا ہے۔ وطن میں بیٹھے لوگ تو وطن کی ہر چیز پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ادیب، شعرا اور کالم نگار تنقیدی رویوں سے اتنے سرشار ہوتے ہیں کہ اپنے ہی ارشادات و افکار سے مطابقت رکھتی باتوں پر کڑی تنقید کر رہے ہوتے ہیں، ویسے ہی ہمارے ہاں سیاست پر گفتگو، کرکٹ میچ دیکھنے اور اس پر جی بھر کر تبصرہ کرنے سے فرصت ملتی ہے تو اپنے ملک کا رونا رویا جاتا ہے۔

۳۔ میں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کام سے مطمئن ہوں۔ تاہم معیار سے پوری طرح نہیں اس لیے کہ بیشتر اوقات کام سے زیادہ اس کی پیش کش زیادہ بھلی دکھائی دے رہی ہوتی ہے مثلاً کاغذ بہت نفیس ہوتا ہے۔ طباعت کی تمام رعنائیاں سموئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن تخلیقات ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں۔ ایسے میں ایک بڑا دھچکا سا محسوس ہوتا ہے اس کی بجائے دونوں یعنی تخلیق اور اس کی پیش کش کے معیار کا مساوی ہونا زیادہ بھلا معلوم ہوگا یا پھر ان دونوں کے درمیان شاک آبزاربر (Shock Absorber) ہونا چاہیے جو تخلیقی وہیکل کے سفری مراحل کو آرام دہ بنا دے گا۔ توازن تو تب ہی ہوگا کہ جب اچھے ریپر میں معیاری پراڈکٹ ہوگی۔

۴۔ نوآموز تخلیق کاروں کو اچھے اساتذہ کا ہاتھ پکڑنا چاہیے تاہم سینئر لکھاری بھی اپنے ہم عصروں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ پاکستان میں کوئی ایسا مرکز ہو جہاں بیرون ملک تخلیق کیا جانے والا سارا اردو ادب مجتمع ہو یعنی جس کی جو کتاب چھپے وہ یہاں میسر ہو اگر ایسا ہو گیا تو یقیناً بہت بڑا ذخیرہ ہوگا جو ہمارے لئے خوش گوار حیرت کا

گا

سید تحسین گیلانی (بورے والا۔ پاکستان)

جیسا کہ آپ کی کتاب کے عنوان ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے چار سوالوں کا جواب تو خود ہی دے دیا ہے۔ ہاں اگر آپ کی کتاب کا عنوان یوں لکھا ہوا ہوتا ''اردو شعر و ادب کے سفیر......؟ تو یہ ظاہر ہوتا کہ آپ واقعی سوال اٹھانے کے موڈ میں ہیں۔ مجھے صرف یہ بتائیں آپ نے مثبت کردار، وطن کی خوشبو، تخلیقات کا معیار اور ان کے تخلیقی کاموں...... جیسے سوالات اٹھائے ہیں اور مزید براں پوچھا ہے کہ ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے..؟ میں نے آج تک کہیں ''وطنی ادب'' کی ترکیب دنیا کے کسی ادب میں نہیں دیکھی اور نہ ہی سنی۔ تخلیق یا تخلیق کار سرحدوں کا قیدی کیونکر ہو سکتا ہے..؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ Words worth Yeats, Breadley, Shelly, یا Platoo اگر صرف وطنیت پر ہی اکتفا کرتے تو کیا آج ہم تک پہنچ سکتے؟ میں صرف اور صرف آپ کے پانچویں سوال (آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟) پر ہی بات کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اصل میں بنیادی مسئلہ اسی سوال میں پوشیدہ ہے۔ اصلاً تخلیقِ فن میں ہمیشہ چار کردار حصہ لیتے ہیں آہنگ، اجتماعی شعور، معروضی دنیا اور تخلیقی مشین۔ گو کہ یہ سارا کھیل فنکار کے اندر ہی کھیلا جاتا ہے جہاں شخصیت کے بکھرے ہوئے ریزے باہر کی دنیا اجتماعی لاشعور کے چھپے عناصر سے ٹکرا کر بے نام، بے ہیت اور بے سمجھ ہو جاتے ہیں۔ تاہم جب فنکار کی ذات میں نہاں تخلیقی مشین (جو داخلی آہنگ کو چھونے سے حرکت میں آتی ہے) اس بے صورت فضا سے تخلیق کو جنم دیتی ہے تو تخلیق کا داخلی نظام اجتماعی لاشعور کی جہات سے، اور خارجی صورت، زمانے اور شخصیت کے اجزا سے مستعیر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک فنی تخلیق کی توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ اپنے زمانے سے منسلک بھی ہے اور ماورا بھی! بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''اس کی حیثیت اس بیج کی سی ہے جس

کے اندر درخت کی ایک نئی نسل کی بے صورت "صورت" پنہاں ہے لیکن جو مناسب زمین، پانی اور فضا کے بغیر تشکیل پذیر نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ بلکہ جب وہ اپنے جسم کی تشکیل میں خارجی عناصر کو بروئے کار لاتی ہے تو یہ عناصر اُس پر کتبوں یا لبادوں کی طرح آویزاں نہیں ہو جاتے بلکہ گھل کر اُس کے اندر جذب ہوتے اور ایک ایسے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں جس کا ایک بے نام سا ہیولیٰ ہی بیج کے اندر موجود ہوتا ہے۔ گویا درخت کا ڈھانچہ ہے تو پانی، مٹی، ہوا کا ایک مرکب لیکن جب یہ ایک کیمیائی عمل سے گزر کر اپنی خاص صورت میں نمودار ہوتا ہے تو پانی، مٹی اور ہوا کی ہیت سے قطعاً دست کش ہو چکا ہوتا ہے۔ جب تک خارج کے اجزا اپنی مصروفیت کو تج نہ دیں وہ فنی تخلیق میں جذب ہو ہی نہیں سکتے۔ معاشرے کی ضروریات اور مسائل کو ادب میں شعوری طور پر سمونے والوں کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے!"

تخلیق کار کہیں بھی ہو اُس کی اوّلین ترجیح فنِ تخلیق کو سمجھنا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً اُس ادیب اور شاعر کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے جو ارضی سطح کے مسائل کو زیرِ قلم لا کر صرف معاشرے کی معروضی صورت ہی کو اہمیت دیتے ہیں اور معاشرے کے مسائل اور مطالبات کی تشہیر کو فن کا اہم ترین مقصد قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ سب سے اہم بات ہے۔ جس کو عام کرنے کے لیے آئے دن اخبارات اور تقاریب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی رہبر، مقرر کا کام ادیب نے اپنے ذمے لے لیا ہے جبکہ تخلیق کار کا کام اپنی ذات میں غوطہ لگا کر معاشرے کی ان کہی خواہشوں اور سوچوں کو سامنے لاتا ہے اور اس وژن (Vision) کو گرفت میں لے کر بیان کرنا ہے جسے معاشرہ محسوس تو کرتا ہے لیکن پہچاننے سے قاصر ہے۔ نظریے کو فن کے تابع کرنے والے نعرے بازی پر اتر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی ہجوم سے مخاطب ہیں۔ تخلیقی عمل وطن اور سرحدوں کا پابند و محتاج نہیں وہ کہیں بھی ہو کسی بھی خطہ ارضی میں موجود ہو اُس کی تحریری زبان میں آپ صرف اور صرف یک زمینی کرب ہی محسوس نہیں کریں گے بلکہ کائناتی درد خود بخود اسلوب کے متن میں بصورتِ تمثیل،

علامت اور استعارہ نمودار ہوگا۔فن کی زبان اساطیری اور علامتی ہونی چاہیے یوں ایک سچا فن کار کہیں بھی ہو وہ فنی تخلیق میں خود کو اجاگر کرتا ہے اور معاشرہ اپنی داخلی سطح پر اس سے متمتع ہوتا ہے۔

پریا تابیتا (لاہور)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، علم وادب کی دنیا میں ایک معتبر نام، ایک ادب پرور شخصیت، جو کبھی تنہائی کے عالم میں رفتگاں کی محفل سجاتے ہیں، کبھی سائباں سے اظہار عقیدت کر کے بزمِ خیال آباد کرتے ہیں، کبھی کہکشاں کو مشعل راہ بنا کر اسپ قلم کو ہموار راستے دکھاتے ہیں کبھی ہمرہاں کا ساتھ نبھاتے ہوئے اس ادب کش معاشرے میں تخلیق کار اور قارئین کا رشتہ بحال کرنے میں کوشاں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی امکاں کی اس انداز سے حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ اُن کی تخلیقات کی روشنی سے عالم امکان جگمگاتا دکھائی دینے لگتا ہے۔کبھی وہ دُرنایاب کی جستجو میں سرگرداں کبھی کمیاب کی تلاش کی تکمیل پر مطمئن اور کبھی احباب کی محبت سے سرشار نظر آتے ہیں۔اُن کی یہ جستجو، اطمینان اور سرشاری انہیں نایاب، کمیاب اور احباب کی مثلث سے ادب، ادیب اور قاری کی مثلث کو استوار کرنے میں مدد دیتی ہے۔بات فقط اتنی ہی نہیں ہے، حال ہی میں اُن کی دوربین نگاہیں مضافات میں چھپے گوہر نایاب تلاش کرلائی ہیں اور اب اُن کی ادب پروری تعصب کی فضا میں وسیع النظری کا نقیب بن کر ارضِ وطن کی حدود سے باہر ادب کی تلاش میں مشغول ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کی یہ انفرادیت ہے کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ایک منفرد موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' کے ذریعے بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔اس سے قبل بھی وہ تحقیق وتنقید، ادبی کالموں، تقاریر، کتب اور 'شام وسحر' کے دھندلکوں اور اُجالوں میں اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہتے رہتے

ہیں۔ اُن کی فیاضی، سخاوت، وسیع القلبی، کشادہ ذہنی، قومی یکجہتی اور خوش اخلاقی کا یہ عالم ہے کہ جب بھی بیرونِ ملک سے کوئی ادیب یا شاعر پاکستان آئے، ڈاکٹر صاحب اُس کے اعزاز میں تقاریب منعقد کرواتے ہیں۔ خدا جانے اُن کی یہ ادبی مہمان نوازی انہیں کیسی خوشی دیتی ہے کہ وہ اس حسد زدہ عہدِ انتشار اور بے حسوں کے جمِ غفیر میں رہ کر بھی ہر سُو محبتیں بانٹنے کا ہنر جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ بلاتعصب، بلاتخصیص بیرونِ ملک مقیم شعرا و ادبا کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اور ''اُردو شعر و ادب کے سفیر'' کی اشاعت سے ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اچھا تخلیق کار زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔

بیرونِ ملک مقیم بیشتر شعرا و ادبا نے جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر آفاقی، عصری، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور رومانوی ہر نوعیت کا ادب تخلیق کیا ہے چنانچہ ہم انہیں سرحدوں کا پابند کر کے اپنے ادب سے الگ نہیں کر سکتے کیونکہ کسی بھی ادب پارے کی شناخت محض اس کی جائے پیدائش سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ ادب ہر عہد اور ہر زماں میں اپنا وجود، اپنی شناخت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تخلیق کار اپنے اردگرد کے ماحول، معاشرے، جغرافیہ، تہذیب و تمدن، حالات، واقعات، تجربات اور جذبات و احساسات کے زیرِ اثر ہی اپنے فن کا اظہار کرتا ہے مگر اس کی تخلیق اپنے معیار کے بل پر خود کو محدود سے لامحدود کی طرف لے کر جاتی ہے پھر صاحبانِ فہم و ذکا کی معتبر نگاہ اِسے نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے معیار کا تعین کرتی ہے۔ اسی حقیقت کے ادراک نے ادبی مراکز، مضافات اور ارضِ پاک کی سرحدوں سے پرے مقیم ادبا و شعرا کے ادبی اور زمینی فاصلے یکسر ختم کر دیئے ہیں۔

یہ درست ہے کہ بیرونِ ملک بسنے والے کم و بیش تمام شعرا و ادبا کو جدید سہولیاتِ زندگی میسر ہیں، روپے پیسے کی ریل پیل نے انہیں خوشحالی جیسی نعمت سے بھی قریب کر دیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات باہر کی دنیا آباد ہونے سے انسان کا

باطن تنہا ہو جاتا ہے۔

قطرے کی بات ہے نہ سمندر کی بات ہے
سچ پوچھیے تو یہ میرے اندر کی بات ہے
تم جس کو مل گئے ہو اُسی کا نصیب تھے
اب ہم کو کیا ملے گا مقدر کی بات ہے

(طالب حسین شاہ)

اسی احساسِ تنہائی کو کم کرنے اور اپنے اندر کے دُکھوں کو بانٹ لینے کی غرض سے وہ شعوری اور لاشعوری ہر سطح پر روحانی اور قلبی طور پر خود کو وطن عزیز میں محسوس کرتے ہیں۔اُن کی تخلیقات اس بات کی غماز ہیں کہ وہ مغربی کلچر میں رہتے ہوئے بھی مشرقی اقدار و روایات کو سینے سے لگائے ہوئے جی رہے ہیں۔ اُن کی تحریروں سے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے۔ ہمارے موسموں کا حُسن، رنگوں، پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں کی مسحور کن دلکشی، لہلہاتے کھیت، ہل، برگد کی چھاؤں، پرندوں کی چہکار، چودھویں کا چاند، تاروں بھری راتیں، مشرق سے اُبھرتا سورج، گاؤں کے کچے گھروں کا اچھوتا روپ اور شہر کی پُر رونق گلیاں، چہل پہل، غرض ارضِ پاک کے ذرّے ذرّے سے والہانہ محبت کا اظہار اُن کی نثری اور شعری تخلیقات کا حُسن ہے۔

اپنوں سے دُوری ہجر کے صدمے ان پر پہاڑ بن کر ٹوٹتے ہیں تو اُن کی تحریروں میں اجنبیت کا دُکھ، احساسِ تنہائی، محرومی، تشنگی، مایوسی اور مادی ترقی کی دوڑ میں انسانیت کو پچھاڑ دینے والی بے حسی اور خود غرضی کی کیفیات کا ایسا واضح نظر آتا ہے۔

مسافر ہیں اور اک خانہ بدوشی ہے مقدر میں
کبھی اس پار ملتے ہیں کبھی اُس پار ملتے ہیں

کہاں وہ پُرسکوں بستی جہاں پر چین ملتا تھا
یہاں شام و سحر وحشت زدہ آثار ملتے ہیں

(صبیحہ صبا)

ہجرت کا ثمر بھی تو مقدر نہیں اپنا
بے گھر ہوئے ایسے کہ کوئی گھر نہیں اپنا
بیٹھے ہیں سرِ کوئے غریب الوطنی ہم
دیوار نہیں اپنی کوئی در نہیں اپنا

(اشفاق حسین)

ارضِ وطن سے دُور ہونے کے باوجود یہاں پھیلی ہوئی بدامنی، تفرقہ بازی اور دہشت گردی سے وہ بھی نالاں ہیں اور سرزمینِ پاک پہ ہونے والے ظلم وستم کی خونیں داستانیں انہیں بھی اُسی کرب میں مبتلا کرتی ہیں جس اذیت میں اہلِ وطن گھٹ گھٹ کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کی تخلیقات میں وطن سے دوری کا احساس بھی نظر آتا ہے اور تخیلاتی سطح پر پردیس کو دیس بنا لینے کی سعی بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عملی طور پر بھی دیس سے رابطہ استوار رکھتے ہیں۔ پردیس میں تھکا دینے والی مشینی زندگی میں سے چند ساعتیں چُرا کر بھی وہ اپنے ہم وطن مرحوم شعراء وادبا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ادبی تقاریب کا انعقاد کرتے ہیں اور باہم مل بیٹھ کر غریب الوطنی کے کرب کو کسی حد تک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی محافلِ مشاعرہ کا اہتمام اور اُن میں اپنے مشرقی کلچر کی عکاسی کے ذریعے اپنے وطن میں ہونے والی ادبی تقاریب کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ عالمی ادب سے گہری شناسائی کے بھرپور مواقع انہیں وسعتِ مطالعہ جیسی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔ نتیجتاً نیا ڈکشن، نادر تشبیہات، منفرد تراکیب، نت نئے استعارے، مغربی تہذیب وتمدن کے جدید رنگ، عرب امارات کا طرزِ حیات اور ادبی زاویے، مغربی موسموں کی دل آویزی سب کچھ

مشرقی ادب میں ضم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں ادبا و شعرا انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب کے اُردو تراجم کر کے اُردو زبان و ادب کا ذخیرہ وسیع کر رہے ہیں۔ کہیں وہ طبع زاد تخلیقات سے غیر ملکیوں کے دلوں میں ارضِ پاک اور اُردو زبان سے محبت کا چراغ روشن کرنے میں کوشاں ہیں۔ کہیں وہ ادبی جرائد کی مسلسل اشاعت سے بے شمار نو وارد تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کر کے اُردو زبان و ادب سے ان کی محبت کو دو چند کر رہے ہیں اور کہیں اُن کی راہوں میں حب الوطنی کے دیپ روشن کرتے نظر آتے ہیں۔

کچھ ادبا و شعرا نے انٹرنیٹ سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اُردو ویب سائٹس بھی متعارف کروائی ہیں بالخصوص محترمہ صبیحہ صبا اور محترم صغیر احمد صاحب نے امریکہ میں Urdumanzil.com کے نام سے جو ویب سائٹ متعارف کروائی ہے اُس پر ڈائریکٹری، تصویری و ادبی خبرنامہ، ادبی تقریبات کی روداد و تصاویر، پاکستان اور بھارت کے معروف شعرا کا کلام، ادبا و شعرا کے انٹرویوز، مذہبی و قومی تہواروں کی تقریبات کی تصویری روداد، ادبی اور قومی ہیروز کی یاد میں منعقد ہونے والی تقاریب کی خبریں، نئی کتابوں کے تعارف، سالانہ مشاعروں کا حال، عید الوطن، مشاعرے، اعزازی تقریبات اور بے شمار ادبی مواد موجود ہے جو محترمہ صبیحہ صبا اور محترم صغیر احمد صاحب کی اُردو زبان و ادب سے والہانہ محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مختصر یہ کہ بیرونِ ملک مقیم شعرا و ادبا نے اپنے اپنے ذوق، صلاحیت، استعداد اور استطاعت کے مطابق اُردو زبان و ادب کا دامن خلوص اور محبت سے بھر دیا ہے اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کا اختصاص یہ ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف یہ کہ "اُردو شعر و ادب کے سفیر" کی اشاعت سے اُن کے خلوص اور محبت کا جواب دیا ہے بلکہ "اُردو شعر و ادب کے سفیر" کی اشاعت کے ذریعے ہمیں ارضِ پاک سے باہر بھی اُردو ادب کی ایک سجی سنوری دنیا دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے اور بیرونِ ملک مقیم شعرا و ادبا کو یہ باور کروایا ہے کہ ارضِ وطن اور اہلِ وطن

کا محبت بھرا دل اُن کے لیے آج بھی دھڑک رہا ہے۔

پروفیسر شفیق الرحمن الہ آبادی (میلسی)

دنیائے ادب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمہ گیر اور ہمہ صفت شخصیت کے مالک ہیں، انکی ادبی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہیں، عصرِ حاضر میں جہاں لوگوں کی اکثریت مادہ پرستی اور ہوسِ زر میں مبتلا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کو مطمحِ نظر بنا رکھا ہے۔ وہ موضوع کے انتخاب میں ندرت اور انفرادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے زیرِ تحقیق موضوع کے تمام رُخوں کا کماحقہٗ احاطہ کرتے ہیں جس کی واضح مثال ''مضافاتی شعر و ادب'' کی تخلیق کے بعد ان کی تازہ تصنیف ''اردو شعر و ادب کے سفیر'' ہے جس میں انہوں نے عمیق نگاہی سے بیرونِ ملک میں مقیم منتخب پاکستانی شعرا و ادبا کی ادبی خدمات کا محققانہ اور مشفقانہ جائزہ پیش کر کے ادبی دنیا میں ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ قبل ازیں اس موضوع پر ایسا جامع اور مربوط تحقیقی کام میری نظر سے نہیں گزرا، بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ان تھک لکھنے والوں میں ہیں، انہوں نے معروف و متعارف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نئے نئے موضوعات پر بھی اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔''

بیرونِ ملک میں مقیم پاکستانی اہلِ قلم کی تخلیقات کا اہم وصف ان کی تحریروں میں اپنے وطن (پاکستان) کی خوشبو ہے کیوں کہ وطن سے محبت دین کا جز ہے اور تخلیق کار عام آدمی کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے اس لیے اس کی تخلیق میں جذبہ حُب الوطنی بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جس گھر میں انسان چند روز رہے اس کے در و دیوار سے محبت ہو جاتی ہے۔ پرندے جس درخت پر گھونسلا بناتے ہیں اس سے پیار کرتے ہیں، کوئی آدمی کسی

دوسرے ملک میں کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو پھر بھی وطن کی یاد اسے ضرور ستاتی ہے اسے اپنے وطن کی کچی گلیاں لندن و پیرس کی آراستہ سڑکوں سے زیادہ دلفریب اور حسین معلوم ہوتی ہیں، وطن کی فضا میں جو اپنائیت اور سکون ملتا ہے وہ پردیس میں نہیں ملتا، دینا بھر کی لذتیں اور مسرتیں وطن کے مقابلے میں ہیچ ہیں، احمد ندیم قاسمی نے اس تاثر کو اپنے ایک خوبصورت شعر میں یوں پیش کیا ہے۔

عمر بھر ایک ترا دھیان رہا
یوں تو مہر و مہ و اختر دیکھے

وطن کی محبت ہمدردی اور اخوت کے جذبے کو بیدار کرتی ہے جن لوگوں اور ادیبوں کا مطمع نظر محض یہ ہو کہ وطن کی مٹی سے سونا حاصل کیا جائے اور اسے اپنے ذاتی مفاد کی تزئین و آرائش پر صرف کیا جائے وہ محب وطن نہیں محض ابن الوقت ہیں ان کے قلب حب وطن کو جز و ایمان نہیں بنا سکے، اشفاق حسین کا شمار ایسے شعرا کرام میں ہوتا ہے جو بیرون ملک میں مقیم ہیں لیکن ان کی شاعری میں وطن سے اُلفت کا اظہار ملتا ہے۔ایک شعر ملاحظہ فرمائیں!

یہ پیام لے کے آئیں مرے دیس کی ہوائیں
جنہیں تیرگی کا غم ہے وہ چراغ دل جلائیں

امریکہ میں مقیم لاہور کے معروف شاعر نقاش ہاشمی مغربی کلچر میں رہنے کے باوجود مشرقی روایات اور اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے نعت گوئی کے ذریعے چراغ مصطفوی کو روشن کیے ہوئے ہیں، اسی طرح پاکستان کے ایک اور شاعر عرفی ہاشمی آسٹریلیا میں مقیم ہیں اور نوجوانی میں ہی صنف مرثیہ سے تعلق خاطر جوڑ لیا ہے اور مرثیہ گوئی کے ذریعے شہداء کربلا کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں، شاعروں کے علاوہ نثر نگار حضرات بھی اپنی نثر کے ذریعے اپنے وطن کی محبت کا پرچار کر رہے ہیں جن میں ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر نجیب

جمال، ڈاکٹر اے۔ بی اشرف اور ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کی ادبی و تدریسی خدمات کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جدید ترین ذرائع ابلاغ چوں کہ بے حد موثر اور دیرپا نقش جمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے مسلمان دشمن عناصر انہیں پوری منصوبہ بندی سے نظریاتی ابہام پیدا کرنے اور اسلامی اقدار کی نفی کرنے، ان کو نشانۂ تمسخر بنانے اور لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں ان کا ہدف یہی ہے کہ ہماری نئی نسل میں نیک و بد کی تمیز مٹ جائے۔ اس تناظر میں پاکستانی اہلِ قلم کو بالعموم اور بیرون ملک میں مقیم پاکستانی ادبا کو بالخصوص لازم ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ مغربی یلغار کے منفی اثرات کا ذکر بھی کریں تاکہ ہم اس فحاشی و عریانی اور ثقافتی یلغار کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی مشرقی اقدار و روایات کی پاسداری کر سکیں اسی طرح تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ اپنی تخلیقات میں اتحاد و اتفاق کا درس دیں۔ مدیران کو چاہیے کہ وہ اپنے اداریوں میں جذبہ حب الوطنی اور اتحاد بین المسلمین کا پرچار کریں اگر حکومت، سماجی کارکن، اساتذہ، دانشور اور تخلیق کار معاشرے میں موجود خرابیوں کو دور کرنے کا عزم کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا تابناک اور روشن ماضی ایک بار پھر لوٹ کر نہ آ جائے۔

جاوید صدیق بھٹی (لاہور)

اردو ادب میں جہاں بہت سے لوگ اندرون ملک شاعری اور نثر میں ادبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہاں بیرون ملک مقیم شاعروں، ادیبوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد فروغ ادب میں کوشاں ہے۔ ان میں سے بہت شاعری میں اپنی نظم، غزل، ہائیکو اور دوسری شعری اصناف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں جبکہ کچھ لوگوں نے ناول، افسانہ اور کہانی میں بھی نام پیدا کیا ہے۔ بیرون ملک جو لکھاری مقیم ہیں ان میں اسحاق ساجد

(جرمنی)، ریحانہ قمر (امریکہ)، ممتاز راشد (قطر)، نذیر اے قمر (سپین)، نقاش ہاشمی (امریکہ)، ضیا جلال پوری (لندن) اور شمع چودھری (امریکہ) قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان کے وہ شعرا اور ادبا جو بیرونِ ملک مقیم ہیں وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں وہ شعروادب کے سفیر ہیں۔ وہ اُردو زبان و ادب کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ وہ وہاں پاکستان کی ثقافت کی نمائندگی کر رہے ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ پاکستان کی سفارت کاری کر رہے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بیرون ملک مقیم یہ شاعر ادیب پاکستان کی شہرت کا باعث بھی ہیں ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے پاکستان کے لوگوں کو مغربی کلچر اور ماحول کا پتہ چلتا ہے۔ بیرون ملک مقیم شعرا و ادبا کی کتب و تخلیقات زیادہ تر پاکستان سے شائع ہوتی ہیں اس سے پاکستانی معیشت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بیرونِ ملک مقیم شاعروں، ادیبوں کو یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قاری کو پڑھنے کے لیے معیاری، سستا اور اصلاحی مواد فراہم کریں تاکہ پڑھنے والے اس سے استفادہ کر سکیں۔ محترم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنا اہم کام کیا ہے۔ اس سے قبل وہ مضافات میں بسنے والے لکھاریوں پر بھی کام کر چکے ہیں اور اُن کے آئندہ منصوبوں میں ''مسیحی مشاہیر'' بھی نمایاں ہے۔ یہ سارے وہ کام ہیں جن پر جناب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ مَیں ان کو اس بھرپور خدمت پر بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کی لمبی عمر اور اچھی صحت کے لیے دُعا گو ہوں تاکہ وہ اور زیادہ ادبی خدمت کر سکیں۔

پروفیسر سید محمد علی رضا (بہاولپور)

۱۔ یقیناً مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے مصروف ترین لمحوں میں سے شعروادب کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ دنیا بھر میں بے شمار پاکستانی تخلیق کار

ادب تخلیق کر رہے ہیں آسٹن میں فرح خیال، میری لینڈ واشنگٹن میں مونا شہاب، نیو جرسی میں رشیدہ عیاں اور شاہدہ نسیم سالک، نیویارک میں عزیز الحسن عزیز، خالد عرفان، صلاح الدین ناصر، شکاگو میں رشید شیخ، ہیوسٹن میں عدیل زیدی، ہالینڈ میں ارشاد قمر، میلبورن آسٹریلیا میں عندلیب صدیقی، ابوظہبی میں یعقوب تصور، بحرین میں اقبال طارق اچھی شاعری کر رہے ہیں۔ ان سب کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ٹورانٹو میں ڈاکٹر بلند اقبال، لندن میں بانو ارشد، بریڈفورڈ میں مقصود الٰہی شیخ، جرمنی میں سرور ظہیر، ہما اور حیدر قریشی اچھے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان اصحاب کے بھی مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کی یہ فہرست نہایت مختصر ہے۔ ان کے علاوہ بے شمار لوگ زبان و ادب کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

۲۔ بیشتر شعراء و نثر نگاروں کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو کا واضح طور پر احساس ہوتا ہے۔

۳۔ جس طرح ہمارے ہاں شاعری زوروں پر ہے۔ اصلاح لینے کا رواج متروک ہو چکا ہے۔ ہر نو وارد بڑا شاعر ہے۔ بے استاد شعرا کی بہتات ہے جن کا کلام اُن ہی کی طرح ہے۔ یہی سب کچھ بیرون ممالک میں بھی ہوتا ہے۔ اگر وہاں کی تخلیقات کا معیار نہیں ہے تو یہاں بھی سب کچھ معیاری نہیں ہے۔

۴۔ بیرونِ ممالک مقیم پاکستانیوں کا کام اس لئے قابلِ اطمینان ہے کہ وہ اپنی زبان سے اغماض نہیں برت رہے۔ تقریباً ہر شاعر کا شعری مجموعہ سامنے آیا ہے۔ البتہ نثر توجہ کی طالب ہے۔ نثری تخلیق کاروں اور ان کے کام

کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

۵۔ ہمیشہ سے ہر میدان میں خوب سے خوب تر کی گنجائش رہی ہے۔ بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کو اپنا محاسبہ خود کرنا چاہیئے جب وہ اپنے کمزور پہلوؤں کا جائزہ لیں گے تو بہتری کی طرف توجہ دیں گے۔ ہم یہاں پر بیٹھ کر فتوئی صادر نہیں کر سکتے کہ وہ کیا کریں۔ انہیں اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تمام اصناف ادب پر توجہ دینی چاہیئے۔ یہ کوششیں انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں ممکن ہیں۔ اگر ہر تخلیق کار بہتری کا متلاشی ہوگا تو وہ نئے راستوں پر گامزن ہوگا اور معیاری ادب تخلیق کرے گا۔ مسابقت کا جذبہ اور اجتماعی فیصلے بھی زبان وادب کی خدمت میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر وحید عزیز (لاہور)

یہ امر انتہائی مسرت انگیز ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''اردو شعر وادب کے سفیر'' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب تخلیق کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ وہ ایک طویل عرصے سے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ موضوع نادر بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ پہلی مرتبہ بیرون ملک مقیم شاعروں اور ادیبوں کو حقیقی معنوں میں خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ہمدرد نقاد ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں جہاں بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کی پذیرائی کی ہے وہاں ان کے معاملات پر سخت گرفت بھی کی ہے۔ میرے خیال میں یہ نادر کتاب اردو شعر وادب کی تاریخ میں ایک نادر اضافہ ہوگی۔

'محبت' ایک ایسا اعلیٰ جذبہ ہے جس کی افادیت سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ کائنات کی تخلیق میں خدائے واحد کی محبت ہر شے کے وجود میں چھلکتی

نظر آ رہی ہے اور محبت ہی سے یہ دنیا سنوری سنوری اور نکھری نکھری نظر آتی ہے۔ چاند کا چمکنا محبت، سورج کا دمکنا محبت، ہوا کا چلنا محبت، تاروں کا جھرمٹ محبت، اشجار کے پات کا ہواؤں کی تھاپ پہ رقص کرنا محبت، سورج کی کرنوں سے کلی کا پھول بننا محبت، پھول کی خوشبو کا بلا امتیاز ہر سُو پھیلنا محبت غرضیکہ ہر شے اپنی اپنی ہستی کے مطابق محبت کو پھیلانے اور بڑھانے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ رشتوں کی محبت نے آدمی کو احساس کی دولت سے مالا مال کیا اور آدمی کو انسان کا عمدہ و شاندار لبادہ فراہم کیا جس نے اس کی قدر و منزلت کو اس حد تک بڑھا دیا کہ وہ فاصلے گھٹانے لگا۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے خاص طور پر اپنی زمین سے محبت، زمین سے محبت تو مثبت سوچ رکھنے والوں کے خون میں رچی بسی ہوتی ہے۔ شعر اور ادب میں یہ جذبہ ان کے اشعار اور تحریروں میں چھلکتا نظر آتا ہے اس لئے کہ شاعر ہو یا ادیب وہ محبتوں کا امین ہوتا ہے اور حساس جذبوں سے سرشار ہوتا ہے بغیر حساس جذبوں کے تخلیق میں حقیقت کا رنگ نظر آ ہی نہیں سکتا، اپنی مٹی، اپنی زمین، اپنے وطن سے محبت ایک مقدس جذبہ ہے، ایک پاک تصور ہے، ایک اعلیٰ فریضہ ہے ایک عمدہ مثال ہے جب اس نوعیت کے خیالات جمع ہوتے ہیں جو محبتوں، چاہتوں سے لبریز ہوتے ہیں اور تصور میں وطن عزیز کی عظمت و محبت ہوتی ہے تو پھر سید وحید الحسن ہاشمی کے اس شعر سے جذبات ہر دل میں جاگنے لگتے ہیں۔

ہیچ ہر رنگ ہے اس رنگِ چمن کے بدلے
ہم تو جنت بھی نہ لیں اپنے وطن کے بدلے

وطن سے محبت کے اثرات انسان کی سوچ کو مزید پختگی اور عمدگی بخشتے ہیں بلاشبہ آدمی ادھورا سا نظر آتا ہے وطن کی محبت کے بغیر۔ یہ ایسی محبت ہے جو تعمیر کی علامت ہے۔ بلندیوں کا پیغام ہے۔ ازل ہی سے اپنی زمین اپنی مٹی سے محبت کا رجحان تخلیقی کاموں میں نمایاں رہا ہے۔ ادب کو کسی بھی رخ سے کسی بھی زاویے سے دیکھیں خواہ وہ دو صدیاں پہلے کا

شاعر و ادیب ہو یا آج کا اس کے تخلیقی عمل میں وطن سے محبت نمایاں نظر آئے گی۔ وطن عزیز کے وجود میں آنے سے پہلے بھی جب تحریک پاکستان عروج پر تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ تحریک کا آغاز ہوا تھا شعرا اور ادباء کا کردار اُس کٹھن و دشوار وقت میں بھی بہت ہی اہمیت کا حامل تھا اسی لئے ہمارے معاشرے میں آج بھی ادب کی افادیت سے کوئی باشعور انسان انکار نہیں کرسکتا اُس کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ پاکستان کا تصور ہی ایک ایسے انسان نے پیش کیا جو ایک سچا تخلیق کار تھا میری مراد حکیم الامت ڈاکٹر علامہ اقبالؒ سے ہے۔ اس تصور میں کسی سائنسی فارمولے کا کردار نہیں تھا کسی سائنس دان کا تجربہ شامل نہیں تھا بلکہ ایک سچے تخلیق کار کے افکار نے ایک علیحدہ ریاست کے قیام کا تصور دیا اس لئے کہ اس کے حساس جذبے اُسے اپنے لوگوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف اکسا رہے تھے اور یہ درس دے رہے تھے کہ تجھے ان کیلئے کچھ ایسا سامان تیار کرنا ہے جو ہمیشہ کیلئے ان کے واسطے سکھ و چین کی علامت بن جائے ان تمام باتوں سے یہ بات تو واضح ہے کہ شعر و ادب کی افادیت سے کم از کم معاشرے اور وطن عزیز کی آزاد فضاؤں کی رونقوں سے کوئی بھی منکر نہیں ہوسکتا اسی طرح ایک سچا تخلیق کار بھی وطن کی محبت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ وطن کی اہمیت و محبت کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب اس مٹی سے دور ہونے کا وقت آتا ہے پاکستان کو چھوڑ کر جانے والوں کے احساسات و جذبات بہت ہی عجیب ہوتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جذبات کو الفاظ بنا کر اوراق پر ڈھالنا اتنا سہل نہیں ہے اس لئے کہ آنکھوں کی اس نمی کو الفاظ میں کیسے سمویا جائے جو وطن سے دور جانے والوں کی نگاہ میں ٹھہری ہوتی ہے۔ بہانے بہانے سے پلٹ کر وطن کے مناظر کو دیکھنا بلاشبہ ایک بہت ہی عجیب منظر ہے اور یہ وہی جانتا ہے جس پر گزری ہو اس لئے کہ درد کا احساس اسے ہی ہوتا ہے جو کرب سے گزرا ہو، تڑپا ہو، اُسے آنے والے ہجر کے پل ستا رہے ہوتے ہیں بقول محسن نقوی کے

جہاں تو ہوگا نہ تیری یادوں کے قدم ہوں گے
ڈرا رہے ہیں وہی مرحلے سفر کے مجھے

وطن سے دور رہنے والوں کو وطن کی یاد ہر پل، ہر لمحہ ستاتی ہے اور ان کے جذبات واحساسات بھی کچھ مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں وہ وطن سے دور رہ کر بھی اسے ہر لمحے دل میں سجائے ہوئے پھرتے ہیں اور ویران دل کو یادِ وطن سے رونق بخشنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ وطن کی فضاؤں، ہواؤں کو اپنی سانسوں میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہی وہ احساس ہے جو سچے جذبات کو جنم دیتا ہے اور پھر جذبات کے رنگ میں ڈھل کر جو تخلیق سامنے آتی ہے تو وہ پڑھنے والوں کو بھی شاعر، ادیب کے اُن جذبات واحساسات سے مکمل آگاہی فراہم کرتی ہے۔ تلاش روزگار میں وطن کو چھوڑ کر جانے والے شب و روز یادِ وطن میں جلتے ہیں اور اس آگ میں جلنے کے بعد حب الوطنی سے بھرپور اشعار منظر عام پر لاتے ہیں وطن سے دوری، وطن کی تہذیب وثقافت، زبان وادب سے والہانہ محبت کو جنم دیتی ہے اور اس محبت کا اظہار شاعروں اور ادیبوں کی تخلیق میں واضح نظر آتا ہے۔ ہجر شاعری کو پختگی بخشتا ہے اس لیے کہ وصل خمار ہے، اور خمار میں زیادہ تر قربت کے احساس کو شوخ رنگ میں بیان کیا جاتا ہے مگر ہجر ایک ایسی آگ ہے جو شاعر اور ادیب کو ایسی تخلیقات کرنے پر مجبور کرتا جو پختہ خیالات واحساسات سے بھرپور ہوتی ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب اپنے وطن سے دور ایک تخلیق کار تنہا کھڑا ہوتا ہے تو اس کی سوچ کچھ اس طرح اجنبی فضاؤں میں بھٹکتی ہے۔

کوئی دوست ہے نہ رقیب ہے
تیرا شہر کتنا عجیب ہے
وہ جو عشق تھا وہ جنون تھا
یہ جو ہجر ہے، یہ نصیب ہے
میں کیسے کہوں میرے ساتھ چل
یہاں سب کے سر پہ صلیب ہے
یہاں کس کا چہرہ پڑھا کروں
یہاں کون اتنا قریب ہے

یہ تنہائی، یہ جدائی، یہ ہجر وطن عزیز کی تہذیب وثقافت کو فروغ دینے پر اسے اکساتا ہے وہ اپنی زبان میں اپنے جذبات کو بیان کرنا چاہتا ہے اپنی تخلیق کو منظر عام پر لانے کیلئے بے چین ہو کر کچھ ایسا تخلیق کرتا ہے جس سے صرف وطن کی زبان ہی کو فروغ نصیب نہیں ہوتا بلکہ ادب کو بھی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ ایک عام فہم بات ہے کہ کوئی بھی کام اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کام میں، اس کی تکمیل میں محبت ولگن مکمل توانائی اور سچائی کے ساتھ صرف نہ ہوں۔ یہ بات قابل تحسین ہے کہ وطن عزیز سے دور بسنے والے ادیب، شاعر اپنی تخلیقات میں وطن سے والہانہ محبت کا اظہار کر رہے ہیں اور صحیح معنوں میں وطن کی تہذیب وثقافت کو بیرون ملک بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

وطن عزیز کو، اس کی تہذیب وثقافت، زبان وادب کو بیرون ملک متعارف کروانے والے اور ادب کو ترقی دینے والے شعرا اور ادبا بلاشبہ وطن عزیز کے سفیر ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ خاص اہمیت کے حامل ہیں تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ دیارِ غیر میں وطن عزیز کے حسین رنگوں کو تقویت بخشنا وہاں کے مقامی لوگوں کو اپنے وطن کے رنگ و نظاروں کے متعلق بتانا یقیناً یہ بڑے عمل ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اہم لوگ اس طرح فروغ ادب کیلئے کوششیں نہ کرتے تو ہمارا ادب سرحدوں کے اندر ہی گھٹ گھٹ کر دم توڑ جاتا۔

آج اس آفت زدہ ودہشت زدہ دور میں جب زندگی سے زیادہ موت قریب نظر آتی ہے۔ جب امن ایک ناپیدی شے لگتی ہے۔ جب معاشی جنگ تہذیب وثقافت کو نگل رہی ہے۔ جب طاقتور کمزور کو دبانا اپنا ازلی حق سمجھ کر اسے روندنے میں کوشاں ہے، جب دوستی کی بنیاد مفاد پرستی پر ہے، جب ساتھ چلنے والے ہی دھوکہ باز ہیں، جب راہبر ہی راہزن ہیں، جب قاتل معتبر ہے، جب شرافت برہنہ ہے، جب طاقت سے ہر شے کو مسلنے کی رسم عروج پہ ہے، جب مذہب کے نام پر نام نہاد علماء دوکان داری میں مصروف ہیں اور اپنی جیبوں کو وطن عزیز کے دشمنوں سے ملنے والی رقوم سے بھرنے میں مصروف ہیں ایسے

عالم میں بھی شعرا اور ادبا اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں اپنے قلم کے زور سے بارود کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ جہاد فی العلم میں مصروف یہ اصل مجاہد وطن عزیز کے حقیقی سفیر ہیں جو محبت کا پرچم اٹھائے ہوئے، چاہت کا دیپ جلائے ہوئے، اپنائیت کا نعرہ لگاتے ہوئے دیارِ غیر میں محبتوں کی ہواؤں کو تندہی بخشنے میں شب و روز مصروف عمل ہیں۔ اصل میں تخلیق کا مقصد حالاتِ حاضرہ کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ اس کا دل محبت و چاہت کے سائے میں ڈھونڈنے پر زور دینا بھی ہے۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ شعرا اور ادبا نے تاریخ میں ہمیشہ ہی سے اہم ترین کردار ادا کیا ہے اگر تخلیق کار مثبت سوچ کے حامل ہوں تو بلاشبہ جو ادب تخلیق ہوتا ہے وہ صرف اس ملک ہی کیلئے مفید نہیں ہوتا بلکہ دنیا کیلئے بھی محبت و یگانگت کا پیغام ہوتا ہے، فاصلے مٹانے کا درس دیتا ہے۔ بہت ہی مشہور مقولہ ہے کہ زندگی چار دن کی ہے بقول بہادر شاہ ظفر

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

عمر تو اب بھی چار دن ہی ہے بلکہ پہلے سے بھی کچھ کم لگتی ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ نفرت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی و ترویج سے فاصلے تو سمٹے ہیں مگر دلوں میں فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ تیز رفتاری کے چکر میں اور حرص و ہوس نے سب کچھ تبدیل کر دیا ہے ایسے مایوسی کے عالم میں صرف اور صرف ادب ہی ہے جو دنیا میں محبتوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ وطن سے محبت، اپنی مٹی سے پیار ازل ہی سے انسان کی فطرت کے اندر رچا بسا ہے وہ کہیں بھی رہے کہیں بھی جائے اسے اپنی مٹی کی خوشبو ستاتی ہے یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنی ہی مٹی میں ابدی نیند سونے کو ترجیح دیتا ہے اس کی مثال بہادر شاہ ظفر کے شعر سے ملتی ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کیلئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ہمارے سفیر، ہمارے بیرون ممالک میں مقیم تخلیق کار بھی بلاشبہ اس مٹی سے بے حد انسیت ومحبت رکھتے ہیں۔ وہ کہیں بھی، کسی بھی حال میں اپنے وطن کی خوشبو کو فراموش نہیں کرتے ان کی تخلیقات میں وطن سے دور بسنے کا دکھ بھی نظر آتا ہے اور وطن کی فضاؤں، ہواؤں کا احساس بھی موجود ہے۔

ادب کی زبوں حالی کا اثر بیرون ملک مقیم ہمارے ادبی سفر پر بھی ہوا ہے۔ آج تیز رفتاری نے اور انٹرنیٹ کی ترقی وترویج نے ادب کو معاشرے سے کاٹ پھینکنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے پرنٹ میڈیا ایک ٹھوس اہمیت کا حامل ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ اب لوگ پڑھنا نہیں چاہتے بلکہ دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ بھی نہ سمجھ آنے والی موسیقی جو بے ترتیب دھنیں سنواری ہے جبکہ ان تمام ادبا، شعرا کی قدر ہونی چاہئے جو کسی نہ کسی طرح وطن عزیز کی عزت وتکریم کے اضافے میں مصروف ہیں اور خاص طور پر ان شعرا اور ادباء کی قدر و پذیرائی ہونی چاہیے جو بیرون ملک وطن عزیز کی تہذیب وثقافت کو فروغ دینے میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مصروف ہیں۔ اگر انگریزی ادب کی بات کریں تو دیکھیے اس سوسائٹی میں آج بھی شیکسپیئر اور ولیم ورڈز ورتھ کی تخلیقات کو نئی نسل تک مکمل صحت سے پہنچایا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی نئی نسل ادب سے واقفیت حاصل کررہی ہے مگر ہمارے ہاں تخلیق کاروں کو یکسر فراموش کردیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ نئی نسل شعروادب سے دور اور ڈرگز و بے ہودگی کے نزدیک ہورہی ہے۔ ادب کسی بھی دور کا ہو کسی بھی سوسائٹی کا ہو اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو شعور دینا اور امن وامان کا درس دینا ہے۔ فروغ امن ومحبت کیلئے بھی ہمیں اپنے مقامی ادبا اور شعرا کو بھی اعلیٰ مقام دینا چاہیے اور بیرون ملک کے تخلیق کار جو ہمارے ملک کے سفیر بھی ہیں ان کی بھی قدر کرنی چاہئے۔ مادہ پرستی اور مردہ پرستی سے ہٹ

کر زندہ تخلیق کار کو اس کی زندگی ہی میں خراج تحسین پیش کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے اس کیلئے لازم ہے کہ قلوب واذہان کو حسد جیسی مہلک بیماری سے پاک کرنا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ تخلیق کاروں کو بھی چاہیے کہ وہ اس معیار کی تخلیقات منظر عام پر لائیں جو بین الاقوامی ادب کے معیار پر پوری اترتی ہوں تا کہ ہمارا ادب عالمی ادب کے مقابلے پر مکمل توانائی کے ساتھ ٹھہر سکے آج کے شعرا کہتے کم ہیں جوڑتے زیادہ ہیں 'جوڑنے' سے میری مراد یہ ہے کہ کچھ دائیں سے لیا، کچھ بائیں سے یوں غزل یا نظم وجود میں آ گئی اور جب تخلیق سوچ سے وجود میں نہیں آئے گی تو اس میں فکری رنگ بھی نہیں آئے گا۔ فکری رنگ کیلئے خالص اپنی تخلیق کا ہونا لازم ہے اور حالاتِ حاضرہ کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اگر ادب کو بچانا ہے اور عالمی سطح کے ادب سے اس کا موازنہ کرنا ہے تو پھر تخلیق میں پختگی اور سوچ میں پختہ خیالات کا ہونا بے حد ضروری ہے اور یہ ہی توقع ہمیں اپنے ان تخلیق کاروں سے بھی ہے جو بیرون ملک وطن عزیز کے ادبی سفیروں کی حیثیت سے نمائندگی کر رہے ہیں ان کی پختہ تخلیق بلاشبہ وطن عزیز کے ادب کی مضبوطی کیلئے بے حد اہم اور ضروری ہے۔ خدا کرے کہ ہمارا ادب عالمی سطح پر پختہ رنگ میں جانا اور پہچانا جائے اور ادباء شعرا کو وہ مقام حاصل ہو جائے جس کے وہ حقیقت میں اہل ہیں۔

پروفیسر نزہت عباسی (کراچی)

سوال ۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب ۔ شاعر و ادیب بیرون ملک اپنے ملک کے سفیر ہوتے ہیں۔ ان کی ہر تخلیق نظم ہو یا نثر نہ صرف ان کی پہچان بلکہ وطن کی شناخت کا بھی حوالہ بن جاتی ہے۔

پاکستان سے باہر جہاں بھی پاکستانیوں نے بستیاں آباد کی ہیں وہاں اپنی

بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پاکستان سے محبت، اردو زبان و ادب کا فروغ، عالمی سطح پر یک جہتی اور مسائل کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

متحدہ عرب امارات، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، جاپان، جرمن، آسٹریلیا وغیرہ میں رہائش پذیر پاکستانیوں نے شعروادب کی ترویج کے لیے متعدد ادبی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں جو بلاشبہ ادب کے فروغ کا ذریعہ بن رہی ہیں۔

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب ۔ میرا خیال ہے کہ انسان اپنے گھر سے دور ہو تو گھر زیادہ یاد آتا ہے اس کی قدر محسوس ہوتی ہے۔ یہی صورتحال بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کو بھی پیش آتی ہے۔ وہاں جا کر اپنے وطن سے محبت کا احساس زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک میں مقیم شاعر و ادیب کی تخلیقات میں وطن کی محبت کے کئی رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔

سوال ۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ بہتر ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے دور رہنے کے باوجود اپنی زبان و ادب کو نہیں بھولے بلکہ اس کی ترقی و ترویج میں مصروف ہیں۔ شاعر اور ادیب بہترین صلاحیتوں کا استعمال کر رہے ہیں اور ان کی تخلیقات میں متنوع موضوعات نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر وہاں کی زندگی اس کے مسائل ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

سوال ۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب ۔ کسی حد تک انہیں مزید اپنے تخلیقی کاموں کی بہتری کے لیے

کوشش کرنی چاہیے۔

سوال ۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب ۔ ان تخلیق کاروں کو زبان و ادب میں ہونیوالی نئی نئی تبدیلیوں سے آگاہی ضروری ہے۔ پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادب سے واقفیت ہونی چاہیے۔ عصری حالات سے بھی شناسائی ضروری ہے اور بیرون ملک دیگر زبانوں میں ہونے والی ادبی تخلیقات سے بھی استفادے کی ضرورت ہے۔

محمد اقبال شاہ (میانوالی)

انسانی تہذیبی ارتقا کے عمل میں سیر و سیاحت، تجارت اور جنگوں کا اہم کردار رہا ہے۔ زمانہ قدیم میں سیاح، تاجر اور جنگجو دور دراز ممالک کی خاک چھان کر جب اپنے گھر لوٹتے اور اپنے سروں سے ساز و سامان کی گٹھڑیاں اتار رہے ہوتے تو اُن بھاری اشیا کے ساتھ کچھ غیر مادی سامان جس میں علم و ادب، فلسفہ، فنون لطیفہ، فنِ تعمیرات، تجربات، مشاہدات، تجزیات اور تجریدات کی ترغیبات بھی اُن کی گٹھڑیوں سے برآمد ہوتے۔ بھاری سامان تو چند دنوں میں مہنگے داموں فروخت ہو جاتا لیکن لطیف وزن کا حامل یہ غیر مادی سامان اُن کے مزاج، کردار اور تہذیب و تمدن پر گہرے نقوش مرتب کرتے ہوئے اصول حیثیت حاصل کر لیتا تھا۔

وطن سے دُور رہنے کی وجہ گردشِ روزگار، کاروبار، سیر و سیاحت، نامساعد حالات، مذہبی یا سیاسی پناہ کے علاوہ جبری ہجرت بھی ہو سکتی ہے۔ خاکِ وطن سے دُوری کی بنا پر پیدا ہونے والے احساسات کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جو عملاً اِن مراحل سے گزرا ہو۔ اپنے گھر کی دہلیز چھوڑنے سے پہلے ہی مسافر کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ عربی کا معروف شاعر ابنِ دراج اُندلسی سفر پر روانہ ہوئے وقت جب اہلِ خانہ کو الوداع کہتے ہوئے دیکھتا ہے کہ

اُس کا شیر خوار بچہ مضطرب انداز میں مسلسل اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔
بچے کے ان جذبات کی جس خوبصورت انداز میں شاعر عکاسی کرتا ہے اُس کا وہ اظہار آج بھی اپنے گھر کی دہلیز چھوڑنے والے مسافر کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے:

عربی سے ترجمہ: (وہ بات کا جواب دینے سے تو عاجز ہے مگر اُس کی آنکھیں اُن اداؤں سے واقف ہیں جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں)۔

زبانوں کی قدامت کا اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے لیکن الفاظ کی تاریخ اتنی پرانی ہے کہ انسانی عقل اُس کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ایک لفظ کب اور کیسے سمندر پار کرکے دوسرے براعظم میں جانکلا، اُس نے کتنی زبانوں کو مستفید کیا اور اُس کی ادائیگی یا تلفظ جو اُس کا بنیادی لباس تھا اُس پر مقامی لب ولہجہ اور جغرافیائی تبدیلی نے کیا اثرات مرتب کیے؟ دریافت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین کام ہے۔

سفیرانِ اُردو شعروادب غیر ممالک میں عارضی یا مستقل قیام کے دوران نہ صرف تعلیمی اور معاشی استحکام حاصل کرتے ہیں بلکہ اُردو زبان کو بھی تازہ خون مہیا کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ یہ عمل شعوری اور لاشعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ کوئی بھی ترقی یافتہ زبان زمانہ حال کی ترجمانی کا تو کسی حد تک مکمل دعویٰ کرسکتی ہے لیکن مستقبل کی ضروریات سے نمٹنے کا سامان اُسے حاصل کرنا ہی پڑتا ہے۔ ثقافتی، تہذیبی، سماجی اور تمدنی تبدیلیاں سینکڑوں الفاظ کو متروک کردیتی ہیں اور نئے الفاظ کو رواج دیتی ہیں۔ دیگر زبانوں کے الفاظ جذب کرنا ایک زندہ زبان کا مثبت پہلو ہے۔ الفاظ کا ارتقائی سفر تغیر و تبدل کے عمل سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

سفیرانِ ادب دیگر ممالک میں نہ صرف شعروادب کی خدمت کررہے ہیں بلکہ وہ اُردو زبان کی ترویج کی ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔ اُردو زبان کے اس تدریجی سفر اور ترقی کو زمانہ حال میں ماپا تو نہیں جاسکتا لیکن محسوس کیا جاسکتا ہے۔

بیرون ملک مقیم شاعر، ادیب، فنکار اور عام آدمی کو دیگر اقوام کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا ہوتا ہے اس لیے اُس کے کردار میں رواداری کا عنصر فروغ پاتا ہے۔ وہ مذہبی، لسانی، نسلی اور علاقائی بنیادوں پر انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کرتا۔ ایسے عالمگیر انسانی اقدار کا پرتو جہاں اُس کے کردار کا حصہ بنتا ہے وہاں وہ اُس کے ادبی شہ پاروں سے بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا شعروادب مجموعی طور پر مروجہ منطقی علوم اور موجودہ ثقافت کی شاہراہ پر برابر سفر کر رہا ہے، یا ان دونوں سے کتنا آگے یا پیچھے ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے کہ تینوں برابر صف میں قدم بہ قدم چلتے رہیں۔ اگر شعروادب سائنس سے بھی دو قدم آگے دکھائی دے تو یہ ترقی کی علامت ہوگی کیونکہ سائنس کو خام مال تو خیال ہی مہیا کرتا ہے جو ادب کا بنیادی عنصر ہے۔ ماضی میں شعروادب منطقی علوم سے بہت آگے رہا ہے۔ دیو مالائی کہانیاں محض محظوظ کرنے یا ہونے کی خاطر تخلیق نہیں کی گئی تھیں۔ اُن کے پس منظر میں انسان خود جن، بھوت اور راکشس کی قوت اور رفتار سے سفر کرنا چاہتا تھا۔ ان کہانیوں کی تخلیق نے انسان کو خیالاتی تیز رفتاری کے سفر سے لطف اندوز بھی کیا۔ انسان کے ایسے مربوط ادبی خیالات کو سائنس نے صرف عملی جامہ ہی نہیں پہنایا بلکہ وہ اُن سے بہت آگے سفر کرنے لگی ہے۔

قدامت پسند ادبی حلقے آج بھی اپنے ماضی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کی تشبیہات اور استعارات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے محبوب کی آنکھوں کو تیر، تلوار اور دشنہ (خنجر) سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگرچہ انہیں معلوم بھی ہے کہ ماضی میں بادشاہت کو قائم دائم رکھنے کے لیے یہ رزمیہ ترغیبات شعروادب میں جلوہ گر ہوئی تھیں۔ آج ہمیں جنگوں کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو یہ ہتھیار متروک ہو چکے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے چاہنے والوں کی آنکھوں میں امن و آشتی، بھائی چارا اور

رواداری تلاش کریں۔

بیرون ملک مقیم شاعروادیب اپنے وطن کی مٹی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اُسے چاہیے کہ تعصب، فرقہ واریت، مذہبی جنون، طبقاتی امتیازات، جمہوریت دشمنی اور فوجی حکومت کے قیام کے تائیدی رجحانات جیسے جن ناسوروں نے وطنِ عزیز کے سینے میں گھر بنا رکھا ہے وہ اپنے قلم کی نوک سے ایسے سرطانوں کو کاٹنے کی سعی کریں۔

دوسری اہم بات یہ کہ سفیرانِ قلم میں نوجوانوں کے علاوہ سینئر شعراوادبا بھی دیارِ غیر میں اپنی زندگی کی بہاریں گزار رہے ہیں۔ انہوں نے ادبی تنظیموں کا قیام بھی عمل میں لایا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک رجحان ساز فضا پیدا کرنے میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں۔ اُن کے طاقت ور قلم ہمارے بے ہنگم ہجوم کو ایک قوم کی شناخت وتشخص عطا کر سکتے ہیں۔ وہ جہاں دریائے ادب کو جدت کے رُخ پر بہانے کی سعی کریں وہاں ادبی شاہراہ کو زندگی کی روشوں سے ہمکنار کر دیں۔ اس نئے سفر میں اُنھیں اجنبیت کا احساس تو ضرور ہوگا لیکن جلد ہی اُن کا احسن عمل انفرادی حیثیت حاصل کر کے قابلِ تقلید قرار پائے گا۔

اُردو شعروادب کے سفیروں کے لیے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سفیرانِ ادب تم پر عیاں ہے یہ حقیقت بھی
کہ فردوسِ بریں اپنی کے اِک تاریک گوشے میں

تعصب کا دھواں دیتے کئی آتش فشاں جو تھے
غضب بن کر وہ تاریکی میں ہم پر آن ٹوٹے ہیں

وہ سیلِ تند جو بادِ سمومی کو بھی شرمائے
ہماری سوچ کا ہر زاویہ مسموم کر دے گا

گزر جاتا ہے لاوا تو جواں جسموں کو جھلسا کر
فضا سے دیر تک ذروں کی صورت راکھ گرتی ہے

کفن کی بھی ضرورت ایسے مردوں کو نہیں پڑتی
یہ خاکستر یہی بھوبل انہیں پھر دفن کرتی ہے

مری آواز گر تم راکھ کے ڈھیروں سے سُن پاؤ
جواں شعلوں کی جِدت کا تمہیں اندازہ ہو جائے

تشدد کرنے والوں سے بھی زیادہ ہم بھیانک ہیں
جو اِس دہشت کدے میں خون سے خاموش بیٹھے ہیں

وہی خاک جواں جس نے بہت سے روپ دھارے تھے
وہی خاکِ وطن جو اَب امانت میری صورت ہے

وہی خاکِ وطن جس سے عبارت آپ کی ہستی
ہے اب اُس خاک کے معدوم ہونے کا بھی اندیشہ

سفیرانِ قلم تم اپنی پاکیزہ سیاہی سے
کتابِ امن کے صفحات پہ وہ نقش پھیلاؤ

صبا کے ہاتھ جو پھولوں کی اِک تازہ مہک بن کر
وہی پھر نکہتِ جاں میرے گلشن میں بکھر جائے

پروفیسر قدرت اللہ شہزاد (بہاولپور۔پاکستان)

۱۔ یقیناً دیارِ غیر میں قلم کار شعروادب کی ترویج کے لئے اہم کردار ادا کر رہے ہیں وہ وہاں شعری محافل منعقد کرتے ہیں۔ برصغیر کے اہم شعراء کے اخراجات برداشت کر کے انہیں اپنے پاس بلوا کر سنتے ہیں۔ نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا میں انہوں نے مشاعرے کی روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اردو کے شعراء اور نثر نگاروں کی کتب شائع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ہاں کی نئی نسل میں اردو فہمی اور ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اردو کے معاشرے میں رہ رہے ہیں اس لئے ہمارے لئے کوئی مشکل بات نہیں۔ غیر زبان کی فضا میں اردو کا پرچم مسلسل لہرائے رکھنا نہایت دشوار کام ہے۔ مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید، یورپ اور ایشیائی ممالک سمیت ساری دنیا میں اردو کے تخلیق کار موجود ہیں جو اپنی بساط کے مطابق ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی مساعی قابلِ قدر ہیں۔ ان کی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے کام کا جائزہ لینا چاہیے۔

۲۔ وہ تمام تخلیق کار جن کا پاکستان سے تعلق ہے اور دنیا کے کسی خطے میں مقیم ہیں ان میں سے کسی بھی قلم کار کی تخلیقات اٹھا کر دیکھ لیں ان میں اپنے وطن کی سوندھی سوندھی مہکار ضرور ملے گی۔ شاید ہی کوئی بدبخت ایسا ہوگا جس کے ہاں کربِ وطن نہ ہوگا۔

۳۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ سب کا کام بہت اچھا ہوتا ہے یا سب کی تخلیقات غیر معیاری ہوتی ہیں۔ جب لکھا جائے گا تو اچھا برا سب کچھ سامنے آئے گا۔ کسی تخلیق کے اچھا یا برا ہونے کا اندازہ بعد میں ہوتا ہے۔ بیرونِ ممالک میں شعر پر

زیادہ توجہ دی گئی ہے اس لئے وہاں کی شاعری میں اعلیٰ پائے کا شعر بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ اوسط درجے کے اشعار کی تو بہتات ہے تاہم نظر انداز کی جانے والی شاعری بھی خوب ہو رہی ہے جو اگرچہ اردو کے لئے امرت دھارا نہیں ہے لیکن سم قاتل بھی نہیں ہے۔

۴۔ جی ہاں! میں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے کاموں سے مطمئن ہوں کیونکہ میں ان کے حالات کے تناظر میں دیکھتا ہوں اور ان کے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ وہ کچھ کر تو رہے ہیں۔ کچھ نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے۔ کسی کے کام میں کیڑے نکال کر زبان کی خدمت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ عمل نقصان پہنچانے کے مترادف ہوتا ہے۔

۵۔ بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کو اصنافِ نثر پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ افسانہ، ناول، انشائیہ، سفرنامہ، خودنوشت، شخصی خاکہ، تنقید سمیت سب ہی میدانوں میں طبع آزمائی کی جانی چاہیے اگرچہ وطن سے دور بعض تخلیق کاروں نے ان اصناف میں کچھ کام کیا ہے لیکن وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے اس کے علاوہ یہ کام یہاں تک بھرپور طریقے سے نہیں پہنچ سکا۔ خال خال لوگ اس سے واقف ہیں۔ کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ ان کے ٹھوس کام سے دیگر ہم وطن بھی فیض یاب ہوں۔

نعیم فاطمہ علوی (اسلام آباد)

بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں سے تحریری رابطہ ایک عام پاکستانی کے بس کی بات نہیں رہی۔ کمر توڑ مہنگائی اور پھر پاکستان کے دوسرے اداروں کی توڑ پھوڑ کے ساتھ ساتھ پوسٹ آفس کے زوال کی داستان بھی جڑی ہوئی ہے۔ اسے تجاہلِ عارفانہ

کہیں تساہل یا غفلت خطوط سپردِ ڈاک کریں تو کئی ہفتوں کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ تو سپردِ خاک یا سپردِ ردی کی ٹوکری ہو گئے لہٰذا تعلق یا رابطے کا سلسلہ ٹوٹ سا گیا ہے۔ کتاب پہنچے، پہنچانے یا خریدنے کا یارا نہیں رہا البتہ ایک مخصوص طبقے کا تعلق بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں سے البتہ ہے رابطے یا تعلق کا یہ ذریعہ انٹرنیٹ ہے۔ اسی لیے میں نے مخصوص طبقہ کہا کیونکہ انٹرنیٹ استعمال کرنا بہت سے لوگوں کو نہیں آتا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار جہاں بھی ہیں اُن میں سے بہت سارے لوگوں نے انٹرنیٹ کے استعمال کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ یہ اُن کی مجبوری تھی جو بعد میں اُن کا شوق اور ضرورت بن گئی۔ عزیزوں، دوستوں اور ہم خیال لوگوں سے رابطہ رکھنے کا اہم ذریعہ اب انٹرنیٹ ہی ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں...... اس کا ثبوت یہ ہے کہ انٹرنیٹ پر بے شمار ایسی سائٹس ہیں جن میں اہم قلم کار اپنی نگارشات بھیجتے ہیں۔ استادی شاگردی کا سلسلہ بھی چلتا ہے اور آپ کی نگارشات لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ الاقربا میگزین دیکھیے جو کہ انٹرنیٹ پر آنے کی وجہ سے انٹرنیشنل میگزین بن چکا ہے بے شمار ملکوں میں پڑھا جانے والا یہ رسالہ کس طرح لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے۔ لوگ اسے پڑھتے، سراہتے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اچھا اور معیاری ادب کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ ہمیں ادب کے ارتقائی مراحل سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اس ارتقاء کا حصہ بن کر نئے تقاضوں کو نبھانا چاہیے۔

جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے دنیا کے کسی بھی کونے میں جب چند پاکستانی اکٹھے ہوتے ہیں اُن کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ اپنے وطن کی خوشبو کی مہک دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ دل میں رچی بسی یہ خوشبو لکھنے والوں کی تحریروں میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

ان تخلیق کاروں کا معیار وہی ہے جو اپنے ملک میں ہے جہاں تک احساس کی بات ہے۔ وطن سے دور رہنے والوں کے احساس میں وطن میں رہنے والوں کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ وطن سے محبت کی کسک اہلِ وطن کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہم خیال لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔

جہاں تک آخری دو سوالوں کا ذکر ہے۔ تخلیق کار نہ تو خود اپنی تخلیق سے مطمئن ہوتا ہے اور نہ ہی اُسے پڑھنے والے مطمئن ہوتے ہیں۔ "do more" کا تقاضا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میرا اطمینان مضطرب ہے وہ اس لیے کہ جہاں تک اُس نسل کا تعلق ہے جن کا کچھ عرصہ پاکستان میں گزرا یا جو کچھ عرصہ پاکستان میں رہے وہ تو پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی محبت کے گیت گاتے ہیں۔ اور محبت کے سب تقاضے نبھاتے ہیں مگر انہی کی اپنی نسل ان روایات کی پاسدار نہیں ہے۔ وہ لوگ چند ادیبوں، شاعروں سے تو واقف ہیں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اُن کا کام ٹیلی ویژن پر یا گلوکاروں کی آواز بن کر لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ مگر بے شمار کام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ ادب کے احترام کے تقاضے نبھائیں۔ محبت کی سولی چڑھیں اور پیار سے رشتہ باندھیں۔ اگر ہم اپنا کام اگلی نسل تک نہ پہنچا سکے یا ہم نے اِس کی ترویج اور ترسیل کا کام مایوس ہو کر چھوڑ دیا تو ادب کے ساتھ ساتھ بہت کچھ ہم سے روٹھ جائے گا...... کچھ دن پہلے میری ملاقات بیرون ملک سے آئی ایک معلمہ، ادیبہ اور شاعرہ سے ہوئی۔ میں نے یہی سوال اُن سے کئے تو انہوں نے بھی مایوسی کا اظہار کیا۔ وہ خود تو بہت کام کر رہی تھیں مگر اگلی نسل میں منتقلی اور اُن کی دلچسپی کے بارے میں پُر اُمید نہ تھیں۔ بہرحال مایوسی تو کفر ہے...... دنیا کا اصول ہے کہ یہاں کوئی چیز ختم ہوتی ہے تو اُسی کی کوکھ سے نئی اور تروتازہ چیز جنم لے لیتی ہے۔ اہلِ فکر اور اہلِ علم جہاں بھی ہوں انہیں ایک زنجیر کی طرح رابطے میں رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی بجائے ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ انٹرنیٹ کو سیکھنا چاہیے

تاکہ رابطے اور تعلق میں آسانی ہو اور جو لوگ رابطے اور تعلق کی کوششوں میں مصروف ہوں ہمیں اُن کی مدد کرنی چاہیے۔

پروفیسر عظمت رباب (لاہور)

یہ عجیب وجودیاتی حادثہ ہے کہ مسلم دانش ہمیشہ ہجرت میں رہی ہے۔ اسے مقدر کہیے، حالاتِ روزگار کہیے، وجود کا المیہ یا انقلابات۔ اسلامی دانش وری کی مخصوص خصوصیت یہ ہے کہ ہجرت اس کا ایک لازمی حصہ رہا ہے وہ مکہ ومدینہ ہو، دمشق وشام ہو یا بلخ و بخارا ہو، شیراز واصفہان ہو یا لاہور ودلی، یہ دانش ور ہمیشہ ہجرت کے عالم میں رہے ہیں۔ اس طرح ہجرت اصل میں دانش ورانہ سوچ کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی گئے تلاشِ روزگار ہو، تلاشِ فکر ہو، تلاشِ ہنر ہو یا تلاشِ حق ہو، اپنے پس منظر کی دانش مندانہ بنیادیں، اقدار اور روحانیات کو ساتھ لے کر گئے۔ سب سے بڑی مثال ہندوستان میں فارسی اور عربی علوم، تصورات و اقدار کی بازیافت ہے اور یہاں تک کہ پورے ہندوستان میں ایک ایسا تہذیب وتمدن وجود میں آیا جسے گنگا جمنی اور دیگر ناموں سے پکارا گیا۔ اس کی جڑیں ایران، اصفہان، شیراز، بخارا، سمرقند، دمشق اور بغداد میں تھیں لیکن پھل، پھول اور برگ وبار ہندوستان میں آئے۔ برصغیر میں مسلم تہذیب وتمدن، فنون، علوم اور شعروادب پروان چڑھے۔ اردو شاعری کی بحریں، اوزان، تصورات، شعری نظام، جذباتی احساساتی بنیادیں، فنی اقدار سب کی سب یہاں تک کہ اسمائے رجال ہوں، پرندے، درخت اور پھول ہوں، بلبل وگل ہوں، سمرقند ہو ماوند ہو، دجلہ وفرات ہوں، وہ غزنوی ہو یا حسن وحسین سب اسی ہجرت کے تصور کا شاہ کار ہیں۔

جدید عہد میں نیا دور شروع ہوا جب ہندوپاک سے لوگ اپنی تہذیبی اقدار وپس منظر کو ساتھ لے کر تلاشِ روزگار میں بیرونِ ملک گئے۔ وہاں انھیں دنیاوی آسائشیں اور

روزگار کے مواقع اور علم و ہنر تو میسر آئے لیکن جذباتی تسکین، تہذیبی شناخت، دانش ورانہ اقدار کی بازیافت، تہذیبی فضا اور اپنے تمدن کی بازگشت انہیں نئی دنیاؤں میں نہیں مل سکتی تھی اس لحاظ سے یہ دنیائیں بانجھ تھیں۔ اس لیے انہوں نے وہاں پر اپنے وطن کی تہذیب اور دانش کے بیج بوئے اور ثمر کاشت کیے۔ وہ اپنی ہنر مندانہ تہذیبی فنی، شناخت کے لیے اپنے وطن ہی کے پابند و مرہون ہیں۔

جو لوگ بیرونِ ملک گئے وہ اپنے شعبے کے منتخب لوگ تھے۔ جوہر قابل جو اپنے اپنے میدان میں ماہر تھے۔ ان میں جرأتِ عمل اور نئی ان دیکھی مشکلات کو حل کرنے کی خواہش تھی۔ انھوں نے پردیس میں گھر بنائے، غربت اور پس ماندگی کے کوہ بے ستون کو کاٹ کر خوش حالی کی جوئے شیر نکالی۔ زندگی کا ظاہر تو سنور گیا لیکن باطن کے لیے کیا کریں۔ سکونِ قلب کے لیے اپنی تہذیب کی کششِ ثقل نے ان کو پردیس میں وطن کی تخلیق پر آمادہ کیا۔ ان کے ہاں چونکہ دانش ورانہ سطح پر فنی اظہار کی خواہش تھی تو پھر اس کا اظہار مختلف فنون میں ہوا ہے وہ وہاں انجمنیں قائم کرتے ہیں، اپنے وطن سے رابطہ رکھتے ہیں۔ شعرا اور ادیبوں کو وہاں مدعو کرتے ہیں اور مشاعروں اور محافل کا انعقاد کراتے ہیں۔ یوں وہ اپنے وطن اور انجمنوں سے ہم آہنگی کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ پردیس میں تنہائی، دوری اور غربت کی شدت کم ہو سکے۔ یوں وطن کے ادیبوں سے Interaction ہوتا ہے۔ اس طرح عالمی سطح پر تانابانا بن گیا ہے۔ یہ سب اردو ادب کے لیے ایک نیا عمل ہے۔

بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کی تخلیقات میں وطن کا حوالہ دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک تو شاعری میں وطن سے براہ راست محبت کا اظہار اور دوسرے اپنے وطن کی زبان اردو میں تخلیقات کے ذریعے جن میں تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جہاں مقامی ادیبوں کی شناخت کا بیڑا اٹھایا ہے وہاں وہ اس حوالے سے بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ماہنامہ شام و سحر کے 'سفیرانِ شعر و ادب نمبر' دسمبر ۲۰۰۹ء، جلد ۳۳، شمارہ ۱۲

میں ایسی تخلیقات اور تخلیق کاروں کا تجزیہ و تعارف پیش کیا ہے جو دوسرے ممالک میں پاکستانی زبان وادب اور تہذیب و تمدن کے سفیر ہیں۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی اپنے ہجرت کے کرب اور تجربات کو شعری تخلیقات میں سمو کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنے جذبات کے تزکیہ کا موقع ملتا ہے وہیں اردو زبان وادب کو فروغ ملتا ہے۔ یہ ادیب بیرونِ ملک اردو زبان وادب کے سفیر ہیں۔ ان سفیران کا تعارف ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ کرایا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان سفیرانِ ادب کی ترجمانی کا کام ڈاکٹر صاحب نے بخوبی انجام دیا ہے۔

سفیان شاکر (لاہور)

آپ کے پانچ سوالات پر مبنی گشتی مراسلہ نظر نواز ہوا نوازش کہ آپ نے یاد رکھا مضافاتی اُدباء پر لکھی گئی اہم دستاویز کے بعد آپ کا اگلا قدم ''اردو شعروادب کے سفیر'' کی جانب ہے۔ آپ کے پانچوں سوالات اہم ہیں پہلے سوال میں آپ نے پوچھا ہے'' کہ کیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لیے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں'' تو اس کا مختصر ترین جواب ہے ___ نہیں!

کیا اِن کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے تو بھی ___ نہیں!

تیسرا سوال یہ ہے کہ ''اِن تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے'' تو جواب ہے۔۔۔ کچھ بھی ___ نہیں!

چوتھا سوال بھی پچھلے سوالوں کی طرح اہم ہے'' کیا آپ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں'' تو اس کا جواب ہے۔۔۔ قطعاً ___ نہیں!

آخری سوال کی بات آخر میں......! آپ میرے جوابات پڑھ کر یقیناً یہ

سوچ رہے ہوں گے یا تو میرا مطالعہ ناقص ہے یا پھر میری معلومات (بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے متعلق) بات دراصل یہ ہے کہ اگر تو شعروادب کی ترویج میں مثبت کردار عالمی مشاعرے ارینج (Arrange) کروانا یا کانفرنسز سجانا ہی ہے........ تو میری "نہیں" کا کوئی جواز نہیں۔ جہاں تک تخلیقات میں وطن کی خوشبو کا تعلق ہے تو چودہ اگست یا ۲۳ مارچ کے حوالے سے لکھی گئی ایک آدھ نظم یا غزل کو اس ضمن میں لانا تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کرنے کے مترادف ہے تو بھی میری "نہیں" کا کوئی جواز نہیں۔ جہاں تک اِن تخلیق کاروں کی تخلیقات کے معیار اور تخلیقی کاموں سے مطمئن ہونے کی بات ہے تو میری نظر میں (ماسوائے چند) بیشتر اصحاب کی شعری اور نثری تخلیقات نہ صرف روکھے پن کی صورت ہیں بلکہ اُن کے ہاں جذبے کی شدت تو ہے مگر بات میں گہرائی اور فسوں نہیں جو تحریر کو ایک اعلیٰ ادبی شہ پارے میں تبدیل کر سکے۔ اگر میری بات غلط ہو تو ان لوگوں کو کبھی بھی پاکستان یا انڈیا میں مقیم معروف اور بڑے ناموں کو بلا کر محفلیں برپا کرنے کی ضرورت کیوں ہو؟

جہاں تک آپ کے آخری سوال کا تعلق ہے کہ "ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہئے" تو میں آپ کے توسط سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ صرف اور صرف خود کو کانفرنسوں اور مشاعروں تک محدود نہ کریں (بلاشبہ یہ بھی ضروری ہے اگر پڑھے گئے مقالوں کی آواز دور تک پہنچے اور اُن پر عمل درآمد کیا جائے) بلکہ اپنی تخلیقات میں وہ مسٹری پیدا کریں کہ ایسا محسوس ہو کہ یہ تخلیق کار کائنات کے سفر کے بعد اپنی ذات میں غوطہ زن ہے۔ اکہری اور سطحی بات چاہے سونے کے ورق پر بھی لکھی جائے وہ کسی کے دل پر کیسے اثر انداز ہو؟

تخلیق کار دُنیا کے کسی بھی کونے میں موجود ہو اس کا موضوع ایک وطن ہی نہیں پوری کائنات کے گرد پھیلا ہوتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں کہ کسی کو سمندر سے نکال کر "کنو یں" تک محدود کروں.....؟؟؟

انجینئر مجید غنی (لاہور)

اپنے وطن سے دور زندگی گزارنا یقیناً ایک مشکل کام ہے کیونکہ انسان نہ صرف اپنوں سے دور ہوتا ہے بلکہ ایک دوسرے معاشرے کا فرد بن جاتا ہے جہاں کم از کم ابتدا کے کئی سال اس کی حیثیت اجنبی سی ہوتی ہے۔ یورپ اور ترقی یافتہ ممالک میں زندگی مزید مشکل ہوتی ہے کیونکہ یہاں انسان محض ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سوچ صرف معاشی معاملات تک محدود ہو جاتی ہے اور باقی تمام چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ ان مشکل حالات میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو مرنے نہیں دیتے اور ان کے اظہار کا موقع ضرور نکال لیتے ہیں اور تخلیقِ ادب میں اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ قابلِ صد ستائش ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کچھ ایسے اصحاب بھی ہیں جو اپنے اپنے ممالک اور States وغیرہ میں مختلف ادبی رسائل اور کتب کی اشاعت کا بھی بندوبست کرتے ہیں اور اس طرح شاعروں اور ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں تک اہلِ قلم کی کاوشیں پہنچتی رہتی ہیں۔ جدید دور میں کمیونیکیشن کے وسائل سے بھی علم وادب کی آبیاری جاری ہے اور لوگ دور دراز کے شاعروں کی تخلیقات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ فی زمانہ علم وادب کیلئے وقت اور سرمائے کی قربانی تو ہمارے اپنے ملک میں بھی بے حد مشکل کام ہے لیکن جو لوگ بیرون ملک بیٹھ کر یہ خدمت کر رہے ہیں وہ ہماری ستائش کے زیادہ مستحق ہیں۔

ان تمام اچھی چیزوں کے باوجود ایک بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور موجودہ حالات نے اس کی ضرورت کو اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے کہ بیرون ملک میں مقیم ہمارے یہ ادبی سفیر اپنے اشعار اور تخلیقات میں روایتی شاعری کے ساتھ ساتھ عالمی محبت اور بھائی چارے کا درس بھی دیں۔ ہم سب آگاہ ہیں کہ چند لوگوں کی ناسمجھی اور دین

اسلام کی اخوت، بھائی چارے اور رواداری کے درس سے لاعلمی نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جہاں مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کیلئے اس تاثر کو قائم کرنا اور پختہ کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں 'محبت کو فاتحِ عالم' سمجھتے ہیں۔ اپنوں کی نادانیوں، ناعاقبت اندیشوں اور یہود و نصاریٰ کی سازشوں نے ہمارا ناتہ دہشت گردی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے ورنہ دلنوازی کا سلیقہ تو مسلمان کے لہو اور اسلام کی تعلیمات میں شامل ہے۔ چنانچہ بیرون ملک مقیم ہمارے ادیب اور شاعر بھائی بہنوں سے ایک پاکستانی بھائی کی یہ گزارش بے جا نہ ہوگی کہ اپنے دین کے اس سبق کو شاعری کا موضوع بنائیں تاکہ دوسرے لوگوں کے دل میں موجود تاثر کو جس حد تک ممکن ہو کم کیا جا سکے۔ یہ تمام اہلِ قلم چونکہ ان معاشروں میں موجود ہیں اس لئے اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو بہتر طور پر قائل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ مقامی لوگوں کو اپنی زبان میں لکھی گئی شاعری کے مفہوم سے آگاہ کرنے کیلئے اس کے ترجمے کروائیں اور ایسی ادبی مجالس کا اہتمام جس میں مختلف زبان کے شاعر و ادیب شرکت کریں اور بعد میں مقامی زبان میں اپنے کلام کا مفہوم بیان کریں اس سے وہ نہ صرف ہمارے پیغام کو تیزی سے پھیلانے کا ذریعہ بنیں گے بلکہ اردو زبان کی ترویج اور اس میں نئے مفاہیم کے اضافے کا موقع بھی فراہم ہوگا۔

محترم ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب بیرون ملک مقیم شاعروں اور ادیبوں کے کام کو ایک لڑی میں پرونے کا قابلِ قدر فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ یقیناً ایسے منفرد کام کی توقع ڈاکٹر صاحب سے ہی کی جا سکتی ہے۔ آپ اُردو ادب کی خدمت ایک مشن سمجھ کر کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی آپ کے اس جذبے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے مشن میں کامیابی عطا فرمائے۔

ارشد محمود ارشد (سرگودھا)

شبیر الحسن صاحب، ادب کے فروغ کے لئے آپ جو بے لوث خدمات سرانجام دے رہے ہیں اس کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت آپ کے حوصلے بلند رکھے اور آپ کے قلم کی جولانیاں اسی طرح قائم و دائم رہیں۔ آمین!

''اُردو شعر و ادب کے سفیر'' میں آپ نے جو سوالات اُٹھائے ہیں اُن کے جواب میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ آج جب زندگی اتنی تیز رفتار ہو گئی ہے کہ کھانے پینے کے لئے وقت نکالنا بھی دشوار محسوس ہوتا ہے ایسے میں گلستانِ ادب کی آبیاری کرنے والوں کی جدوجہد کو سراہا جانا چاہیے۔ بیرونِ ممالک، جہاں معمولاتِ زندگی، پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ تیز رفتار ہیں وہاں پر موجود شاعر و ادیب جو اپنے وطن سے دور تلاشِ معاش کی خاطر مقیم ہیں اُن کی ادبی خدمات اور ادب سے لگاؤ قابلِ ستائش عمل ہے اس کی جتنی بھی حوصلہ افزائی کی جائے کم ہے۔ ایسے بے شمار نام ہیں جو دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنے وطن سے منسلک ہیں اور اُن کے دل اپنے وطن کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جناب راشد امین جو کہ برمنگھم (برطانیہ) میں مقیم ہیں، فرماتے ہیں کہ:

چہرے پر تحریر نہیں لکھوائی کوئی
ہم نے اپنے دل کو پاکستان کی ہے

جناب عبدالغفور کشفی، ضمیر طالب، سرفراز سیال، عابدہ شاہ، مزمل شاہد، صدف فرزا، مسرت احمد، یاسمین حبیب، راشد لطیف، تنویر پھول، فیصل عجمی، طاہر عظیم، طاہر نیر طاہر، مرزا امجد (یو کے ٹائم)، شفیق مراد، ضیا جالپوری، افروز عالم، فرزانہ سحاب، ارم بتول، شہزاد ارمان اور شاہین رضوی ایسے درخشاں ستارے ہیں جو اپنے وطن سے دور رہ کر بھی ادبی اُفق پر جلوہ افروز ہیں۔

جہاں تک بات ہے تخلیقات کے معیار کی تو جناب تخلیق کار کے لئے تو اُس کی تخلیق اولاد کی طرح ہوتی ہے اور وہ کیا کہا جاتا ہے کہ اولاد تو سب کو اپنی ہی پیاری ہوتی ہے اور ویسے بھی ہر قاری کا اپنا الگ ٹیسٹ ہوتا ہے جو تحریر کسی ایک قاری کو متاثر کرتی ہو ممکن ہے کہ وہ بیشتر دوسرے پڑھنے والوں کے لئے عام سی تحریر ہو۔

جہاں تک سوال بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہونے کا ہے تو میرے خیال میں بہتری کی گنجائش ہر جگہ اور ہر سطح پر رہتی ہے۔ بیرونِ ممالک قیام پذیر شاعر وادیب دوستوں کی خدمت میں گزارش کرنا چاہوں گا کہ وہ آپس میں روابط بڑھائیں ایسے ادبی پلیٹ فارم بنائیں جہاں علم وادب کے فروغ کے لئے سیمینار منعقد کروائے جائیں جو نہ صرف بیرونِ ممالک میں مقیم اہلِ قلم کی پذیرائی کے لئے اقدامات کریں بلکہ اپنے وطن میں موجود قلم قبیلہ سے بھی روابط بڑھائیں اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل وجرائد کی مالی معاونت کے علاوہ اپنی تخلیقات معتبر ادبی رسائل وجرائد میں اشاعت کے لئے بھیجیں اس کے علاوہ بیرون ممالک میں اُردو ادب کی لائبریریوں کے قیام کے لئے بھی کوششیں کی جانی چاہئیں۔

پروفیسر انیقہ سلیم (لاہور)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُردوادب کی وہ نامور شخصیت ہیں جنہیں اُردو سے محبت ہی نہیں عشق ہے اور اس میں انہیں سود وزیاں کی بھی پروانہیں۔ اُردو کو انہوں نے چاہا اور اس چاہت کے دام لگانے کی اجازت انہوں نے کسی کو نہیں دی بس خاموشی سے مشقِ سخن جاری رکھی۔ ان کا شمار اُن شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اُردو کی اعلیٰ تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی کہ اسے روزی روٹی کا وسیلہ بنا سکیں نہ اس لیے کہ اپنے نام کے ساتھ ڈگریاں سجائیں۔ ڈاکٹر صاحب اُردو زبان اور اس کے ادبی سرمایے سے سچی اور گہری محبت رکھتے

ہیں اور اس کے ساتھ پرخلوص جذبہ بھی کہ اس کی کچھ خدمت کرسکیں۔ان کی تازہ اور نئی تخلیق ''اُردو شعروادب کے سفیر'' ان کے پرخلوص جذبے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اُردو ادب کے تخلیقی میدان میں اُن کی بے پناہ خدمات قابل ستائش ہیں۔

اُردو زبان و ادب میں تخلیق و تنقید کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری و ساری رہا اور ہر سال ایک نسل تازہ اُردو ادب کی آغوش میں پلتی رہی۔یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے اب تک اُردو زبان و ادب ایک ایسا شجر سایہ دار بن چکا ہے جس کے سائے میں نہ صرف پاکستان میں مقیم بلکہ وطن عزیز سے دور پاکستانی بھی زندگی تلاش کر رہے ہیں۔

معیاری اور پرتاثیر ادب کے لیے زماں و مکاں کی کوئی قید نہیں ہوتی۔فرق اتنا ہوتا ہے کہ ادیب جس ماحول میں پرورش پاتے ہیں اُسی ماحول و معاشرے کے عکاس ہوتے ہیں۔ وہ معاشرہ مغرب میں بسنے والوں کا بھی ہوسکتا ہے اور مشرق والوں کا بھی۔ پھر خواہ وہ شہروں کے رہائشی ہوں یا دیہاتوں کے اپنے تجربات و مشاہدات کا برملا اظہار ان کی تخلیقات سے عیاں ہوتا ہے۔ جہاں شہر میں بسنے والے تخلیق کار کی تحریروں میں تیز رفتار زندگی کا عکس جھلکتا ہے وہاں دیہات میں رہنے والے تخلیق کار کی تحریروں میں فطرت کی عکاسی ہوتی ہے۔

بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کا پردیس میں رہتے ہوئے بھی اُردو زبان و ادب کے ساتھ ایک پرخلوص رشتہ موجود ہے۔اُردو زبان کی فطری مٹھاس، حساس ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں آج بھی کامیاب رہی ہے اور وطن عزیز سے دور رہ کر بھی اُردو نظم و نثر کے حوالے سے ان کی بہت سی قابلِ تحسین کاوشیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ وہ اپنی بھرپور جدوجہد کے ساتھ اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے اظہار میں کوشاں ہیں۔ ان کی تخلیقات اُردو کے معیاری رسائل و جرائد کی زینت بن رہی ہیں۔

بلاشبہ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کو باثروت بنانے میں کسی طرح پاکستان میں مقیم ادیبوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ذاتی، سماجی، زمانی و مکانی حالات یکسر مختلف ہونے کے باوجود ان کی فنکارانہ صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں۔ اُردو شعروادب کے سفیروں کی ادبی خدمات، معاشرتی ماحول کی سماعت اور عکاسی اور داد سے مستثنیٰ سالہا سال تک نسل در نسل ادب کی ترویج و منتقلی کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

اُردو شعروادب کے ان سفیروں کی تحریروں میں جہاں معاشرتی شعور کارفرما نظر آتا ہے وہاں وطن سے دوری، تڑپ اور دلی کیفیات کا عکس ان کی تخلیقات میں نمایاں ہے۔ ان کی تحریریں انسان دوستی، انسانیت سے محبت کے جذبوں سے بھی سرشار ہیں۔ اخلاص، ہمدردی، مساوات، جرأت و بے باکی کے ساتھ ساتھ وطن سے دوری، معاشرتی مسائل، پردیس کی محرومیاں، پریشانیاں، خوشی، غم، سکوں، بے سکونی، ابدیت، تغیر پذیری، خارج و باطن کے مختلف موضوعات احاطہ قلم میں آتے ہیں۔ وطن عزیز سے دور رہ کر بھی مٹی کی خوشبو، فطرت کا جمال اس کی رعنائیاں، اپنے پیاروں کی محبت، محبت میں تڑپتا دل اور اسی محبت کے عکاس آنسو نظموں، غزلوں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھرے نظر آتے ہیں۔

پردیسی تخلیق کاروں کی تخلیقات کے معیار کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات طے شدہ ہے کہ آج کا تخلیق کار بنیادی سہولیات سے محروم نہیں رہا۔ دنیا گلوبل ولیج سے آگے کا سفر طے کر رہی ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی سہولیات کی بدولت ان کی تخلیقی صلاحیتیں فنی و جمالیاتی معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہیں اور وہ شعروادب میں نئے نئے موضوعات کو تراشنے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی چاشنی سے مزین نئے تجربوں کا رویہ بھی سامنے آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار بہت ہی توجہ سے کھرے انداز میں اچھا اور معیاری ادب تخلیق

کر رہے ہیں۔

ادیب ایک زمانے کا فرد نہیں ہوتا بلکہ ادب کے قارئین اور ناقدین کی نسلیں ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔ ہمیشہ وہی تخلیق زیادہ بامعنی ہوتی ہے جس میں تخلیق کار کی خالص واردات کی جھلک نظر آتی ہے ان کی تخلیقات زندگی کے بہت سے مشاہدات اور اثرات لمحہ بہ لمحہ ہمارے ذہن ودل میں گھر کرتے ہیں۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی اظہار کی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال ہیں اور کامیابی سے غزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ بلاشبہ یہ پردیسی تخلیق کار اُردو ادب کے میدان میں ایک مؤثر اور بھرپور انداز سے جلوہ گر ہیں اور ان کے لہجے کا اعتماد اور تازگی اور شعری تجربے مستقبل کا اہم سنگِ میل ہے۔ روایات سے باوقار وابستگی کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں کی بھرپور عکاسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

تخلیق کار ذہنی طور پر ہمہ وقت مصروفِ عمل رہتا ہے۔ کھوج اور جستجو کا یہ عمل اس پر زندگی کے نت نئے پہلوؤں کے در وا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں جنہوں نے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ منفرد اور اچھوتی سعی کی ہے۔ ان کی ادبی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

پروفیسر عظمیٰ حسن (کراچی)

سوال ۔ کیا بیرونِ ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ بیرون ممالک میں مقیم پاکستانی تخلیق کار ملک سے دور رہتے ہوئے بھی اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کر رہے ہیں۔ البتہ مقامی اور بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں میں ابلاغ کے انداز اور اظہار اسلوب کے کچھ انداز مختلف ضرور ہوتے ہیں۔

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟
جواب ۔ اس حوالے سے پروین شاکر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

وطن کی خوشبو تو ہر تخلیق کار کے لہجے میں مہکتی ہے لیکن بیرون ملک رہنے والوں کے پاس اس خوشبو کے ساتھ ہجر کی نمی بھی ہوتی ہے۔

سوال۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟
جواب۔ تخلیق کار کی کاوشیں اور ذاتی رجحان اس کی تخلیق کے معیار کا تعین کرتے ہیں۔ بیرون ملک رہنے والے تخلیق کاروں میں سے بہت سے اپنے فن میں سچے ہیں اور خلوص فن کا معیار بنا دیتا ہے۔

سوال۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟
جواب ۔ ملک سے دور رہنے والے وطن کی آب و ہوا کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی شدت سے یاد کرتے ہیں اور اجنبی زبانوں کے درمیان اپنی زبان بولنے والا ہر ہر فرد نہایت اہم ہوتا ہے اور اس لسانی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی زبان اور معاشرے کے تحفظ کے لیے ہمہ وقت سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ مختلف ادبی تقاریب اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ بات باعثِ طمانیت ہے۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟
جواب۔ ملک سے باہر رہنے والوں اور ملک میں رہنے والوں کے درمیان رابطہ نہایت ضروری ہے تاکہ تخلیق کار ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے تغیر اور مسائل کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے فروغ کے جدید انداز اور اپنی مٹی، روایت کے حُسن کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔

جُنید امجد (جھنگ)

میرے گیان کے مطابق ''اپنے دیس یا جنم بھومی سے محبت کرنا، اپنی ماں سے محبت کرنے کے مترادف ہے۔''

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ یہ کائنات میں جہاں چاہے رہ سکتا ہے۔ درحقیقت انسان جہاں جنم لیتا ہے، کھیلتا کودتا ہے، پڑھتا اور بڑا ہوتا ہے وہی اس کی اصل درس گاہ ہے، وہی دیس ہے یعنی وہ اس ماحول کا باسی ہو جاتا ہے۔ اس سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا ہے۔ گھر سے دُور جائے بھی تو گھر کی یاد برابر ستائے گی۔ کیوں کہ جو مسرت و سکون اُسے اپنے دیس یا گھر میں حاصل ہے وہ پردیس میں ملنا ناممکن ہے لیکن پھر ایسے میں اپنے مَن کی اُداسی کو مٹانے کے لیے وطن کی خوب صورت یادوں کے سہارے، اپنے مہان لفظوں کو کاغذی پیرہن بخشتے ہوئے اس کی کمی کو پورا کرے گا۔

حضرت مجید امجد اپنے دیس جھنگ سے محبت کا اظہار بڑے دل کش انداز میں کرتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

مرا خطۂ نور و رنگ آ گیا ہے
مرا سُکھ بھرا دیس جھنگ آ گیا ہے

اِسی نقطہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم بیرونِ ملک مقیم شعراو ادبا کی خدمات کو دیکھیں تو اس ضمن میں ہم باآسانی اُن کی تخلیقی قوت کا جائزہ لگا سکتے ہیں۔

بیرونِ ملک مقیم شاعر و ادیب مرکز سے جتنا دُور ہے اُتنا ہی عمدہ ادب تخلیق کر رہا ہے۔ اُن کا قلم بڑی دل جوئی اور استقامت کے ساتھ رواں ہے۔ اس کے درمیان کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ اگر کوئی شاعر ہے تو لازوال اور لطیف شاعری کر رہا ہے۔ اگر کوئی افسانہ نگار ہے تو گذشتہ سے بہتر افسانہ تخلیق کر رہا ہے اور اگر کوئی نقاد ہے تو تنقید میں جدت

لا رہا ہے۔ یعنی اردو ادب کی اَلف بائی کے یہ مسافر تسلسل سے بعافیت سفر کر رہے ہیں۔ ان کے کسی کام میں بھی کوئی تھکان نظر نہیں پڑتی۔

ان کے یاں اُردو ادب کی گوناں گوں اشکال پیکرِ خورشید میں دکھائی دیتی ہیں، جو اپنے "ہونے" کی گواہی پیش کرتی ہیں۔ ناروے میں مقیم نوجوان پاکستانی شاعر فیصل ہاشمی کی ایک مختصری نظم "حادثہ" ملاحظہ ہو:

"زندگی چابیوں کا گچھا ہے
جس میں خوشیوں کے نام کی چابی
کھوگئی جب اُسے اُچھالا تھا۔"

ناروے میں مقیم ایک اور نوجوان شاعر افضل عباس کا اُردو اور پنجابی روپ ملاحظہ فرمائیں:

مجھ سے کترا کے تُم نکل جانا
مَیں تو رستے کا سنگ ہوں بابا

....

اُتھے وی رستہ لبھ لیندے
گھپ ہنیرے ٹھڈے کھا کے

بھارت میں مقیم معروف شاعر شارقؔ عدیل کا شعر ملاحظہ ہو:

بڑھا رہے ہیں روابط جو اب بنامِ خلوص
وہ دوست تجھ کو نہیں، تیری جان چاہتے ہیں

وقت کی قلت کی بنا پر زیادہ وضاحت ناممکن ہے۔ میرا مقصود، محض جینوئن شاعر کی جینوئن تخلیق پیش کرنا تھا، تا کہ قارئین ادب اپنی سوچ کے مطابق بہتر فیصلہ کر سکیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب، اعلیٰ پایہ کے نقاد اور معلم ہیں۔ ان کی اعلیٰ وارفع

شخصیت میں ''فقر'' دکھائی دیتا ہے اور یہ ''فقر'' قارئینِ اُردو ادب کے لیے نت نئی سہولیات مہیا کرتا رہتا ہے تاکہ ان کی تخلیقی ومطالعاتی تشنگی پوری ہو سکے۔

میری اللہ کریم سے دُعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ان ادبی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے اور آپ کا سایۂ شفقت ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین!!

چلتے رہو کہ چلنا ہی منزل کی شرط ہے
عارفؔ کوئی سفر، سفر رائیگاں نہیں

ندیم عباس بخاری (میانوالی)

''اردو شعروادب کے سفیر'' کے لیے بیرونی ممالک میں مقیم شعرا و ادبا کیا خدمات سرانجام دے رہے ہیں؟ اور کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے یہ موضوع دیتے ہوئے یا سوال کرتے ہوئے رائے طلب فرمائی ہے۔ لیکن میں اصل موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے حوالے سے ہی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دورِ حاضر میں وہ ادبی حوالے سے بہت خوبصورت، اچھوتے، منفرد اور بہت مشکل موضوعات پر کام فرما رہے ہیں۔ جن میں ہم اس وقت جس موضوع پر بات کر رہے ہیں یہ بھی شامل ہے اور اس سے قبل آنے والی اُن کی خوبصورت کتاب ''مضافاتی شعروادب'' بھی ان کی اسی قسم کی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ادبی حوالے سے خدمات اور کوششیں لائقِ تحسین ہیں۔

اور اب بات شروع کرتے ہیں اصل موضوع پر، تو کچھ لوگ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اور کچھ کاروباری حوالے سے بیرونِ ملک جاتے ہیں لیکن جانے کی وجہ یا غرض جو بھی، پہلی مرتبہ پردیس جاتے ہوئے جب آدمی اپنا گھر، اپنا علاقہ، اپنا دیس، اپنا ملک چھوڑنے لگتا ہے تو وہ لمحات بڑے مشکل ہوتے ہیں کیونکہ کہتے ہیں کہ اپنے وطن کی مٹی سے

فطری پیار ہوتا ہے اور اپنے وطن عزیز سے دوری کا اندازہ صرف وہی آدمی کر سکتا ہے جو خود عملی طور پر اس تجربے سے گزرا ہو۔

ہمارے پیارے ملک پاکستان سے گئے ہوئے شاعر اور ادیب جو اس وقت باہر کے ممالک میں تعلیم و کاروبار یا کسی بھی سلسلہ میں مقیم ہیں اور اپنے تعلیمی و کاروباری سلسلوں کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے وطن کی قومی زبان اردو کے فروغ اور ترقی کیلئے کوشاں ہیں۔ انگریزی ماحول اور دوسرے ماحول اور تہذیب میں رہنے کے باوجود انہوں نے وہاں پر اردو اکیڈمیاں، اردو ادبی تنظیمیں بنا رکھی ہیں اور ادبی نشستیں بھی ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ اردو ادب کی اشاعت کا کام بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ وہ لوگ پاکستان سے معروف اور نامور شعرا و ادیبوں کو بلا کر بہت بڑی بڑی تقریبات اور مشاعرے بھی کراتے رہتے ہیں۔

وہ لوگ یقیناً اپنے وطن، اپنے پیارے ملک پاکستان سے اور اپنی قومی زبان اردو سے محبت کرتے ہیں وہ جہاں بھی رہیں لیکن اپنے ملک پاکستان اور اپنی قومی زبان اردو کو نہیں بھولتے وہ لوگ اپنے ملک سے محبت کا حق ادا کرتے رہتے ہیں اور کر رہے ہیں لہٰذا میں باہر کے ممالک میں رہنے والے شعرا و ادب کے ادبی کردار، خدمات اور ادبی سرگرمیوں سے مطمئن ہوں، اور آخر میں میں ان کے لیے دعا کے طور پر پروین شاکر کے یہ اشعار پیش کروں گا:

یہ چاند اور یہ ابر رواں گزرتا رہے
جمالِ شام تہہ آسماں گزرتا رہے
بھرا رہے تری خوشبو سے تیرا صحنِ چمن
بس ایک موسم عنبر فشاں گزرتا رہے

خدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیارِ وقت سے تو شادماں گزرتا رہے
میں تجھ کو دیکھ نہ پاؤں تو کچھ ملال نہیں
کہیں بھی ہو تو، ستارہ نشاں گزرتا رہے

ڈاکٹر کومل عروج (لاہور)

عام طور پر بیرون ملک مقیم ادیبوں اور شاعروں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ ڈالر، پونڈ اور درہم کی بنیاد پر شاعری کرتے ہیں اور اسی باعث ان کے خیالات ان کی معاشرت کی عکاسی نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ سوچ غلط ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ ہم جو الزامات بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں پر لگاتے ہیں کیا ہمارے ملک کے تخلیق کاران سے مبرا ہیں۔ کیا یہاں سرقہ اور توارد کے لامتناہی سلسلے قائم نہیں ہیں؟؟ یہ سب کچھ ہے تو ہم دوسروں پر الزامات لگانے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں اور پہلے خود اصلاحی مہم کا آغاز کریں۔

بیرونِ ملک مقیم ادیبوں اور شاعروں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہاں اچھا نقاد موجود نہیں ہے جب معیارات متعین نہ ہوں تو تخلیق کی وقعت میں کمی آجاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بیرونِ ملک مقیم شعرا بزرگ شعرا سے اصلاح لیں اور ادبا ناقدین ادب سے رہنمائی حاصل کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں چاہیے کہ وہ محض ان ناقدین کو اپنے ممالک میں مدعو کریں جو علم و ادب کے جدید معیارات سے آگاہ ہوں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اُردو تنقید کا ایک مضبوط ستون ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ نئے نئے موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے۔ زیرِ مطالعہ موضوع بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ اُمید ہے کہ اُن کی یہ کتاب چشمِ معتبر میں جگہ پائے گی۔

اعجاز دانش (ملیشیا)

سوال۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر ممالک میں پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج وترقی کے لیے بہت زیادہ کام کر رہے ہیں۔ شاعر ہو یا ادیب ہر دو فنکار اپنے اپنے انداز میں ملک وقوم کی عظمت کو بڑھانے کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی اپنی تخلیقات میں وطن کی مٹی سے اپنائیت کا اظہار مختلف انداز میں کر رہے ہیں۔

سوال۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب۔ معیاری لحاظ سے دیگر اقوامِ عالم کے قلم کار اس قدر تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال نہیں ہیں کہ انھیں پاکستانی ادب پر فوقیت حاصل ہو۔ سو پاکستانی تخلیق کار یہاں بھی اولیت رکھتے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ یقیناً اہلِ پاکستان اپنے ان بھائیوں کو جو غیر ممالک میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ ان کے لیے قابلِ قدر ہیں اور پاکستانی تخلیق کار بیرون ملک تخلیق کاروں سے ہر طرح مطمئن بھی ہیں۔ ان تخلیق کاروں کی درجنوں کتابیں منظرِ عام پر آ کر تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب۔ اردو زبان کی ترویج کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں وہ شعروادب میں استقامت کے ساتھ مصروف عمل ہیں وہیں انھیں چاہیے کہ اردو زبان کی جو ہماری قومی زبان ہے اُس کو درست اور سہل انداز میں لوگوں تک پہنچائیں تا کہ اُردو زبان کی ترقی ہو سکے۔ اس طرح کتابیں و رسائل بھی شائع کرائیں۔ تا کہ دیگر ممالک سے ان کا رابطہ ہو سکے۔ سیمینارز اور محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کریں تا کہ اردو ادب کی خدمت ہو سکے۔

ڈاکٹر رضوان احمد مجاھد (لاہور)

ادب کو زندگی کا ترجمان کہا جاتا ہے لیکن ادب کا کام محض ترجمانی ہی نہیں ہے بلکہ مقصدیت کی تصویر ہونا بھی ضروری ہے۔ اچھے ادب کی شناخت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ زندگی کو انسانی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ افراد میں آگے بڑھنے، ترقی کرنے اور ارفع جذبات کو مہمیز دینے کا ذریعہ ہے۔ ایک اچھا ادب زندگی کی حقیقی جھلک کا حامل ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح ایک ادیب نہ صرف اپنے ماحول سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ اپنی تخلیق کے ذریعے اپنے ماحول پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ ادیب اپنے تجربات، احساسات اور مشاہدات کو اپنے تخیل سے ہم آہنگ کر کے جو تخلیق وجود میں لاتا ہے وہ معاشرے کی تصویر ہوا کرتی ہے۔

بیرون ممالک میں موجود اُردو زبان و ادب کے حوالے سے خدمات انجام دینے والے ادیب بھی اپنے معاشرے کے عکاس ہیں۔ یہ ادیب بہت محبت سے زبان کی خدمت میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں دو طرح کے ادیب شامل ہیں۔ ایک وہ جو کہنہ مشق ہیں اور دوسرے وہ لکھنے والے جو نسبتاً نوآموز ہیں لیکن ان دونوں کے

ل تجربہ اور احساس کی آنچ یکساں ہے۔ فرق صرف اسلوب کی پختگی کا ہے کیونکہ تمام تر حقانیت اور شعور واحساس کی آمیزش کے باوجود پیرایہ اظہار میں ندرت اور اسلوب بیان میں دسترس کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ انداز بیاں بات بدل دیتا ہے ورنہ تجربات ومشاہدات میں یکسانیت کا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ادب جہاں زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے وہاں جمالیاتی ذوق کی آبیاری کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ حقیقت میں ادب کا فنی اور جمالیاتی پہلو ہی اس کا حقیقی اثاثہ ہوا کرتا ہے۔ حقیقت کا کھردرا اور ننگا اظہار کوئی نعرہ تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیقی ادب نہیں۔ ایک اچھا ادیب اپنے تجربات اور مشاہدات کو تخیل سے ہم آمیز کر کے ایک منفرد شاہکار تخلیق کرتا ہے۔ اس کا اسلوب عام خیال کو بھی ندرت بخشتا ہے جبکہ پیرایہ اظہار کا کچا پن ارفع خیال کو بھی غارت کر دیتا ہے۔

بیرون ممالک میں مقیم ہمارے دوست ادیب اس لحاظ سے بہت اہم خدمات سرانجام دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اشعار ونثر کے ذریعے نہ صرف اپنے گردوپیش کی تصویر کشی کر رہے ہیں بلکہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا کے مشاہدات کو شعری جامعہ پہنا کر پڑھنے والوں کو اپنے مشاہدہ میں شریک بھی کر رہے ہیں۔ اُن کے ہاں وطن سے دوری کی بدولت ایک اچھوتی کسک کا احساس بھی جھلکتا ہے۔ وہ اپنے پیاروں کی کمی اور اُن کی محبت کی تڑپ بہت دلسوز انداز میں بیان کرتے ہیں لیکن ان کی یہ تڑپ اور بے قراری اُمید اور رجا کے آہنگ سے مملو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر اور اشعار بہت حد تک مقامیت کی چھاپ سے بچ کر آفاقیت کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔

یہ آفاقیت ہر کہہ ومہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے تن شاعر کا لہو خشک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ممالک میں اردو ادب لکھنے والوں کی بہت کم تعداد اس معیار پر پورا اترتی ہے۔ ان لکھنے والوں میں گو جذبہ و ذوق کی کمی نہیں ہے لیکن یقینی طور پر ریاضت

کا فقدان ہے جس نے معیار کو متاثر کیا ہے۔ ان احباب میں سے بہت سوں کی کتابیں صرف اس بنا پر شائع ہو جاتی ہیں کہ یہ بآسانی اخراجات برداشت کر سکتے ہیں حالانکہ یہ کتابیں قطعی طور پر زبان وادب کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ان احباب کے خلوص نیت پر شبہ نہیں۔ یہ یقیناً ادب دوست اور زبان سے محبت کرنے والے ہیں اور بلاشبہ اس ذریعے سے کسی نہ کسی حد تک زبان وادب کی خدمت بھی ہو رہی ہے۔ کچھ ادب سے وابستہ افراد بھی سہولت پا رہے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ دوست اپنی تخلیقات کا معیار بہتر بنانے کے لیے توجہ دیں جہاں اصلاح کی گنجائش ہو، اصلاح لیں، مشورہ کریں اور محض صاحب کتاب بننے یا کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی غرض سے کتابوں کی بھرمار نہ کریں۔ یہ دوست یقیناً قابلِ تحسین ہیں جو وطن سے دور دیارِ غیر میں تمام تر مشکلات کے باوجود اردو زبان وادب سے محبت کا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔

پروفیسر آنسہ سلیم (لاہور)

ادب کسی بھی زبان کا تحریری سرمایہ ہوتا ہے لیکن ہر تحریر ادب کے زمرے میں نہیں آتی۔ ادب کے کچھ محاسن ہوتے ہیں یہ محاسن جب تک کسی تحریر میں نہ پائے جائیں اسے ادب کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں ادب میں لکھنے والے کے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیبی روایات اور ثقافتی ورثہ بھی شامل ہوتا ہے۔

قومی تشخص میں زبان وادب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زبان وادب چند کلمات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کا قوم کی تاریخ، تہذیب وثقافت، مذہب، سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور افکار وجذبات سے عمیق تعلق ہوتا ہے۔ پاکستان میں جس زبان کی جڑیں پاکستانی تہذیب وثقافت، تاریخ، دین اور افکار میں زیادہ گہری

ہیں وہ اُردو ہے۔

ایک عہد میں کسی قوم کا اسلوبِ زندگی ادب کے ذریعے آنے والی نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور ہر نسل اپنے عہد کی ضروریات کے مطابق اسلوبِ زندگی میں ترمیم و تنسیخ کرتی رہتی ہے لیکن یہ اٹل حقیقت ہے کہ ادب کو کسی ایک خطے یا سرزمین کے لیے مخصوص نہیں کیا جا سکتا اس کی جڑیں وہاں کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں میں بھی پیوست ہوتی ہیں۔ وہاں کے مکین کائنات کے کسی بھی گوشے کا حصہ بن جائیں لیکن اپنی اصل سے کبھی بھی بیگانہ نہیں ہو سکتے۔ اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتی ہے اور بات جب کسی تخلیق کار کی ہو جو اپنے وطن سے دور ہے تو جدائی محبت بھرے جذبات کو مزید جلا بخشتی ہے اور یہی جذبات ان تخلیق کاروں کے قلب و خرد کے سمندر میں لہروں کی صورت وقتاً فوقتاً ہلچل مچاتے رہتے ہیں اور شدت سے بھرپور کیفیات، تڑپ اور احساس بن کر زیادہ نکھر کر صفحۂ قرطاس کا مقدر بنتی ہیں۔

بیرون ممالک مقیم علم و دانش سے وابستہ محبِ وطن و ادبی پاکستانی تخلیق کار اُردو شعر و ادب کے فروغ و ارتقاء کی اوجِ کمال تک پہنچانے میں مصروفِ عمل ہیں اور گاہے بگاہے اُردو ادب میں ان کی تحاریر ان کے باذوق ادب سے تعلق اور یدطولیٰ کا ثبوت ہیں۔

بیرون ممالک بسنے والے پاکستانی تخلیق کاروں کی تخلیقات میں فکری و فنی ہر دو طرح کے پہلو دکھائی دیتے ہیں اور یہ امر باعثِ حیرت اور ساتھ ساتھ قابلِ فخر بھی ہے کہ وطن سے دور رہ کر طرح طرح کی مصروفیات کے باوجود اپنی معیاری تخلیقات کی بنا پر ادب کے کارواں کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ قابلِ ستائش جہتوں میں سے ایک اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مختلف جگہوں پر مشاعرے کرائے جاتے ہیں جہاں پر

نہ صرف وہاں کے باذوق دانشوروں بلکہ دوسرے ممالک کے علم وادب کے ماہرین کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف ادبی مراکز کے قیام کا ایک مقصد اُردو زبان وادب کو وسعت دینا اور عام فہم کرانا بھی ہے، اس مقصد کی تکمیل اور اُردو آشنائی کے لیے سیمینار منعقد کروائے جاتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے پرکھ کر کے شخصی اعترافات سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے لیے کئی ممالک کے اور خاص طور پر پاکستان سے بھی ادبی حلقوں کو مدعو کر کے انھیں اعزازات اور میڈل سے نوازا جاتا ہے اور اُردو علم وادب کی مزید ترقی کے لیے نئے نئے اور منفرد رجحانات کی طرف توجہ مبذول کروائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گوناگوں موضوعات پر اُردو کی کتب شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض کتب کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی کیے جاتے ہیں جو کہ ان کی اپنی زمین اور ادب سے وابستہ والہانہ عقیدت ومحبت کا ثبوت ہے۔ اشاعت کے مراحل کے بعد رونمائی کی محافل بھی کروائی جاتی ہیں جس سے اُردو فہمی اور ذوق پروان چڑھتا ہے۔ اُردو ادبی رسائل بھی شائع کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ ٹی وی مختلف چینلز میں ادبی سرگرمیوں پر تبصرے کے ساتھ ساتھ مختلف ادباء اور شعرا کو مدعو کر کے ان کے مہذب افکار اور نادر خیالات کو گھر گھر پہنچاتا ہے۔ اہلِ علم وقلم کا حلقہ مزید وسیع کرنے کے لیے ریڈیو میں مختلف ادبی پروگرام منعقد کروا کر عوام تک پہنچانے کی سروس کا اجراء کیا گیا ہے۔ کمپیوٹر کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیشِ نظر اُردو زبان وادب کی مختلف ویب سائیٹ بنا دی گئی ہیں دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والے اُردو علم وادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اپنے ذوق وشوق کے مطابق گھر بیٹھے اپنی تسکین کا سامان کر سکتے ہیں۔

بیرون ممالک مقیم پاکستانی تخلیق کار اُردو زبان وادب کا اٹوٹ حصہ ہیں اور یہ بات قابلِ تحسین ہے کہ ادبی مراکز اور ادبی تنظیم سے دور رہ کر بھی تخلیقات اور ادبی مستقبل کو مزید روشناس کرنے اور پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔ اخلاقی قدروں

کے ساتھ ساتھ جدید اور منفرد موضوعات اور پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی تگ و دو میں کامیاب وکامران ہیں۔

بیرون ممالک میں محبِ وطن تخلیق کاروں کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں مزید بہتری اور خوب سے خوب تر کی جستجو کے لیے چاہیے کہ یگانگت اور محبت کے ساتھ دلوں کو تاباں کرنے والے معیاری ادب کو فروغ دیں اور اُبھرتے ہوئے تخلیق کاروں کے لیے علم دوست اور میرِ کارواں بن کر ان کی اصلاح کریں۔ اصنافِ نظم ونثر میں اپنی فکری، فنی اور ذہنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے رسائل میں وہاں کے مقامی لوگوں کی تخلیقات کو جگہ دیں اور نئے تخلیق کاروں کو بھی ان کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے بَل پر ادب کا حصہ بنائیں۔ چشمِ بصیرت رکھنے والے ان باشجاعت ادبی تخلیق کاروں کی تخلیقات اور کتب مرکز تک پہنچائیں تاکہ اہلِ مرکز بھی ان کے والہانہ پن کی قدر افزائی کریں۔ بیرون ممالک میں مشاعروں، ادبی مذاکروں اور شخصی اعترافات جیسی اہم تقریبات کے لیے انھیں چاہیے کہ مرکز سے صرف علم و ادب سے شغف اور مہارتِ تامہ رکھنے والے تخلیق کاروں کو ہی مدعو کریں تاکہ اُردو زبان وادب کو مزید آبیار کیا جا سکے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا کمال یہ ہے کہ ان کا اختراعی ذہن نئے نئے موضوعات کا متلاشی رہتا ہے۔ پاکستان سے باہر رہنے والوں کی پذیرائی کرنا ایک تخلیقی عمل ہے اور شبیہ صاحب یہ فریضہ احسن طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ بیرون ملک ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں کلماتِ تحسین ادا کرنا بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ میں اس عظیم اور تاریخی کتاب کی تخلیق، ترتیب اور تسوید پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

....

(ب)

(بیرون ملک معروف دانشوروں کی آرا)

◆◆

حیدر قریشی (جرمنی)

(پہلا رُخ)

مجھے اس مضمون میں یورپ میں اردو ادب کی صورتحال پر صرف میٹھی میٹھی باتیں کرنا ہیں (کہیں ہلکی سی کھٹاس آجائے "تو کھٹا میٹھا" بھی برا نہیں ہوتا)۔ جو لوگ یورپ میں اردو شعروادب کے لئے کوئی اہم کام کر رہے ہیں اور میری نظر میں اس کام کی کوئی اہمیت بنتی ہے ان کا اس جائزہ میں تھوڑا سا تذکرہ کروں گا۔ چند فوت شدہ اہم ادیبوں کو تو میں ادبی طور پر فوت شدہ شمار نہیں کرتا البتہ جو لوگ یہاں سے نقل مکانی کر کے کسی اور ملک میں چلے گئے ہیں انہیں میں یورپ کے مکینوں میں شمار نہیں کروں گا۔ شاعری اور فکشن کی کتابوں کا ذکر تو کروں گا لیکن تراجم کے کام پر بات نہیں کروں گا کیونکہ تراجم کا ذکر ہوا تو شاید تخلیقی کام سے زیادہ اس کا ذکر کرنا پڑے گا اور یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے۔

عمومی طور پر یورپ میں مقیم اردو کے شاعر اور ادیب شاعری کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے بعض شعراء اپنے تخلیقی اظہار میں اتنے ہی کامیاب ہیں جتنے ادب کے مرکزی دھاروں کے اہم شعراء کامیاب ہیں۔ آفتاب حسین (آسٹریا)، افضل عباس (ناروے)، فیصل ہاشمی (ناروے)، جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)، جمشید مسرور (ناروے)، ناصر نظامی (ہالینڈ) کے نام ان کی بعض شعری تخصیصات کی بنیاد پر اردو کے اچھے شاعروں میں لئے جا سکتے ہیں۔

آفتاب حسین اردو کے نوجوان غزل گو ہیں۔ان کی ایک شہرت پاکستان سے اٹل بہاری واجپائی کی شاعری کا اردو ترجمہ "جنگ نہ ہونے دیں گے" شائع کرنے والے ناشر کی ہے۔اس کا دیباچہ بھی انہوں نے ہی لکھا تھا تاہم وہ ایک الگ موضوع ہے۔بطور شاعر ان کا ایک شعری مجموعہ "مطلع" پاکستان اور انڈیا دونوں ممالک میں چھپ چکا ہے۔ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں زود گو نہیں ہیں لیکن جتنا لکھتے ہیں عمدہ لکھتے ہیں۔ان کی غزل کو یورپ کے اردو شعراء کے سامنے ماڈل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

کلی کھلی تو اسی خوش سخن کی یاد آئی
صبا بھی اب کے چلی سوگوار کرتے ہوئے
یہ دل کی راہ چمکتی تھی آئینے کی طرح
گزر گیا وہ اسے بھی غبار کرتے ہوئے

....

ایسا نہیں کہ آٹھ پہر بے دلی رہے
بجتے ہیں غم کدے میں کبھی جلترنگ بھی

....

وہ بادِ تیز ہے کہ کہاں شعلۂ غمیں
نایاب ہو گیا ہے یہاں دودِ آہ تک

....

چیخ اٹھو کہ کرا ہو صاحب
دل دیا ہے تو نباہو صاحب

....

بھٹک رہا ہوں ادھر ادھر اور یہ سوچتا ہوں
ہزار رستے گماں کے بھی ہیں یقیں سے پہلے

دُکان دل بڑھاتے ہیں، حساب بیش وکم کرلو!
ہمارے نام پر جس جس کا بھی جتنا نکلتا ہے

آفتاب حسین کے یہ چند اشعار بذاتِ خود ان کی شاعری کا خوبصورت تعارف ہیں۔تاہم یہاں ان کے بارے میں جون ایلیا کی رائے پیش کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں:

''آفتاب حسین کھری اردو، ٹکسالی اردو بلکہ اردوئے معلیٰ کے شاعر ہیں۔مجھے ان کا کلام پڑھ کر اور اپنی غزلیں یاد کر کے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں لاہور میں پیدا ہوا تھا اور آفتاب حسین امروہے میں'' جون ایلیا کے ان الفاظ پر آفتاب حسین کا تعارف مکمل کرتا ہوں۔

افضل عباس ناروے میں مقیم نوجوان شاعر ہیں۔غزلیں اور نظمیں یکساں قدرت کے ساتھ کہتے ہیں۔پنجابی کے بھی عمدہ شاعر ہیں،اس لئے اردو میں چند عمدہ ماہیے بھی کہہ چکے ہیں۔اب تک ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں سے دو پنجابی شاعری کے اور دو اردو شاعری کے ہیں۔پنجابی مجموعوں کے نام''برف وچھوڑے''اور ''دھیاں دھیانیاں''اور اردو مجموعوں کے نام''لوحِ برف''اور''برف سرا''ہیں۔پہلے ان کی غزل کے چند اشعار:

عشق اک قرض ہے پہلے یہ ادا ہو جائے
پھر جو ہونا ہے وہی کرب و بلا ہو جائے

کوئی ملتا ہی نہیں عہدِ وفا کے قابل
میں نے سوچا تھا مرا عہد، وفا ہو جائے

....

برپا ہو کوئی کرب و بلا ملکِ جفا میں
اے اہلِ عزا شہر میں مروان بہت ہیں

مت مانگ مرے پاؤں سے ہجرت کی گواہی
اَے آبلہ پائی ترے احسان بہت ہیں

افضل عباس کی نظموں میں تین رنگ نمایاں ہیں۔ایک وطن سے دوری کا دکھ اور اس کی مختلف کیفیات،دوسرے ناروے کے برف زاروں سے محبت کی گرمی،اور تیسرے ترقی پسند رویے کا رنگ۔مجموعی طور پر ترقی پسند آہنگ ان کی بیشتر نظموں پر حاوی ہے۔ان کی نظم "لوحِ برف" کے چند اشعار کو یہاں پیش کئے دیتا ہوں:

سیمیں برف کے نگری بَن میں
برف میں گوندھے گورے تن میں

....

ناروی انگ نشیلے نین
مَن کو اک پل پڑے نہ چین

....

کھڑا میں تنہا برف کے بیلے
گاؤں نیلی بار کے ڈھولے

....

تَن رانجھا ، مَن ہیر سیال
برف کے بھیتر آگ خیال

افضل عباس کے ماہیوں میں بھی پنجاب سے ناروے تک کے رنگ یوں ملتے ہیں:

کڑوے کوئی سچ ماہیا
جوگی کا جوگ کہاں
عاشق ذات کے ہیں
برف میں پاؤ گے

ہم لوگوں سے بچ ماہیا

سانول سے لوگ کہاں

فیصل ہاشمی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔تاہم انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ان کی نظم نگاری نئے طرز احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔اختصار ان کی نظموں کی خصوصیت ہے۔ایک نظم "وقت کی دھول ہوں" ملاحظہ کیجئے:

"مجھے اب یقیں ہو چلا ہے/میں خلقت سے پیچھے کہیں رہ گیا ہوں/اور اب میں/زمانے کے قدموں سے/اپنے قدم کو ملانے کی کوشش میں تھک بھی چکا ہوں/جہاں بھیڑ میں/لوگ بہتے چلے جا رہے ہیں/وہاں پر/سڑک کے اس اگلے کنارے پہ رُک کر/فلک پر رواں/بادلوں سے الجھتی/رنگی خواب بُنتی نظر/کے تماشے میں مشغول ہوں میں/گزرتے ہوئے وقت کی دھول ہوں میں۔"

فیصل ہاشمی کی ایک غزل کے دو اشعار سے ان کے شعری رویے کی مزید پہچان ہو جاتی ہے:

جب خاک اڑاتا ہوا نیندوں کا سفر ہو
پھر کیوں نہ کسی اور ہی دنیا کا سفر ہو
یہ کیسی تمنا ہے کہ اس دشت میں فیصل
دریا ہو، کنارا ہو، سفینہ ہو، بھنور ہو

جمیل الرحمٰن تازہ کار شاعر ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ان کے انتخاب کی نوعیت کی وجہ سے کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ سکا لیکن اس کے بعد سے وہ مسلسل ارتقائی سفر کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔غزل میں ان کے شعری جوہر پوری طرح کھلتے ہیں۔ان کی غزلوں کے چند اشعار سے ان کے ہاں موجود شعری امکانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

کیفیتِ وصال ابھی تک ہے دھیان میں
ہم چاند پر تھے اور زمیں آسمان میں

رہائی کب دے طلسمِ نگاہ دیکھتے ہیں
کہ ملکِ سبز میں روزِ سیاہ دیکھتے ہیں

....

پاؤں نکلنے ہی نہیں دیتی زمانے کی ہوا
ہم جگر تھامیں کہ دستار سنبھالیں اپنی
دیکھ کر اس کو اچانک برے آنسو اُمڈے
اُس نے بھی ہنستے ہوئے کھول دیں بانہیں اپنی

....

وہ کیسی لہر تھی سینے میں جس کے سر اُٹھانے پر
سمندر نے مچایا شور دل کے آستانے پر

....

جمیلؔ آبلہ پائی سے پھول کھل اُٹھتے
پیمبروں کی نہ تھی بات اپنی ہجرت میں

....

مٹھی میں خواب کی ہوں ستارے تو کیا کریں
وہ چاند ہی کا عکس اتارے تو کیا کریں
نکلے تھے خود میں دشت و سمندر سمیٹنے
سنبھلے نہ ہم سے اپنے کنارے تو کیا کریں

....

ناصر نظامی کی اصل پہچان ان کی گیت نگاری ہے۔ مروجہ گیتوں کے انداز میں ان کے لکھے گیت کئی مقبول ٹی وی چینلز پر دکھائی دیتے رہتے ہیں لیکن ظاہر ہے اس شاعری کا ادب سے تعلق نہیں بنتا۔ ناصر نظامی نے اس انداز کی تھوڑی بہت غزلیں بھی کہی ہیں۔

دل کو بڑا ہی شوق تھا اونچی اُڑان کا
دھرتی کا ہی رہا ہے نہ اب آسمان کا

....

ہم سے اب چہرہ تمہارا نہیں دیکھا جاتا
جلتے سورج کو دوبارا نہیں دیکھا جاتا
جس کی تاروں کی ہر اک چال پہ ہے گہری نظر
اُس سے کیوں میرا ستارا نہیں دیکھا جاتا

....

آزاد پرندوں کی رُکتی نہیں پروازیں
دَم گھٹنے سے بہتر ہے، دَم اُڑ کے نکل جائے

تاہم ادبی طور پر ان کا بنیادی حوالہ اردو ماہیا بنتا ہے۔ پنجابی شاعری اور موجودہ موسیقی سے ہم رشتہ رہتے ہوئے انہوں نے ماہیے کو اس کی لوک لے کے ذریعے اختیار کیا اور اس میں اپنی زود گوئی کا کمال دکھا دیا۔ ابھی تک ماہیے کے جتنے مجموعے چھپ چکے ہیں ناصر نظامی کے ماہیوں کا مجموعہ ضخامت کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے۔ ۵۲۸ صفحات کے مجموعہ "یادوں کی بارش" نے اردو ماہیے کی برسات کردی ہے۔ ان کے چند ماہیوں سے ان کے عمومی انداز کو سمجھا جاسکتا ہے:

جنموں سے جیتے ہیں
دورِ تغیر کے
ہم پر کئی بیتے ہیں

ململ کا سوٹ لیا
پہلی نظر میں ہی
تم نے مجھے لُوٹ لیا

....

گھر واپس مڑنے میں
دیر تو لگتی ہے

شہروں میں رہتے ہیں
اپنے لگائے ہوئے

دل ٹوٹ کے بجھنے میں
پہروں میں رہتے ہیں

....

غم کس لئے کرتا ہے
سچائی سزا دے گی
جتنا دامن ہو
ناصرؔ سے تم کو
اتنا ہی بھرتا ہے
منصورؔ بنا دے گی

جمشید مسرور غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔"شاخ منظر" ۔"دیوار ہوا پر آئینہ"۔"میری خوشبوئیں، میرے پھول"۔"لمحوں کے سمندر" اور "پچھلے برس کی دھوپ"۔ان کی غزلوں کے چند اشعار سے ان کی غزل کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے:

جب حقیقت کھل گئی سب کچھ خیال و خواب ہے
رُوح کیوں پیاسی ہے پھر دل کس لئے بیتاب ہے

....

جذبہ و احساس کی دولت جہاں نے لوٹ لی
شعر اب کیا ہیں خیالِ خاطرِ احباب ہیں

....

ہو وصل کہ تنہائی کم آمیز بہت ہے
وہ رنگ عنایات سبک خیز بہت ہے
عادی ہے برا گھر بری ہجرت کا ولیکن
یہ موجۂ گرداب سفر تیز بہت ہے

....

ہٹ کے اس رہ سے جو ہے وقف بس انکار کے نام
آؤ پھر شعر کہیں گیسوئے دلدار کے نام

جمشید مسرور کی ایک نظم ''منتظر'' سے ان کی نظموں کا انداز کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

''عکسِ محبوب مہکتا ہی چلا جاتا ہے/شمع رُخسار لئے وعدۂ دلدار
لئے رجتِ چشم ولب یار سے خورشید بکف/جاں کی تنہائی میں قندیل صبا
اترے گی/نور سے دکھ کے سیہ راستے ڈھل جائیں گے/رہگزاروں کی
جبینوں سے گھٹا اترے گی/ذہن سے رُوح کی ویران گزرگاہوں
تک/نکہت ورنگ کے گلبار دریچے آخر/شوق کی دستکِ بے تاب سے
کھل جائیں گے/اسی امید میں شاید کوئی جھونکا آئے/اور چپکے سے کوئی
درز، کوئی چاک کھلے/چاندنی دل کے کواڑوں سے لگی بیٹھی ہے''۔

ان شعراء کے علاوہ بھی چند شعراء ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری ہے☆۔ان میں سویڈن سے جمیل احسن، ہالینڈ سے احسان سہگل، جرمنی سے راجہ یوسف اور طاہر مجید، اٹلی سے ارشد اقبال آرش، ناروے سے مسعود منور، ڈنمارک سے نصر ملک اور ترغیب بلند نقوی وغیرہ شامل ہیں۔ جرمنی سے نعیمہ ضیاء الدین بطور شاعرہ بھی چھپتی رہتی ہیں۔ان کا اولین شعری مجموعہ ''کربِ ذات'' ان کی بطور شاعرہ تفہیم میں بنیادی اور کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔☆☆

افسانہ نگاروں میں ہرچرن چاولہ (ناروے)، نصر ملک (ڈنمارک)، منیر الدین احمد (جرمنی)، سعید انجم (ناروے)، اہمیت کے حامل ہیں۔ ہرچرن چاولہ تو افسانہ نگاروں کی مین سٹریم کے اہم افسانہ نگار تھے۔انہیں مغرب یا ناروے کی علاقائی حد بندی کے بغیر اردو ادب کے اہم افسانہ نگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ان کی ساری تصانیف کا ریکارڈ شاید پیش نہ کرسکوں تاہم ان کی فکشن کی کتابوں کے جو نام مجھے ملے ہیں پیش کئے دیتا ہوں۔ پانچ افسانوی مجموعے ''عکس اور آئینے''۔ ''ریت سمندر اور جھاگ''۔ ''آتے جاتے موسموں کا سچ''۔ ''دل، دماغ اور دنیا''۔ ''ہرچرن چاولہ کے منتخب افسانے'' اور چار

ناول ''درندے''۔ ''چراغ کے زخم'' ۔ '' بھٹکے ہوئے لوگ''اور ''آگے سمندر ہے'' ۔یہ تصانیف اردو فکشن میں ہرچرن چاولہ کے گرانقدر اضافہ کا ثبوت ہیں۔یورپ میں ایشیائی تارکین وطن جس ثقافتی تصادم کے المیہ سے دوچار ہیں اس کی بھرپور نمائندگی ہرچرن چاولہ کے افسانہ ''گھوڑے کا کرب'' سے ہوتی ہے۔اسے ان کا نمائندہ افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

سعید انجم کا افسانہ ''جھوٹ سچ'' بھی اپنی فنی مہارت اور موضوعاتی اہمیت کے لحاظ سے تارکین وطن کے ثقافتی تصادم سے پیدا ہونے والی المناک صورتحال کو عمدگی سے اجاگر کرتا ہے۔سعید انجم کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوئے۔''سب اچھا ہو گا'' اور ''سوتے جاگتے'' ۔ایک اور مختصر سا مجموعہ ''سوچیں'' بھی چھپا تھا۔وہ فکری طور پر ترقی پسند رجحان رکھتے تھے ۔ان کے زیادہ تر افسانے ترقی پسند آہنگ میں لکھے گئے۔''جھوٹ سچ'' جیسا دھیما پن بہت کم افسانوں میں ملتا ہے۔

منیر الدین احمد کے دو افسانوی مجموعے ''زرد ستارہ'' اور ''جنتِ حرام'' شائع ہوئے ہیں۔ایک اور مجموعہ ''شجرِ ممنوعہ'' بھی ہے۔جس میں نثرانوں اور نظمانوں کے ساتھ افسانے بھی شامل ہیں۔منیر الدین احمد نے ایک عرصہ تک اردو کو یکسر چھوڑ کر اپنی توجہ جرمن زبان پر مرکوز کئے رکھی ۔اس کے نتیجہ میں انہیں جرمن زبان و ادب کی تفہیم میں تو بہت آسانیاں ہو گئیں اور وہ ترجمہ کا کام عمدگی سے کرنے لگے ۔تاہم جب طویل عرصہ کے بعد انہوں نے اردو میں کہانیاں لکھنا شروع کیں تو اردو سے طویل قطع تعلق کے باعث ان میں وہ تخلیقی روانی پیدا نہ ہو سکی ۔اسے میری بدقسمتی کہہ لیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے مجھے ایسے ہی لگتا ہے جیسے کوئی ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔جرمن زبان میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد اگر وہ جرمن زبان میں افسانے لکھتے تو شاید جرمن لوگ ان سے متاثر ہوتے، اس کے باوجود منیر الدین احمد کی مجموعی ادبی خدمات کے باعث انہیں بطور افسانہ نگار بھی یاد رکھا جانا چاہئے

نصر ملک کے افسانوں کے دو مجموعے ''ہوئے مر کے ہم جو رُسوا'' اور ''قسط در قسط زندگی'' چھپ چکے ہیں۔ان کے افسانوں میں مغرب میں مقیم ایشیائیوں کی جذباتی کشمکش بہت نمایاں ہے۔ان کا افسانہ ''کربِ تنہائی'' اس حوالے سے ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔جمشید مسرور کا افسانوی مجموعہ تو ابھی تک شائع نہیں ہوا تاہم ان کے کئی افسانے ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں۔جمیل احسن نے بھی چند افسانے لکھے ہیں۔نعیمہ ضیاء الدین کا افسانوی مجموعہ ''منفرد افسانے'' شائع ہو چکا ہے۔تاہم ان کے دو افسانوں ''کاغذ کی کتاب'' اور ''گیان'' کو ان کے نمائندہ افسانے سمجھنا چاہیے۔

اوپر میں جن شاعروں اور افسانہ نگاروں کا ذکر کر چکا ہوں ان میں سے بعض تو بلا شبہ ادب کے مرکزی دھارے کے اہم لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔تاہم یورپ میں اردو ادب کی عمومی صورتحال کے بارے میں میری بڑی واضح رائے ہے۔میں نے دو سال پہلے اپنے ایک مضمون ''تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر'' میں جو کچھ لکھا تھا میرے نزدیک اب بھی وہی صورتحال ہے سو اپنے اسی مضمون کے ایک متعلقہ اقتباس کے ساتھ اپنے اس مضمون کو مکمل کرتا ہوں۔

''وہ شاعر اور ادیب جو مغربی ممالک میں طویل قیام کی پہچان رکھتے ہیں اور دلجمعی کے ساتھ ادبی خدمت میں مشغول ہیں،ان سب کی ادبی پہچان ادب کے مرکزی دھارے کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔مغربی ممالک کی تخصیص کے ساتھ ان کی انفرادیت ادبی طور پر سامنے نہیں آتی۔مثلاً شاعری میں ابھی تک روایتی اور ترقی پسند انداز کا ملا جلا رنگ رائج ہے۔البتہ کبھی کبھی یادِ وطن کے حوالے سے بعض اچھے اشعار ضرور سامنے آجاتے ہیں۔یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع ہجرت یا ترکِ وطن ہے۔اس موضوع پر بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔لیکن ہجرت کے موضوع پر ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں جس مائے کی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں،مغرب کے ہمارے اردو افسانہ نگار

اس سطح کو مس بھی نہیں کر سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے دلوں میں گہرے گھاؤ پیدا کئے تھے۔ سب دکھی تھے۔ جبکہ مغرب میں آ بسنے والے وطن سے زیادہ آرام کی دنیا میں آتے ہیں۔ یہاں کا کھلا ماحول انہیں شاید ان کیفیات سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتا جو تخلیقی کرب کا لازمہ ہے۔ مغربی چکا چوند میں جنس نگاری کی طرف رغبت فطری بات ہے۔ لیکن اس میں بھی خرابی یہ ہوئی کہ منٹو، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی اس حوالے سے جتنا کچھ اردو کو دے گئے ہیں، اس کے بعد مغرب کے اردو افسانہ نگار جنسی لذت تو کشید کر لیتے ہیں لیکن فن کی اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے جو ایک معیار کے طور پر پہلے سے اردو میں موجود ہے۔ افسانے کی دنیا میں جہاں ہمیں اپنے ثقافتی تصادم کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جہاں مختلف ثقافتی المیے سامنے آتے ہیں وہاں چند اچھی کہانیوں نے تبدیلی کا احساس دلایا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ تاہم ثقافتی تصادم کی عام کہانیاں بھی اخباری رنگ میں زیادہ بیان کی گئی ہیں یا پھر خواتین کے زیب النساء طرز میں لکھی گئی ہیں۔ مغرب میں شاعروں اور ادیبوں نے مغربی سائنسی ترقیات اور جدید تر صورتحال کو تا حال گہری اور تخلیق کار کی نظر سے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات سے ان کے افسانے خالی ہیں۔ اس کے باوجود وہ سارے اوریجنل تخلیق کار داد اور تحسین کے مستحق ہیں جو پردیس میں بیٹھ کر اپنے دیس کی زبان کو نہ صرف یاد رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کی محبت میں اپنی بساط کے مطابق تخلیقی کام بھی کئے جا رہے ہیں۔ ان سب کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔"

(دوسرا رُخ)

مضافاتی ادیب اور شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک قسم تو وہ ہے جو مضافات میں ایک بادشاہ سلامت کو امورِ مملکت چلاتے چلاتے شاعری کرنے کا شوق چرایا۔ بادشاہ سلامت نے کچھ اوٹ پٹانگ قسم کی شاعری کی اور شومیٔ قسمت۔۔۔ ایک شاعر کو اپنے دربار

میں طلب فرمالیا۔ اسے اپنا کلام سنایا اور اس کی رائے معلوم کی۔ شاعر نے ادب کے ساتھ اور ادبی زبان میں بادشاہ سلامت کو باور کرایا کہ آپ کا کلام موزوں نہیں ہے، ادھیڑ عمری میں شاعری کا آغاز ویسے بھی کچھ فطری سا نہیں لگتا، اس لیے بہتر ہے آپ اچھے شاعروں کو پڑھ کر لطف لیا کریں، خود شاعری نہ کریں۔

گستاخ شاعر کی رائے سنتے ہی بادشاہ سلامت غیظ وغضب میں آ گئے اور حکم دیا گیا کہ اس بدبخت شاعر کو زنجیروں میں جکڑ کر داخلِ زنداں کیا جائے اور مکمل قیدِ تنہائی میں رکھا جائے۔ حکم پر عمل درآمد ہو گیا۔ چھ مہینے یا ایک سال کے بعد بادشاہ سلامت نے پھر اس شاعر کو دربار میں طلب کیا۔ اس بار شاعر پابہ زنجیر دربار میں لایا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنا تازہ کلام سنا کر پھر اس شاعر سے رائے طلب کی۔ اس بار شاعر کوئی رائے دینے کی بجائے جس رستے سے آیا تھا، اُسی رستے کی طرف مڑ کر چلنے لگا تو بادشاہ سلامت نے گرج کر پوچھا میری اجازت کے بغیر کہاں جانے لگے ہو؟

شاعر نے گردن موڑ کر بے نیازی کے ساتھ جواب دیا: اُسی قید خانے میں واپس جا رہا ہوں جہاں آپ نے پہلے بھیج رکھا تھا کیونکہ آپ کی شاعری کے بارے میں میری رائے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔

یہ لطیفہ صرف ایک بادشاہ اور ایک گستاخ شاعر کا ہے جبکہ یہاں مغربی دنیا میں اردو ادب کا جو حال ہے اس کے مطابق یہاں بے شمار بادشاہ لوگ شاعر ہیں اور اتنے بادشاہوں کے بیچ میں اکیلا گناہگار سزا اور ملامت ہوں۔ شاعری کے بادشاہوں کے دوش بدوش نثر نگاروں کے بادشاہ بھی سامنے آ رہے ہیں۔ ایسے لوگ جو اپنے گھر میں خطوط کے ذریعے اپنی خیریت اور اداسی کا حال لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ادھیڑ عمری کے بعد انہوں نے بھی نثر نگاری کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار کر لی اور اس میں بھی اپنا رویہ وہی شاہانہ اختیار کیا جو شاعری کے بادشاہ لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ یعنی کوئی بھی اعلیٰ ترین نثر نگار سے کم

نہیں ہے۔ کسی کو مبتدی کہنا اس کے لیے گالی ہے۔ حالانکہ بیشتر مبتدی کہلانے کے مستحق بھی نہیں ہیں۔ ایسے شاہانہ رویوں کے بارے میں اور ایسے بادشاہوں کے بارے میں جتنا کچھ لکھ چکا ہوں، یہاں اپنی مختلف تحریروں سے چند اقتباسات یکجا کر دیتا ہوں۔ مختلف وقتوں میں لکھی گئی یہ تحریریں یکجا ہونے سے ان سب کا ایک مجموعی تاثر بھی سامنے آ جائے گا اور میں یہاں کے ادبی بادشاہ لوگوں سے یہ کہہ سکوں گا کہ بادشاہ بھائی! میں نے نیا تو کچھ نہیں لکھا، وہی پرانی باتیں دہرائی ہیں۔ بہر حال میرے چند اقتباسات یہاں پیش خدمت ہیں۔

''ایک زمانہ تھا جب مشاعرہ کا ادارہ دوہری افادیت کا حامل ہوتا تھا۔ یہ ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ بھی تھا اور نئے لکھنے والوں کی تربیت گاہ بھی تھا۔ اس دور کے گزرنے کے بعد ادبی رسائل کی صورت میں وسیع ذریعۂ ابلاغ سامنے آیا جو ادبی تربیت گاہ کا کردار بھی مشاعرہ سے کہیں بہتر کرتا ہے۔ اس کے باوجود مشاعرہ کی روایت کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ مجھے مشاعرہ بازی کی مخالفت نہیں کرنی لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ادارہ اپنی ادبی افادیت کھو چکا ہے اور ادبی حوالے سے اس کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ ثقافتی میلے کی صورت میں یہ بے شک چلتا رہے۔

ادب کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے کی بجائے کمی آ رہی ہے۔ مادہ پرستی کے غلبہ سے لے کر ٹی وی چینلز تک اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن ایک بڑا سبب خود ادیبوں کی ادب سے بے توجہی ہے جو ادبی شعور کی کمی یا ادبی شعور نہ ہونے کے باعث ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ عموماً شاعروں کو شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف سے مطالعہ کی حد تک بھی کوئی رغبت نہیں رہی اور ایسی ہی صورتحال دوسری اصناف کے لکھنے والوں کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی ادب سے وابستگی کی یہی نوعیت ہے۔ اور تو اور شاعری میں بھی یہ حال ہے کہ اپنی

ناک سے آگے کسی کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ یہ سارے رویّے خود ادیبوں کی ادب سے بے رغبتی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں قاری کی کمی کا رونا بے معنی ہو جاتا ہے۔ سو میرے خیال میں عوام میں یا اردو کے قارئین میں ادب کا ذوق پیدا کرنے سے پہلے خود ادیبوں اور شاعروں میں ادب کا ذوق پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر ادب کے سنجیدہ قاری بنیں۔ ان کے اندر Sense of Literature پیدا ہو اور اس کی جھلک دکھائی بھی دے۔ مغربی ممالک میں مقیم اردو کے شاعروں اور ادیبوں میں اس کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔ میں یہ بات کسی پر طنز کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقتاً یہ ہمارے ادب کا سنگین مسئلہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جعلی شاعروں اور ادیبوں کی ایک کھیپ تیار ہو چکی ہے۔ یوں اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ مارکیٹنگ سسٹم کی طرح ادب میں بھی نمبر دو مال کو اوریجنل ادب کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے لئے سنجیدگی سے اور بہادری کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے معاملات میں ذاتی دوستیوں اور تعلقات کے مقابلہ میں ادب کو اوّلیت اور اہمیت دینا بے حد ضروری ہے۔''

(مطبوعہ: مجلّہ ملینیم اردو کانفرنس ۲۰۰۰ء۔ انگلینڈ)

''اس المیہ کا ذکر بھی یہاں ناگزیر ہے کہ مغربی ممالک میں جعلی شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ پیدا ہو چکی ہے۔ تارکینِ وطن میں سے ایک قابلِ ذکر تعداد ایسے افراد کی ہے جو ایک عرصہ سے مغربی ممالک میں آباد ہیں۔ یہاں کے بڑے مشاعروں میں یہ عبرتناک منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ کم از کم ایک تہائی شاعر مکمل بے وزن کلام سنا رہے ہوتے ہیں اور داد پا رہے ہوتے ہیں۔ رزق کی فراوانی اور نام آوری کے شوق میں بعض نے تو بے وزن شاعری کے مجموعے بھی فخر کے ساتھ چھپوا رکھے ہیں۔ ایسے لوگ جتنا ہوتے ہیں اتنا

سمجھ میں تو آ جاتے ہیں۔لیکن ان کے دوش بدوش اب ایسے شعراء کی کھیپ تیار ہو چکی ہے ،جو چالیس ، پچاس سال کی عمر کے بعد یکایک شاعر بن کر نمودار ہوتے ہیں اور دو برسوں میں ان کے تین چار مجموعے چھپ کر سامنے آ جاتے ہیں۔ پاکستان اور انڈیا میں ایسے ضرورت مند استاد شاعر موجود ہیں جو معقول معاوضہ پر پورا شعری مجموعہ لکھ کر دے دیتے ہیں۔ جعلسازی کے فروغ کے اس خطرناک رجحان پر بروقت گرفت نہ کی گئی تو یہاں اصل اور نقل کا فرق کرنا ہی مشکل ہو جائے گا۔یہ اردو ادب کا جنازہ نکالنے والا کام ہو رہا ہے۔“

(مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد۔شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

”آج کل شاعری میں جو نئے شعراء،شاعرات آ رہے ہیں ان میں سے اوریجنل لوگوں کو چھوڑ کر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو سرے سے شاعر تو کیا متشاعر بھی نہیں ہیں۔خصوصاً ادھر مغربی ممالک میں تو اب یہ عالم ہے کہ کوئی بندہ ہو یا بندی،ایک مصرعہ تک کہنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے بھی راتوں رات صاحب کتاب بن جاتے ہیں۔پہلے پہل متشاعروں نے بے وزن شعری مجموعے طمطراق سے چھپوائے لیکن بعد میں انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے انجام سے عبرت پکڑتے ہوئے شاعری کا شوق رکھنے والے غیر شاعروں نے شاعر بننے کا کامیاب نسخہ دریافت کر لیا ہے۔انڈیا اور پاکستان میں ایسے پُرگو اور استاد قسم کے شعراء کی کمی نہیں ہے جو معقول معاوضہ پر پورا مجموعہ لکھ دیتے ہیں۔سو ان کی برکت سے ایسے لوگ جو ایک مصرعہ بھی وزن میں نہیں لکھ سکتے،پورے مجموعوں کے مالک بن گئے ہیں۔انڈیا یا پاکستان کا ایک سفر کیا جاتا ہے اور ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے۔یوں مجموعوں پر مجموعے آ رہے ہیں۔“

(اقتباس از تاثرات مطبوعہ شعری مجموعہ مٹھی بھر تقدیر مطبوعہ جنوری ۲۰۰۲ء)

''سوال۔ دیارِ مغرب میں شعروادب کی صورتحال کیسی ہے؟

جواب۔ ادب کی دو لائنیں ہمارے پورے ادبی منظر میں موجود ہیں۔ایک تخلیقی اور اکیڈمک لائن اور دوسری شو بزنس کی لائن۔مغربی ممالک کے بیشتر شعراء ادب کی شوبز لائن سے تعلق رکھتے ہیں۔مشاعرہ بازی' کتابوں کی رونمائیاں اور ریڈیو ٹی وی کے پروگرام اسی لائن کی چیزیں ہیں۔ویسے کبھی کبھار اس لائن میں کوئی اچھی چیز بھی آجاتی ہے۔دوسری اکیڈمک اور تخلیقی لائن ہے۔اس میں ہمارے ہاں بہت کم لوگ ہیں۔ڈاکٹر گیان چند جین' ڈاکٹر ستیہ پال آنند' شان الحق حقی' ساقی فاروقی' ہرچرن چاولہ' جیسے لوگ اس زمرہ میں آتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کا بنیادی مسئلہ ادب نہیں بلکہ وطن کی اداسی ہے۔سو اسی یادِ وطن میں لکھ لکھا (''لکھ'' کم اور ''لکھا'' زیادہ) لیتے ہیں۔اور خود ہی اپنے اعزاز میں تقریبات کرا کے خوش ہو لیتے ہیں۔یہاں مشاعروں میں ایک تہائی سے زیادہ شعراء دھڑلے سے بے وزن کلام سناتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔اسی سے ادب کی صورتحال کا اندازہ کرلیں۔بعض شعراء اور شاعرات بے وزن شاعری کے مجموعے بھی چھپوا لیتے ہیں اور بعد میں انہیں چھپاتے پھرتے ہیں۔ویسے وہ گروہ ان سب سے بازی لے گیا ہے جو ایک مصرعہ لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن نقد ادائیگی کے نتیجہ میں اپنے نام سے پورا شعری مجموعہ چھپوا لیتا ہے اور اسی پیسے کے بل پر بھرپور تقریبات کا اہتمام بھی کرلیتا ہے۔مالی رشوت کے ساتھ بعض شاعرات کے معاملہ میں جمالی رشوت کے چرچے بھی سننے میں آرہے ہیں۔''

(ڈاکٹر صابر آفاقی کے مئی ۲۰۰۰ء میں جرمنی میں لیے ہوئے انٹرویو سے اقتباس۔

مطبوعہ سہ ماہی ادبِ عالیہ پاکستان۔شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء)

''جواز جعفری۔ مغرب میں تخلیق پانے والے اردو ادب کے بڑے موضوعات

کیا ہیں؟

حیدر قریشی ۔ مغرب میں تخلیق ہونے والا اردو ادب ہمارے ادب کے مرکزی دھارے ہی کے تابع ہے۔ یہاں بعض لوگوں نے جنسی چکا چوند یا پھر فیشن زدہ دہریت کو اپنا موضوع بنانے کی کوشش کی تھی۔ جبکہ ان حوالوں سے اردو میں پہلے ہی سے زیادہ اہم کام ہو چکا ہے۔ تارکینِ وطن کو درپیش معاشرتی مسائل پر زیادہ تر اچھا لکھا گیا ہے تاہم ہجرت کے مسئلہ کی سطح پر کوئی بڑی چیز سامنے نہیں آئی۔ جیسے انتظار حسین کے ہاں ایک سطح ہے۔ یا جیسے قیام پاکستان کے نتیجہ میں دونوں طرف ہجرت کی اچھی کہانیوں کی جو سطح ہے وہ یہاں خال خال ہی ملتی ہے۔ مغرب میں آنے کے نتیجہ میں ہم لوگ جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے کچھ نیا پیش کر سکتے تھے۔ اس معاملہ میں کوئی اہم تخلیق کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ ایک افسانہ نگار نے کمپیوٹر کے حوالے سے بہت عمدہ کہانی لکھی لیکن بعد میں پتہ چلا وہ سرقہ تھا۔ چوری پکڑی گئی۔ خود میں نے ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کو موضوع بنا کر جو تین افسانے لکھے ہیں وہ میرے پاکستانی دور کی عطا ہیں جبکہ مغرب میں آ کر تو میں اور بھی زیادہ دیسی ہو گیا ہوں۔ بہر حال میری نظر میں اردو ادب کے مرکزی دھارے سے ہٹ کر مغرب میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہے۔

جواز جعفری ۔ یورپ اور امریکہ میں تخلیق پانے والا اردو ادب برِ صغیر کے ادب سے کس حد تک مختلف ہے؟

حیدر قریشی۔ کسی حد تک بھی نہیں۔ یہاں کی عمومی صورتحال تو یہ ہے کہ لکھنے والوں کا زیادہ زور شاعری پر ہے۔ اس میں بھی دولت کے بل پر پاکستان اور انڈیا سے شعری مجموعے لکھوانے اور چھپوانے والے شعراء کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پچاس سال کی عمر کے بعد یکایک کوئی شاعر نمودار ہوتا ہے اور دو برسوں میں چار شعری مجموعے چھپوا کر علامہ اقبال بن جاتا ہے۔ یہاں کے بڑے مشاعروں میں بے وزن شعراء دھڑلے

سے نہ صرف بے وزن کلام سناتے ہیں بلکہ داد بھی پاتے ہیں۔ جو گنتی کے چند شاعر اور ادیب اچھا لکھ رہے ہیں وہ مغرب کے حوالے سے کوئی الگ تشخص نہیں رکھتے۔ ان کی ساری پہچان اردو ادب کے مرکزی دھارے میں ہی بنتی ہے۔

جواز جعفری ۔ آپ اپنے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

حیدر قریشی ۔ ایک درخواست کروں گا کہ مجھے یورپ اور امریکہ میں مقیم شاعر اور ادیب شمار کرنے کے بجائے اردو ادب کا شاعر اور ادیب سمجھیں۔ پھر بے شک مجھے ادب کی آخری صف میں بٹھادیں، بے شک صفوں سے پرے جوتوں میں بٹھادیں۔ یورپ اور امریکہ میں اتنے جعلی شاعر اور ادیب پیدا ہو گئے ہیں کہ اس حوالے سے اپنی پہچان سن کر یا پڑھ کر اب شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ میں جرمنی آنے سے پہلے کا شاعر اور ادیب ہوں۔ یہاں آ کر شاعر اور ادیب نہیں بنا۔

(جواز جعفری کا لیا ہوا تحریری انٹرویو مطبوعہ مئی ۲۰۰۳ء کو اردو ستان ڈاٹ کام و سہ ماہی ''اسباق'' پونہ شمارہ: جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء)

''۵۱۔ کیا اردو کی نئی بستیوں کا ادب ذکر کے قابل نہیں؟

☆ ادب کے مرکزی دھارے سے کٹ کر کسی کا کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہے۔ نئی بستیوں کے حوالے سے جانے جانا ''کوٹہ سسٹم'' کے تحت ادیب بنتا ہے۔

۵۲۔ کیا یورو، ڈالر کے بل پر نام نہاد قلم کار خود کو منوا رہے ہیں؟

☆ ان بیچاروں کو کیا مانا جاتا ہے۔ لیکن بہر حال یہ بدبختی کی بات ہے کہ غیر جینوئن اور جعلی لوگوں پر کتابیں لکھوانے اور چھپوانے کا کاروبار چل نکلا ہے۔ ہندو پاک میں جو لوگ جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو پروجیکٹ کر رہے ہیں وہ درحقیقت ادب کے نام پر ''دھندہ'' کر رہے ہیں۔

۵۳۔ کیا اردو کی ان بستیوں میں جعلساز، نام نہاد قلم کاروں کا زور بڑھ رہا ہے؟

☆ یقیناً ایسا ہو رہا ہے۔ پہلے غیر جینوئن شاعر اپنی بے وزن کتابیں فخر سے چھپوالیتے تھے۔ میں نے ان کے خلاف مہم چلائی تو ان کے حامیوں کا ایک جعلی ٹولہ ابھر کر سامنے آ گیا۔ یہ لوگ بے وزن شاعر بھی نہیں ہیں۔ صرف نقد ادائیگی کر کے پورے شعری مجموعے مطبوعہ صورت میں حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے جعلی شاعر جرمنی سے لے کر امریکہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ ان سب کو بے نقاب کریں میں خود ایک ایک کی نشاندہی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ان کے اوریجنل یا جعلی ہونے کو جانچنا بھی کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔۔۔۔''

(افتخار امام صدیقی کے ۶۳ سوالات کے جواب۔ مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی۔ شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء)

''عارف فرہاد: ۔۔۔۔۔۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ جرمنی میں آ کر مجھے کوئی سنجیدہ ادیب آپ کے علاوہ نظر نہیں آیا بلکہ یوں کہیے کہ اگر شاعر ملا تو وہ وزن میں لکھنے والا نہیں ملا اس کی کیا وجہ ہے۔

حیدر قریشی: (ہنس کر) میں کیا کہہ سکتا ہوں بھئی، میں نے اس کی وجوہات پہلے بڑی وضاحت سے بیان کی تھیں اور بڑی گالیاں کھائی تھیں تو اگر آپ مجھے مزید گالیاں دلوانا چاہتے ہیں تو میں وجہ پھر کھول کر بتا دیتا ہوں۔

عارف فرہاد: جی ہم جاننا چاہیں گے۔

حیدر قریشی: بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں 20،25 سال سے آئے ہوئے ہیں، جوانی انہوں نے بھرپور گزار لی۔ مڈل ایج Crisis میں آئے اب۔ یہاں Well Establish ہو گئے۔ روٹی، روزی کی فکر نہ رہی۔ بچوں کے معاملات میں بھی ایک حد

تک آزاد ہوگئے تو اب انہیں یہ خیال آیا کہ نام کمانا چاہئے کسی طرح۔ پرانے زمانے میں لوگ پُل بنواتے تھے۔ کنواں بنواتے تھے۔ مدرسے بنواتے تھے۔ نام کمانے کیلئے یا ثواب کمانے کے لئے۔ اب ثواب کہیں پیچھے چلا گیا ہے اور نام کمانے کی یہ صورت رہ گئی ہے کہ شاعر بن جاؤ۔ اس میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ سادہ سے لوگ ہیں جو جیسی بھی بے وزن شاعری کرتے ہیں ایسے ہی اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں اور اس پر ہی فخر کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو نسبتاً سیانے ہیں اور وہ پلے سے پیسہ خرچ کر کے کتابیں لکھواتے ہیں اور چھپواتے ہیں۔ تو شاعر تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے جو میرے ایریے میں ہیں اور مجھ سے ملے ہوئے لوگوں میں سے جو صاحبِ کتاب بنے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی شاعر نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ ساری کرپشن پھیلانے میں ہمارے ہندوستان اور پاکستان کے بعض اساتذہ Type شعراء جو ہیں وہ برابر کے مجرم ہیں۔"

(عارف فرہاد کا لیا ہوا انٹرویو۔ مطبوعہ عکاس اسلام آباد شمارہ: اکتوبر ۲۰۰۵ء)

مارچ ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے، دراصل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی جانب سے اردو کی بستیوں پر خصوصی سیمینار کرایا گیا۔ اس میں نہ صرف کئی جعلی لوگ شریک ہوئے، بلکہ کئی جعلی لوگوں پر خصوصی مقالات لکھوائے گئے (اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے)۔ میں نے بوجوہ اس تقریب میں شمولیت سے معذرت کر لی تھی، البتہ نارنگ صاحب کی فرمائش پر اپنا مضمون لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اب حال ہی میں میری ان سے ای میل کے ذریعے کچھ بات چیت ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ یہاں تو اسی فی صد شاعر اور ادیب جعلی ہیں۔ (باقی بیس فی صد میں بھی کتنے ہیں جو جینوئن لکھنے والے ہیں اور کتنے ہیں جو بھرتی کے لکھنے والے ہیں، وہ ایک الگ موضوع ہے۔) یہاں مورخہ ۷ رجون ۲۰۰۵ء کو یعنی ایک ہی دن میں ہونے والی ہماری برقی خط وکتابت کا متعلقہ حصہ قارئین کی خدمت

میں پیش کر رہا ہوں۔میں نے اپنی ای میل میں لکھا:

''میں اردو کی نئی بستیوں کا قائل نہیں ہوں، یہ صرف جعلسازی کے گڑھ ہیں۔ یہاں دولت کے بل پر ۸۰ فیصد جعلی لوگ شاعر اور ادیب بنے ہوئے ہیں۔ یہ صورتحال اردو کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی اور بعض لوگ شاید یہی چاہتے ہیں''............اس کے جواب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے لکھا:

AZIZ-E-MAN ! I AGREE WITH YOU ENTIRELY THAT MOST OF THE PEOPLE CLAIMING TO BE WRITERS ARE NOT WRITERS AND ONLY 20% ARE GENUINE WRITERS. THAT EXACTLY IS WHAT I MEAN TO HAVE SOME ARTICLES ON THOSE GENUINE WRITERS.

یہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا،ان کی اس ای میل کے جواب میں اسی تاریخ کو میں نے پھر انہیں لکھا:''آپ کے سیمینار میں باہر سے شامل ہونے والوں میں سے،یا جن پر مقالے لکھوائے گئے تھے کئی لوگ یا تو جینوئن لکھنے والے نہ تھے یا ان کی چوری اور جعلسازی کھلی ہوئی حقیقت تھی''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ خود اکثر بیرون ممالک کے ادبی دوروں پر جاتے رہتے ہیں اور اسی حوالے سے سیمینار بھی کرا چکے ہیں اور کسی بھی پاکستانی یا ہندوستانی ادیب سے کہیں زیادہ وہ ان ''بستیوں'' کی اصل ادبی اور علمی حقیقت جانتے ہیں۔سو ان کا ماننا کہ ان بستیوں میں صرف بیس فی صد جینوئن لوگ ہیں،سند کا درجہ رکھتا ہے۔

(مکتوب حیدر قریشی مطبوعہ دو ماہی گلبن لکھنو شمارہ جولائی، اگست ۲۰۰۵ء)

''مغربی ممالک میں جہاں جہاں اردو کے چرچے ہیں، ان کے حوالے سے اردو زبان اور ادب کی بین الاقوامیت کا چرچا کیا جاتا ہے۔ اگر تو واقعتاً اردو زبان اور ادب بین الاقوامی حیثیت اختیار کر رہے ہیں تو بڑی خوش بختی کی بات ہے۔ لیکن اگر حقائق کچھ اور ہیں تو پھر خوش فہمیوں پر کچھ کہنا بے کار ہے۔

اس موضوع سے متعلق چند بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے پر صورت حال بہتر طور پر واضح ہو سکے گی۔

کیا مغربی ممالک میں مقیم اور اردو سے محبت کرنے والوں کی نئی نسلیں اردو سے اس حد تک منسلک ہیں کہ اردو لکھنا اور پڑھنا جانتی ہیں؟ اس سلسلے میں جو بھی قابلِ قدر کاوشیں ہوئی ہیں ان کا اب تک کیا نتیجہ نکلا ہے؟ اعداد و شمار کی زبان میں وضاحت کی جا سکتی ہے۔

کیا مغربی ممالک میں مقیم اردو والوں کی نئی نسل میں سے وہاں رہتے ہوئے اردو شعر و ادب سے کوئی تخلیقی نوعیت کی وابستگی سامنے آئی ہے؟ یعنی کیا مغربی ممالک میں نئی نسل میں سے کوئی شاعر اور ادیب سامنے آیا ہے؟

اگر ان دونوں بنیادی سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو اردو کی بین الاقوامی حیثیت کے دعووں کے باوجود صورتحال تشویشناک دکھائی دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان اور انڈیا سے مغربی ممالک میں آبسنے والے شاعر اور ادیب ہی یہاں ادبی سرگرمیوں کا سبب ہیں۔ اس میں مزید اضافہ شاعروں کی اس بڑی کھیپ سے ہو رہا ہے جو شاعر نہ ہو کر بھی نقد ادائیگی کر کے لکھے لکھائے اور چھپے چھپائے شعری مجموعے حاصل کر کے شاعر بن جاتے ہیں۔

اگر اس نوعیت کے شعراء کی تعداد میں اضافہ ہونا اور پاکستان اور انڈیا میں ان سے اپنے مفادات وابستہ رکھنے والی ''شاعر گر'' ادبی شخصیات کے مفادات کا پورا ہونا اردو ادب کا فروغ ہے تو پھر بے شک یہاں اردو ادب فروغ پا رہا ہے وگرنہ مغربی ممالک میں

اردو کے سلسلے میں ہونے والی زیادہ تر سرگرمیاں محض ثقافتی قسم کے میلے ٹھیلے جیسی ہیں۔

مغربی ممالک میں مقیم وہ شاعر اور ادیب جو بیرون ملک آنے سے پہلے سے اپنی ادبی شناخت رکھتے تھے، ان سے ہٹ کر باقی شاعروں اور ادیبوں کی عمومی صورتحال دیکھی جائے تو اس نام نہاد عالمی اردو ادب سے ''شاہ عالمی لاہور'' کا اردو ادب کہیں زیادہ معیاری دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے متعدد دوسرے شعبہ ہائے حیات کی طرح یہاں بھی اب نمبر دو قسم کے لوگ غلبہ پانے لگے ہیں۔ کتنا اچھا ہو کہ اردو اور ادب سے سنجیدہ وابستگی رکھنے والے شعراء و ادباء اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کھل کر بات کر سکیں۔''

(مطبوعہ اداریہ جدید ادب جرمنی۔ شمارہ نمبر ۷، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء)

میرا خیال ہے ان چند اقتباسات سے میرے موقف کے بارے میں بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کی ان نئی بستیوں کی حقیقت کیا ہے۔ اقتباسات کے سلسلہ میں آخر میں مثبت رنگ کا ایک اقتباس بھی دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ اتنا ہی مثبت ہے جتنا مجھے سمجھ میں آتا ہے۔

'' برصغیر سے باہر کی تمام پاکٹس میں جو لوگ اہم ادبی تقریبات کا اہتمام کرتے رہتے ہیں، ادب کے تئیں ان کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ یہ سلسلہ ماریشس سے لے کر دبئی تک اور لندن سے لے کر نیویارک تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح ان ساری پاکٹس میں جہاں جہاں سے اردو اخبارات و رسائل نکل رہے ہیں وہ اردو کی خدمت کی ایک صورت ہے۔ اخبارات رسائل، ادبی تقریبات یہ سب اردو کی چہل پہل اور رونق کا سبب ہیں۔ لیکن اگر خالصتاً ادبی سطح پر بات کی جائے تو مغربی ممالک میں تخلیقی سطح پر کوئی ایسا بڑا بریک تھرو دیکھنے میں نہیں آیا جس سے کہا جا سکے کہ اردو کے ادبی سرمایہ میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ گیان چند جین، شان الحق حقی اور اسی معیار کے دوسرے ادباء پاکستان اور

ہندوستان میں ہی اپنے میدانوں میں معتبر کام کر چکے ہیں۔ مغربی ممالک میں قیام پذیر ہونا ان کی شناخت نہیں ہے۔ وہ شاعر اور ادیب جو مغربی ممالک میں طویل قیام کی پہچان رکھتے ہیں اور دلجمعی کے ساتھ ادبی خدمت میں مشغول ہیں، ان سب کی ادبی پہچان ادب کے مرکزی دھارے کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔ مغربی ممالک کی تخصیص کے ساتھ ان کی انفرادیت ادبی طور پر سامنے نہیں آتی۔ مثلاً شاعری میں ابھی تک روایتی اور ترقی پسند انداز کا ملا جلا رنگ رائج ہے۔ البتہ کبھی کبھی یادِ وطن کے حوالے سے بعض اچھے اشعار ضرور سامنے آ جاتے ہیں۔

یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع ہجرت یا ترکِ وطن ہے۔ اس موضوع پر بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہجرت کے موضوع پر ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں جس پائے کی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں، مغرب کے ہمارے اردو افسانہ نگار اس سطح کو مس بھی نہیں کر سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے دلوں میں گہرے گھاؤ پیدا کیے تھے۔۔۔۔ سب دکھی تھے۔ جبکہ مغرب میں آ بسنے والے وطن سے زیادہ آرام کی دنیا میں آتے ہیں۔ یہاں کا کھلا ماحول انہیں شاید ان کیفیات سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتا جو تخلیقی کرب کا لازمہ ہے۔ مغربی چکا چوند میں جنس نگاری کی طرف رغبت فطری بات ہے۔ لیکن اس میں بھی خرابی یہ ہوئی کہ منٹو، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی اس حوالے سے جتنا کچھ اردو کو دے گئے ہیں، اس کے بعد مغرب کے اردو افسانہ نگار جنسی لذت تو کشید کر لیتے ہیں لیکن فن کی اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے جو ایک معیار کے طور پر پہلے سے اردو میں موجود ہے۔ افسانے کی دنیا میں جہاں ہمیں اپنے ثقافتی تصادم کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جہاں مختلف ثقافتی المیے سامنے آتے ہیں وہاں چند اچھی کہانیوں نے تبدیلی کا احساس دلایا ہے۔ مثلاً سعید انجم کا ”جھوٹ سچ“۔۔ ہرچرن چاولہ کا ”گھوڑے کا کرب“ اور قیصر تمکین کا ”اندھیری روشنی“۔۔۔۔ تاہم ثقافتی تصادم کی عام کہانیاں بھی اخباری

رنگ میں زیادہ بیان کی گئی ہیں یا پھر خواتین کے زیب النساء طرز میں لکھی گئی ہیں۔ مغرب میں شاعروں اور ادیبوں نے مغربی سائنسی ترقیات اور جدید تر صورتحال کو تا حال گہری اور تخلیق کاری نظر سے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات سے ان کے افسانے خالی ہیں۔ اس کے باوجود وہ سارے اور یجنل تخلیق کار داد اور تحسین کے مستحق ہیں جو پردیس میں بیٹھ کر اپنے دیس کی زبان کو نہ صرف یاد رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کی محبت میں اپنی بساط کے مطابق تخلیقی کام بھی کیے جا رہے ہیں۔ ان سب کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔"

(مطبوعہ ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد۔ شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

ابوالامتیاز ع۔س۔مسلم (دبئی)

بیرون ملک پاکستانی ادباء و شعراء کیا خدمات انجام دے رہے ہیں؟

یہ سوال اپنے بطن میں جس وسعت کا حامل ہے، اس کا جواب یا جائزہ اتنا ہی دشوار ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک کے سفر کی محرک بالعموم اعلیٰ تعلیم کی خواہش اور بہتر زندگی کی جستجو ہوتی ہے جو اکثر آزاد منشوں کے لیے میزبان ملک کے پاسپورٹ کے حصول پر منتج ہو کر رہ جاتی ہے۔ تاہم وطن عزیز کی یاد فطری طور پر دلوں میں کسک پیدا کرتی رہتی ہے، جس کی تسکین ادبی ذوق کے حامل خواتین و حضرات شعر و ادب میں تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح سلسلے سے سلسلہ جڑتا جاتا ہے اور اس تعلق خاطر سے مقامی تنظیمیں وجود میں آ کر یادوں کی خلا کو ایک حد تک پوری کرتی ہیں۔

تاہم خلیجی ریاستوں، سعودی عرب یا بعض دیگر مسلم ممالک میں پاکستانی ادباء و شعرا کی موجودگی کی اصل وجوہات، عام پاکستانیوں کی طرح، جہد للبقا، ملازمتیں یا کاروبار کے مواقع ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان میں سے بیشتر کی تعمیر و ترقی میں اہل پاکستان کی محنت و سعی فیصلہ کن بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں امارات کے

استقلال کے بعد ان ریگ زاروں کی قیامت کی گرمی میں کسی قسم کی سہولت کے بغیر یہ صرف پاکستانی جفاکشوں کی ہی محنت اور جذبہ تھا جنہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے صحراؤں میں سڑکوں اور فلک بوس عمارتوں کی تعمیر کی اور بیابانوں میں رشکِ فردوس شہروں کے شہر بسا دیئے۔

تیل اور گیس کے وسیع ذرائع کی دریافت نے ان ممالک کو وسائل کے وہ بے بہا خزائن مہیا کر دیئے کہ صدیوں کا سفر سالوں بلکہ مہینوں میں طے ہونے لگا، اور اس نقطۂ نگاہ سے ان ممالک کی افزائش و ترقی کئی یورپی، امریکی اور مشرق بعید کے ممالک کو مات کرتی نظر آتی ہے۔

تاہم حیرت، بلکہ ستم ظریفی ہے کہ دین، تاریخ اور فکر و نظر کے سرچشمے مشترک ہونے کے باوجود مقامی زبانوں، طرزِ معاشرت اور روایات کے باعث میزبان معاشروں اور مہمان کارسازوں اور ہنر کاروں (Expatriates) میں باہمی اختلاط اور میل جول کا تعجب انگیز حد تک فقدان ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ایک تو اہلِ پاکستان کی عربی زبان سے عدم واقفیت ہے، دوسرے تجارت یا سرکاری دفاتر میں انگریزی کا چلن عام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے اماراتی پاکستان میں حصولِ تعلیم یا پاکستانیوں سے میل جول کے باعث اردو زبان سے بخوبی واقف ہیں، لیکن یہ صرف عام بول چال تک محدود ہے۔ اس ضمن میں مملکتِ پاکستان کی جانب سے بھی کوئی مناسب و موثر حکمتِ عملی نظر نہیں آتی۔ مزید برآں قدرت کی فیض رسانی سے ان سرزمینوں پر کم عرصے میں اور کثرت سے جن کی بارش ہے جس کا اپنا سرور کچھ کم نہیں، اور دولت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، جس کا فائدہ زیادہ تر بھارت اور مغربی ممالک کے کارگزار اور ہنرمند اٹھا رہے ہیں۔

ایسے حالات میں کچھ پاکستانی ادباء و شعراء نے اپنے ذوقِ شعر و ادب کی تسکین

اور نشو و نما کے لیے حسب امکان اب سے کوئی ۳۰۔۳۵ سال پہلے چھوٹی بڑی ادبی نشستوں کی بنا ڈالی۔ علم و ادب کے فروغ کے علاوہ دیارِ غیر کی اجنبیت میں یہ محافل پاکستانی خاندانوں کے درمیان رابطے اور سماجی تعلقات کا ذریعہ بھی ثابت ہوئیں۔ ان کے منتظم اور قابلِ ذکر آغاز میں کراچی کے جناب وسیم احمد کو ایک پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ جناب مہدی انصاری نے نجی محافل کی میزبانی میں نہایت فیاضی سے کام لیا۔

یہ وہ دن تھے جب یہاں کسی ادبی یا شعری نشست تو کیا مجلسی نشست کا تصور بھی محال تھا۔ چند لوگوں کا ایک محفل میں جمع ہو جانا ہی سیاسی شکوک وشبہات اور پولیس کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا تھا۔ اور اگر یہ محافل رات گئے تک طویل ہو جاتیں تو سوال وجواب کے مراحل بعید از قیاس نہ تھے۔

پاکستانی ادباء وشعراء نے نہایت ہوشمندی اور احتیاط سے شعری محافل کے انعقاد کا آغاز کیا۔ دیکھتے دیکھتے ہی اہلِ ذوق نے گھروں میں نجی مشاعروں کی طرح ڈال دی۔ راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے متحدہ عرب امارات میں قیام اول (۱۹۷۸ تا ۱۹۹۵ء) کے دوران شارجہ میں اس کا غریب خانہ شعر و ادب کی محفلوں کے لیے ایک مرکزی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ محفلیں بہت معیاری اور قابلِ رشک ہوتی تھیں۔ حاضری اکثر اسی سے سو شعراء و ادباء و سامعین تک پہنچ جاتی، جن میں خواتین و حضرات ایک گھریلو ماحول میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے۔ اکثر محفلیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ دبئی، ابوظہبی، العین اور دوسرے شہروں کے شعراء بسا اوقات شب بسری کے لیے رک جاتے۔

ان محافل نے عام لوگوں میں بھی شعر و ادب کے ذوق کو جلا دی، اور نہ صرف شعر فہمی بلکہ شعر گوئی کے جذبے کی آبیاری بھی ہوئی۔ یہاں کے اوقاتِ کار کچھ ایسے تھے کہ شدید گرمی کے باعث بعد نماز ظہر تین چار گھنٹے کا وقفہ ہوتا تھا۔ طعام و آرام کے علاوہ

یہ فرصت مطالعہ اور فکر و تدبر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ چنانچہ بہت سے خواتین و حضرات نے شعر گوئی کی ابتداء اپنے یہاں کے قیام کے دوران کی اور ان میں سے کچھ کے مجموعے بھی شائع ہوئے۔

خود راقم الحروف کا حال یہ تھا کہ نظم و نثر کی دو کتب کا مصنف ہونے اور چھ سال تک ماہ نامہ ''نیا راہی'' کے اجراء اور ادارت کے باوجود، سولہ سال سے لکھنا اور پڑھنا دونوں ہی موقوف تھے۔ ماہ نامہ ''نیا راہی'' کے تجربے سے یہ سبق حاصل ہوا تھا کہ خود کفیل ہوئے بغیر آزادی تحریر و تقریر ممکن نہیں۔ دوسرے میرا سب سے بڑا بیٹا نیاز احمد ذہنی پسماندہ تھا، یعنی اس کی ذہنی عمر چار سال سے زیادہ نہ تھی۔ ملک بھر میں ذہنی پسماندگان کی تعلیم و تربیت کا کوئی ادارہ موجود نہ تھا، بلکہ اکثر طبی ماہرین بھی اس معذوری کی ماہیت سے پوری طرح آشنا نہ تھے۔ اللہ کی توفیق سے اس فقیر نے قدم آگے بڑھایا اور ذہنی پسماندگان کی تعلیم و تربیت کا اولین ادارہ سائنوسا (SCINOSA) ۱۹۶۰ء میں قائم کیا جو اللہ کے فضل سے اب ایک وسیع و معروف ادارے کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی پیروی میں اب بحمد اللہ پاکستان میں ڈیڑھ دو سو ادارے قائم ہیں۔

ان امور کی بنا پر یہ کڑا فیصلہ کرنا پڑا، کہ فی الحال صرف جہد للبقا اور سائنوسا کی ترقی کی طرف توجہ دوں۔ چنانچہ تقریباً سولہ سال خود اختیاری ادبی جلاوطنی میں گزرے، جن میں سب لکھنا پڑھنا موقوف رہا۔ اب شارجہ میں اوقات کار کے باعث کچھ فراغت نصیب ہوئی تو شعر و ادب کی زندگی کی از سر نو ابتدا ہوئی، جس میں شعر و ادب کی ان محفلوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شارجہ میں میرے قیام کا بیشتر زمانہ امارات میں ان محفلوں کے آغاز اور عروج کا دور تھا، اور اس سے پہلے یا بعد اس معیار اور پیمانے کی

نجی محفلیں امارات میں منعقد نہیں ہوئیں۔ اس سے کچھ حوصلہ مندوں نے کمرشل مشاعرں کی طرح ڈالی تو ہندوستان لیکن بالخصوص پاکستان سے شاعروں کی آمد سے یہ رونقیں وچند ہونے لگیں۔ تاہم اب اپنی ہیئت ترکیبی، کثیر اخراجات اور دیگر وجوہات کی بنا پر اکا دکا انعقادات کے استثناء سے یہ سلسلہ بھی تقریباً اختتام پذیر ہے۔

پاکستانی ادباء اور شعراء نے اپنے محدود ذرائع کے باوجود حتیٰ الامکان اردو زبان وادب اور اس کے معیار اور اس کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا، اور پاکستان کا نام روشن کیا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان ممالک بالخصوص امارات اور قطر نے اس خطے میں اردو شعروادب کی ترقی کے لیے مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ شعروادب کا شعور پیدا ہوا اور بہت سے نئے شعراء افق اردو پر ظاہر ہوئے اور ان کے متعدد مجموعوں اور نثری کتب نے ملک میں نام حاصل کیا۔ دبئی میں احمد ندیم قاسمی مرحوم کے اعزاز میں ایک بین الاقوامی مشاعرہ ترتیب دیا گیا، جس میں جرمن، چینی اور برطانوی سکالرز نے بھی شرکت کی۔ ہندوستان سے جگن ناتھ آزاد، پروفیسر کلیم عاجز اور فنا کانپوری شریک ہوئے۔ پاکستان میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے بھی تمام نامور شاعروں نے مشاعرے کی زینت بڑھائی۔

ان مشاعروں کے تقریباً وسطی دور میں مشہور شاعر و فنکار اطہر شاہ خاں جیدی کے بھائی محمد ہارون پاشا نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا تو ادباء و شعراء کے علاوہ یہاں مقیم قابل ذکر پاکستانیوں پر ایک ڈائرکٹری مرتب کر کے شائع کی۔ گزشتہ سال (۲۰۰۹ء) میں دبئی میں مقیم دو محبِ وطن پاکستانی صحافی حضرات شیخ محمد پرویز اور نوائے وقت کے بیورو چیف طاہر منیر طاہر نے زرِ کثیر اور محنتِ شاقہ صرف کر کے ''متحدہ عرب امارات کے ۱۰۰ معروف پاکستانی'' کے نام سے 250 صفحات پر مشتمل ان کے کوائف اور خدمات پر مبنی آرٹ پیپر پر ایک مصور کتاب شائع کی۔ حصہ اول میں 50 تذکرے ہیں اور حصہ دوم

مزید ۵۰ حضرات کے اسمائے گرامی پر مشتمل ہوگا۔

ان شعراء وادباء کو اردو ادب کی ترویج میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟

اردو زبان وادب کو خود پاکستان کے اندر اس وقت نازک حالات کا سامنا ہے۔ انگریزی زبان، اور پاکستان میں ٹی وی میڈیا کی یلغار نے اردو زبان کا جو حشر کیا ہے اس پر سوائے ماتم کے اور کیا اظہارِ خیال کیا جائے۔ کہیں دو شخص آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ایسے نہیں پائے جاتے جو خالص اردو زبان میں گفتگو کرتے ہوں۔ انگریزی زبان اور اردو کو ملا کر ایسی زبان ترکیب پارہی ہے کہ الامان والحفیظ۔ اس سے کہیں بہتر اردو زبان اور تلفظ ہندوستانی فلموں اور عام ٹی وی پروگراموں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ بے حسی کی حد یہ ہے کہ اردو زبان کے اعلانات رومن رسم الخط میں تحریر کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں بیرونِ ممالک پاکستانی شعراء اور ادباء سے کس موثر کردار کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

میرے خیال میں یہ ایسا مسئلہ ہے کہ وطن کے اندر اردو زبان کے عالموں اور اس سے محبت کرنے والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ پہلے گھر کی خبر لیں۔ ان اداروں کو خطوط، اخبارات یا میڈیا کے ذریعے سے اردو کے کفن دفن کو روکنے کی کوشش کریں، تاکہ آئندہ نسلوں کے لیے کچھ سرمایہ علم وادب اور روایات باقی رہ جائے۔

اور سچ پوچھیے تو اس کا اصل حل اردو زبان کو اس کے آئینی حق پر فائز کرکے تمام ملک میں ہر سطح پر فوری اور یکساں طور پر ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے نافذ کردیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ مزید بلا تاخیر کے سرکاری دفتری زبان کی حیثیت سے اس کا فوری نفاذ بھی ہوجانا چاہیے۔ اگر ہم منافقت سے کام نہ لیں تو جب تک اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کیا جائے گا وہ صحیح طور پر قومی زبان بھی کہلائے جانے کی مستحق قرار نہیں پاسکتی، اور نہ ہی ابلاغ عامہ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ تعلیم عام ہوسکتی ہے نہ ہی معیارِ تعلیم کی بلندی کا کوئی قابلِ حصول تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ اہداف صرف اسی زبان یعنی اردو میں حاصل کیے جاسکتے

ہیں جو ہم اٹھتے بیٹھتے اور باہمی میل جول کے لیے ہر وقت استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے عسکری ادارے میں حاضر سروس جرنیل اپنی پیشہ ورانہ کانفرنسوں میں اردو زبان میں ایسی روانی سے نقد و نظر کرتے ہیں کہ ان کی گفتگو فصاحت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے، بلکہ اس ضمن میں عسکری اصطلاحات کی تشریحی لغت، انگلش اور ملٹری ڈکشنری، دفاعی موضوعات پر ایک تکنیکی سہ ماہی مجلہ اور ہفت روزہ "ہلال" بھی اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ جس میں ہر قسم کے مضامین فصیح اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کی مطبوعات اس پر مستزاد ہیں۔

اگر ہم تریسٹھ (۶۳) سال میں اس قومی زبان کو جس نے غالبؔ، میرؔ، مومنؔ، انیسؔ، دبیرؔ، حالیؔ، شبلیؔ، سلیمان ندوی، علامہ اقبالؔ، مولانا آزادؔ، مولانا محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاںؔ، حفیظ جالندھریؔ اور محمد علی جناحؒ کی زبان سے پوری قوم کی ترجمانی کی، اور جس نے انگریزوں اور پورے ہندوستان کے غیر مسلموں کے مقابلے میں ہم کو آزادی کی جنگ میں سرفراز کیا...... جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بدر واحد کی جرات و بہادری اور قربانی کی یادیں تازہ کردیں...... اگر ہم نے انگریزوں اور امریکنوں اور آدھی انگریزی اور آدھی اردو بولنے اور دوغلی تہذیب کے پرستار آدھے تیتروں اور آدھے بٹیروں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اب بھی اپنی اساس...... اردو زبان کو نظر انداز کیے رکھا تو موجودہ پستی سے ایسے قعرِ مذلت میں گریں گے کہ قدیم نابود اقوام کی طرح:

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اغیار کے دباؤ پر یا ان سے مرعوب ہو کر انگریزی زبان کی ترویج و تعلم پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے کہ نہ صرف اردو زبان کا فکری ارتقاء ختم ہو جائے بلکہ وہ محکوم غلام (Native) لوگوں کی "مقامی" بولی بن کر رہ جائے۔ زبان کی بات تو الگ ہے جن ممالک نے "جدیدیت" کے زعم میں اپنے رسم الخط ہی بدل دے، ان کا حشر دیکھنا ہو تو ان کا سفر اور

تاریخی مقامات اور کتب خانوں کا مشاہدہ کر لیا جائے۔

پھر ہماری ۱۸۔۱۷ کروڑ کی آبادی میں انگریزی زبان کن طبقوں اور کتنے ہزار لوگوں کی ضرورت ہے جس کے لیے علم و ادب اور تحقیق و ابداع کے تمام کتب خانوں کو دیمک کی نذر کرنے کے لیے مقفل کر دیا جائے۔ میرے خیال میں ۰.۷ فیصد سے بھی کم لوگ ہوں گے جن کے لیے انگریزی ناگزیر ہو۔ باقی ۹۹.۳ فیصد پر یہ زبردستی مسلط کی جا رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ انگریزی بڑی حد تک بین الاقوامی رابطے کی ایک زبان ہے لیکن پاکستان سے باہر نکل کر یہ تصور بھی اتنا موثر نہیں رہتا۔ جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، دوست ملک چین اور اکثر عرب ممالک میں ویسے بھی پوری طرح کارگر نہیں۔ اس کے لیے ۹۹.۳ فیصد آبادی اور اس کی آئندہ نسلوں کو مستقل طور پر جاہل رکھنے میں کس قوم یا طبقے کی مصلحت ہے اور یہ "مقصد" انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بجائے ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کیا آئین و قانون کے مکمل نفاذ کے اس دور میں ہماری ہیئت حاکمہ اور سول سوسائٹی میں کوئی جرات مند، صاحب ہوش اور صحیح سوچ رکھنے والا مردِ حق نہیں (الیس منکم رجل رشید۔ ۱۱ ہود: ۷۸) جو آئین میں موجود اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے والی دفعہ کے عملی نفاذ کے لیے سپریم کورٹ کو متحرک کر سکے یا اتنے بنیادی مسئلے کا سپریم کورٹ خود ہی سو موٹو نوٹس لے۔

میرے مشاہدے کے مطابق اس وقت پاکستانی معاشرہ ایک ایسی انقلابی کروٹ لے رہا ہے کہ تحریر و تقریر کی آزادی، میڈیا اور سول سوسائٹی کی مشترکہ قوت کے بل پر یہ "اب یا کبھی نہیں" کا معاملہ ہے۔ کیا پاکستان کے شعراء و ادباء کا طبقہ اور سول سوسائٹی تحریکِ پاکستان اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے جذبے سے سرشار پھر اسی ہمت و جرات کا مظاہرہ

نہ کریں گے! میرے خیال میں وہ ضرور کریں گے اور وہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی ادباء و شعراء کو اپنا ہم قدم پائیں گے۔ ویسے ہی جیسے کشمیر کے زلزلے یا کسی بھی اضطراری صورت حال میں وہ ساتھ رہتے ہیں۔

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

اردو زبان اور شعر و ادب سے میری وابستگی تو الشاعر یولد ولا یصنع A Poet is born not made کے مصداق اوائلِ عمری ہی سے ہے۔ یہی وجہ ہے سنہ ساٹھ کے اواخر میں کہ ابھی میں کراچی یونیورسٹی میں ماسٹرز کر رہا تھا' میرا پہلا شعری مجموعہ "عشیرِ افکار" منصۂ شہود پر آ گیا۔ اُسی دوران ریڈیو پاکستان کراچی کے "بزمِ طلباء" پروگرام اور PTV کراچی کے ادبی پروگراموں کی میزبانی بھی کی۔ تعلیم مکمل ہونے پر والدین کے پاس واپس سعودی عربیہ چلے گئے۔ جہاں سعودی عربین ائرلائنز میں بیس سال تک ایک ذمہ دار عہدے پر ملازمت کی اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے دنیا بھر کے بیشتر ممالک میں بار بار آنا جانا رہا۔ اس طرح بین الاقوامی تاریخی' ثقافتی' سماجی' تہذیبی' علمی' ادبی' تخلیقی' سیاسی اور فنی مظاہر کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے' سمجھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اُسی دوران سنہ ستر کے اوائل میں شعر و ادب کے طالب علم کی حیثیت سے "امریکن یونیورسٹی بیروت" سے English Literature میں ماسٹرز بھی کر لیا۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض احمد فیض صاحب "لوٹس میگزین" کے مدیر کی حیثیت سے بیروت میں مقیم تھے۔ اس طرح دو سال تک فیض صاحب کی قربت بھی حاصل رہی۔ سعودی عربیہ میں اپنی عملی زندگی کی قیام کے دوران ہی میری شاعری کے دو مجموعے "دستاویز" اور "تنہا پرندے کی اُڑان" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ اُس دور کے معتبر اہلِ نقد و نظر نے ان کی پذیرائی بھی کی۔ اور ان دونوں مجموعوں میں شامل تمام کلام پاکستان

اور ہندوستان کے تمام اہم اور دقیق ادبی مجلات میں تسلسل سے شائع بھی ہوتا رہا۔ ان مجلات میں: فنون' اوراق' ادبِ لطیف' ماہِ نو' نیرنگِ خیال' ادبیات' الشجاع' سیپ' افکار' اقدار' وغیرہ اور اُدھر: شب خون' شاعر' وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ تخلیقی کاموں کے ساتھ ساتھ مشرقِ وسطیٰ میں اردو زبان' تہذیب اور شعر و ادب کی ترویج و بقاء کے لیے ماہانہ ادبی نشستوں کا اہتمام کیا' مشرقِ وسطیٰ کے تمام اہلِ قلم اور باذوق اصحاب کے لیے' پاک و ہند سے شائع ہونے والے تمام اہم ادبی اور نیم ادبی مجلات و جرائد کی فراہمی بذریعہ زیرِ رفاقت ممکن بنائی۔ اور اس طرح وہاں کے اہلِ قلم میں مطالعہ اور لکھنے کی تحریک پیدا کی۔ پاک و ہند کے تمام ادبی اکابر کو اپنا مہمان بنا کر پاک و ہند مشاعروں کا اہتمام کیا۔ جس کی سب سے اہم اور بڑی مثال 1978ء کا وہ مشاعرہ ہے جس کا اہتمام ہم نے جدہ میں پاکستانی سفارت خانہ کے تعاون سے اور اسی کے احاطے میں کیا تھا۔ اور جس میں: حفیظ جالندھری' احسان دانش' مولانا ماہر القادری' نُشر وربارہ بنکوی' وحیدہ نسیم۔ اُدھر انڈیا سے: خمار بارہ بنکوی' کلیم عاجز' شمیم جے پوری' ملک زادہ منظور وغیرہ نے شرکت فرمائی تھی۔ سعودی عربیہ میں بیس سال تک اردو شعر و ادب اور تہذیب کی ترویج و بقاء کے لیے سرگرمِ عمل رہنے' اور اب وہاں مقیم اپنے ساتھیوں کو یہ ذمہ داری سونپنے کے بعد۔۔ یہاں کینیڈا میں بھی گذشتہ بیس سال سے وہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ اسی دوران تخلیقی' تصنیفی اور اشاعتی کام بھی ہو رہا ہے اور میری متعدد کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں' جن میں: سخنور بہت اچھے (اہلِ قلم پر مضامین اور خاکے) آگرہ سے نیاگرہ (سیاحی نظمیں) ابابیلیں نہیں آئیں (عالمی اہم واقعاتی نظمیں) Beyond Seven Seas (انگریزی نظمیں) دنیائے تصوف (عالمِ اسلام کے عظیم المرتبت روحانی پیشواء' حالاتِ زندگی' راہِ سلوک کی مسافرت اور تعلیمات) سلسلہ تکلم کا (کینیڈین اخبارات میں' مقامی اور بین الاقوامی موضوعات پر مستقل شائع ہونے والے میرے کالم) شاعرِ صد رنگ عبداللہ جاوید (نقد و نظر) اردو ناول کی دریافت (تحقیق'

تنقید اور تجزیہ) شمالی امریکہ کے پچاس اہلِ قلم (شخصیت وفن) شامل ہیں۔ اپنے قیامِ سعودی عربیہ کی طرح یہاں کینیڈا سے بھی میں دنیا بھر میں منعقد ہونے والے ادبی اجتماعات میں پابندی سے شرکت کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ سنہ ۲۰۰۰ء سے یہاں کے ٹی وی چینل پر Urdu TV Canada کے پریسیڈینٹ' پروڈیوسر اور ہوسٹ کی حیثیت سے' روزانہ چار گھنٹے کے اردو پروگرام بھی کرتے ہیں۔ اور ہمارے ان پروگراموں میں اردو تہذیب' شعروادب اور مشرقی طرزِ معاشرت کو ترجیحی بنیادوں پر پیش کیا جاتا ہے۔

پاکستان سے باہر رہ کر' اردو شعروادب کی ترویج' بقاء اور تخلیقی و تصنیفی تناظر میں' اپنے اس چالیس سالہ سفر کے دوران' میرے لیے یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ کینیڈا میں سرکاری و ادبی فورمز کی سطح پر اور برطانیہ' امریکہ' پاکستان' ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ میں علمی و ادبی اداروں کی جانب سے مجھے جن اعترافی اسناد و اعزازات سے نوازا گیا ہے' وہ یقیناً میرے ہم عصر اور ہم سفر اہلِ قلم کے لیے ایک ہمت افزا مثال ہے۔ بایں ہمہ' میری خواہش ہے کہ بیرونِ پاکستان مقیم تمام اہلِ قلم' اردو شعروادب کی ترویج' بقاء اور تخلیقی اور تصنیفی حوالوں سے ان ہی قواعد وضوابط کی پیروی کریں جن پر میں گذشتہ چالیس سال سے عمل پیرا ہوں۔

محمد صابر (کولمبو۔ سری لنکا)

ہر پاکستانی جو اپنے ملک سے باہر خواہ کسی بھی مقصد کیلئے رہ رہا ہو وہ اپنے ملک کی نمائندگی اپنی انفرادی کارکردگی، اپنے انفرادی رویے اور اپنے رہنے سہنے کے انداز سے کرتا ہے لیکن اس کے برعکس ایک مصنف کی تحریر پوری قوم کے اجتماعی عقائد، خیالات اور اطوار و انداز کو ظاہر کرتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ وہ مصنفین جو پاکستان سے باہر کام کر رہے ہیں انھیں پاکستان کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نمائندگی کرنے کی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیئے۔ یقیناً کچھ بڑے بڑے مصنف ہیں جو پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن

صرف اتنا ہی کافی نہیں۔

میرا اعتقاد ہے کہ ہمارے تخلیق کار بہت اچھی کارکردگی دکھا رہے ہیں لیکن وہ کسی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر کوئی کام سرانجام نہیں دے رہے ہیں۔ اُن میں ٹیم ورک کا فقدان ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ملک سے باہر کوئی ایسی تنظیم ہوتی جس کی مدد سے وہ ایک دوسرے سے رابطے میں ہوتے اور اُن سب کے پاس مستقبل کیلئے کام کرنے کا کوئی مشترکہ ایجنڈا ہوتا۔ اس سلسلے میں میری کچھ گزارشات ہیں:

(۱) پاکستانی سفارت خانہ ایسے تمام دانش مندوں اور مصنفین کو اُن کی صلاحیتوں کے مطابق رجسٹر کرے۔

(۲) ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو کتابی ادب کے معاملات پر گہری نظر رکھتی ہو۔

(۳) یہی کمیٹی ہر مصنف کو تخلیقی کام سونپ سکتی ہے۔

اب میں بیرون ممالک مقیم تخلیق کاروں کو درپیش مسائل کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔

(۱) تخلیق کاروں کے سامنے کوئی ایسا ذریعہ اظہار نہیں ہے۔ جس کے ذریعہ اُن کا کام اُس معاشرے یا اُن کے اپنے ممالک تک پھیل سکے اور نئے ذہنوں اور نئے خیالات کو جلا و تسکین مل سکے۔

(۲) نئے تخلیق کاروں کے پاس کسی قسم کی کوئی ہدایات یا کوئی ایسا ادارہ نہیں ہوتا جو انہیں متعارف کروا سکے۔

(۳) غیر ممالک میں رہائش پذیر تخلیق کار کی سرگرمیاں صرف اُن کے اپنے دائرہ کار تک محدود ہوتی اور چونکہ عام لوگوں کی رسائی اُن تک نہیں ہوتی اس لیے اُن کی تحریریں رائیگاں جاتی ہیں۔

(۴) ان مصنفین کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی کے پاس پیسہ ہو تو وہ اُس سے اور زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرتا رہتا ہے اور جس کے پاس پیسہ نہ ہو وہ اور زیادہ کنگال ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ کہ وہ مصنفین جن کے پاس شہرت ہے وہ اور زیادہ شہرت حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں اور جن کے پاس شہرت نہیں ہے وہ اپنے کام کرنے کی خواہش بھی کھو رہے ہیں۔

میرا مقصد بڑے بڑے لوگوں پر تنقید نہیں لیکن ہمارے پاس ایسے بڑے بڑے لوگ بھی ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا۔ ہمیں اُن کو تلاش کرنا ہے اگر ہم پچھلے دس سال کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گا کتب بینی کا مشغلہ زوال پذیر ہے اور اگر یہ ایسا ہی رہتا ہے تو وہ دن دور نہیں جب اپنی کتاب کو صرف مصنف ہی پڑھے گا یا صرف اُس موضوع کے تعلقہ دار اور عام آدمی کی دلچسپی کتابوں میں یکسر ختم ہو جائے گی۔

کتابیں اپنے بہترین دوستوں کی منتظر ہیں۔ مطالعہ کتب کی زوال پذیری پاکستان کے علمی مستقبل کیلئے ایک خطرہ ہے۔

(۱) پاکستانی مصنفین کیلئے ایک بین الاقوامی تنظیم کی ضرورت ہے۔

(۲) اس تنظیم کو غیر ممالک میں رہائش پذیر مصنفین اور اُن کے کام کی چھان بین کرنی چاہیے۔

(۳) یہ تنظیم نئے ذہنوں کو فروغ دینے میں مدد ہوگی۔

(۴) اس تنظیم کو پاکستانی مصنفین کو استعمال کرتے ہوئے ایک قومی ایجنڈے پر کام کرنا چاہیئے۔

علمی اقدار کو بہتر بنانے کیلئے آپ کی سفارشات کی اشد ضرورت ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

ناصر نظامی (ہالینڈ)

سوال۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعروادب کی ترویج میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب۔ ادب کو بیرونی اور اندرونی خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ جس طرح ایک مہذب شہری، قانون، ریاست اور سماج کے سامنے اپنے شہری اور معاشرتی حوالوں سے جواب دہ ہوتا ہے...... اُسی طرح ایک سچا شاعر، ایک ادیب، ایک دانشور، ایک تخلیق کار اپنے مافی الضمیر کی عدالت، تاریخ اور نسل انسانی کے سامنے اپنے علمی، ادبی، انسانی اور تخلیقی رویوں کے حوالے سے جواب دہ ہوتا ہے۔ ایک سچا اور اعلیٰ تخلیقی ادب بین الاقوامی ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر کسی زبان کے ہوں، کسی ملک کے ہوں، کسی نسل کے ہوں، کسی رنگ کے ہوں ہمیشہ ایک ہوتے ہیں کیونکہ وہ ادب گری کرتے ہیں۔ ادب نہ کسی قوم کی جاگیر ہوتا ہے نہ ہی کسی ملک کی میراث، قومیں مر جاتی ہیں، تہذیبیں فنا ہو جاتی ہیں، نسلیں ناپید ہو جاتی ہیں مگر ادب ایک بار تخلیق ہو جاتا ہے تو کبھی نہیں مرتا، کبھی فنا نہیں ہوتا۔ سچا ادب انسانی صفات کو اُجاگر کرتا ہے۔ بھوک، قحط، بیماری، جہالت اور استحصال کو ختم کرنے کا درس دیتا ہے۔ سچا ادب ترقی، خوشحالی، مسرت اور شادمانی کے سنہرے خواب تراشتا ہے۔ ادب کو بین الاقوامیت کے ساتھ منسلک کرنے سے قومی تشخص کی نفی نہیں ہوتی۔ ادیب کسی بھی قوم، نسل یا ملک کا فرد ہو اُسے اپنے قومی مفادات، نظریات اور تہذیب و ثقافت کی پاسداری ضرور کرنی چاہیے اور اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اُس کی ذات پوری نسل انسانی کا ایک حصہ ہے لہٰذا جُز کے مفاد کو کُل کے مفاد پر قربان نہیں کرنا چاہیے کہ ادیبوں اور تخلیق کاروں کو انسان دوست، روشن خیالی اور تہذیبی افکار کی سربلندی کا علمبردار ہونا چاہیے۔

سوال۔ کیا ان کی تحریر و تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب ۔ جس طرح درخت کی جڑیں زمین کے اندر ہوتی ہے......اُسی طرح انسان کی جڑیں اُس کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے پیوستہ و وابستہ ہوتی ہیں۔ درخت زمین سے اُکھڑ کر چولہے کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اپنی تہذیب اور ثقافت سے رُوگردانی اور کنارہ کشی کرنے والا انسان اپنی حقیقی شناخت اور قدر و قیمت سے کم زور ہو بیٹھتا ہے اور اپنے قومی تشخص سے محروم ہو جاتا ہے...... بیرون ملک آباد تخلیق کاروں کی تخلیقات میں اکثر یہ جذبۂ حُب الوطنی نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی دلیل، یورپ میں ہونے والے مشاعرے، مختلف جرائد و رسائل اور اُردو زبان کا پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور اپنی سرزمین کی تہذیب و ثقافت سے جڑے رہنے کی روشن مثال۔

سوال ۔ بیرون ملک مقیم تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ بیرون ملک مقیم یا اندرون ملک مقیم شاعروں، تخلیق کاروں اور قلم کاروں کی تخلیقات کو خالصتاً ادبی، علمی اور فنی معیار پر پرکھنے کے لئے متوازن اور معیاری اوزان...... اور غیر جانبدارانہ تنقیدی اذہان کی ازحد ضرورت ہے۔ تعمیری اور تخلیقی تنقید کا مقصدِ اعلیٰ کھرے اور کھوٹے کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے نہ کہ تخلیق کار کی ذات کی گوشمالی...... زیرِ بحث تخلیق اور فن پارے کو آنا چاہیے...... نیز تخلیق کار کے معروضی حالات، معاشرتی رویے، لسانی ڈھانچہ اور اُس عہد کے تاریخی، معاشی، سیاسی، نفسیاتی، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، سائنسی اور علمی افکار و خیالات اور رائج الوقت انسانی رویوں کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ بیرون ملک ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات کے معیار کو جانچنے کے لئے اعلیٰ سطح پر علمی، ادبی اور فنی تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں محترم حیدر قریشی ایڈیٹر ''جدید ادب'' جرمن جو کہ ایک عہد ساز شخصیت صاحب طرز شاعر، ادیب، ماہیا نگار، صحافی اور تنقید نگار ہیں...... کافی مستند علمی اور ادبی کام کر چکے ہیں۔

سوال ۔ کیا آپ بیرونِ ملک مقیم تخلیق کاروں کے تخلیقی کام سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ میرے مشاہدے کے مطابق بیرون ملک مقیم ادیبوں اور شاعروں میں ایک نام نہایت اہم، معتبر اور مستند حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نام جناب محترم حیدر قریشی کا ہے جو کہ صحیح معنوں میں علمی، ادبی، فنی تخلیقی، تنقیدی اور تعمیری اعتبار سے ادب عالیہ اور حقیقی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے مشعل بردار ہیں اور یورپ بلکہ پاک و ہند کے نام نہاد ادبی مافیا اور جغادریوں کے خلاف برسرپیکار ہیں اور نوآموزگانِ کوچہ ادب کے لئے رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا روشن ستارہ“......

سوال ۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب ۔ کسی قوم کی ترقی و خوشحالی، اوج و کمال اور مقام و مرتبے کو پرکھنے کا سب سے بڑا پیمانہ اُس قوم کا علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ ہوتا ہے۔ ان تخلیق کاروں کو اب مزید کچھ نہیں کرنا ہے۔ اربابِ اقتدار و اختیار کو ان علم و ادب کی دانش گاہوں اور خیال و فکر کی جامعات کو فنا ہونے سے بچانا ہوگا چوں کہ جس قوم کے ادیب، شاعر اور دانشور مرجاتے ہیں وہ قوم بھی مرجاتی ہے۔

پروین شیر (کینیڈا)

۱۔ بالکل کر رہے ہیں بلکہ وطن سے دور ہو کر اس کا احساس زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے۔

۲۔ بہت زیادہ اور ہمیشہ غریب الوطن ہو کر ہی وطن کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ تخلیقات کی رگوں میں وہیں کی یادوں کے خون رواں ہوتے ہیں۔

۳۔ ملے جلے معیار ہیں۔

۴۔ مطمئن تو ہوں لیکن خوب سے خوب تر کی گنجائش ہمیشہ موجود ہے۔

۵۔ میرے خیال میں یہاں کے تخلیق کاروں کو وطن کے اعلیٰ دانشوروں، تخلیق

کاروں ور تنقید نگاروں کو پڑھنا، ریسرچ کرنا اور اُن کو Role Model بنانا چاہیے۔نئی نسل کو آگاہ کرنا چاہیے۔

زکریا ورک (جرمنی)

سوال ۔ آپ وطن سے دور ہونے کے باوجود اردو زبان اور شعروادب سے کس حد تک وابستہ ہیں؟

جواب۔ خاکسار ۱۹۷۰ء میں پاکستان سے ہجرت کر کے جرمنی آیا تھا۔ وہاں تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد زبان وبیان کی قیود کے بوجوہ کینیڈا ہجرت کر گیا۔ گویا ملک عزیز سے ہجرت کئے اب چالیس برس ہونے کو آرہے ہیں۔ شروع شروع میں روزگار کے سلسلہ میں اردو سے تعلق وقتی طور پر منقطع ہو گیا کیونکہ ستر کی دہائی میں انٹرنیٹ ابھی عام نہیں ہوا تھا اور کینیڈا میں اردو کتابیں اور اخبارات بھی بہ مشکل ملتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ حالات سدھرتے گئے اور آل اولاد کی ذمہ داریاں ادا ہوتی گئیں اور وقت زیادہ ملنے لگا تو دوبارہ اردو سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اب تک میری درج ذیل کتابیں ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ عظیم زندگی، بشیر آرچرڈ کے انگلش مضامین کا ترجمہ ٹورنٹو۔کینیڈا ۱۹۸۹ء

۲۔ رموز فطرت، ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی پر مضامین کا مجموعہ ٹورنٹو۔کینیڈا ۱۹۹۶ء

۳۔ مسلمانوں کا نیوٹن، ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر مضامین کا مجموعہ ٹورنٹو۔کینیڈا ۲۰۰۳ء

۴۔ مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا علی گڑھ، انڈیا ۲۰۰۵ء

۵۔ سوانح ابن رشد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا (اور لاہور) سے بھی علی گڑھ، انڈیا ۲۰۰۶ء

۶۔ سوانح ابوریحان البیرونی، دہلی انڈیا (اور لاہور سے بھی) دہلی، انڈیا ۲۰۰۶ء

۷۔ حکمائے اسلام، اسلام اور سائنس پر مضامین کا مجموعہ، دہلی دہلی، انڈیا، ۲۰۰۸ء

۸۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی خدمات، نیا زمانہ لاہور لاہور ۲۰۰۹ء

سوال۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ میں کینیڈا مقیم پاکستانی ادیبوں، شاعروں، نقادوں، افسانہ نگاروں کے کام سے ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ سردست یہاں میں صرف ٹورنٹو کا ذکر کروں گا جہاں درجنوں ادبی انجمنیں بڑے فعال طریق سے کام کر رہی ہیں مثلاً اردو رائٹرز فورم تنظیم کا اجلاس ہر ماہ نارتھ یارک پبلک لائبریری میں گزشتہ کئی سالوں سے منعقد ہو رہا ہے۔ ان اجلاسوں میں مختلف ادیب، افسانہ نگار، شاعر اپنی تخلیقات سے سامعین کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور تنظیم فیملی آف دی ہارٹ ہے جس کے روح رواں ڈاکٹر خالد سہیل ہیں جو بذات خود شاعر اور مضمون نگار اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ٹورنٹو سے ہر ہفتہ متعدد اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں جیسے اردو ٹائمز، جیو پاکستان، پاکیزہ، پاکستان ٹائمز، وغیرہ۔ آفاق نام کا ایک ماہوار رسالہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اردو کے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرامز بھی ہر ہفتہ نشر ہوتے ہیں۔ آپ ہندو پاکستان کے کسی رسالہ کا بھی جائزہ لے لیں ان میں لکھنے والوں کی ایک بھاری تعداد غیر ممالک میں رہنے والے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی ہوتی ہے۔ امریکہ سے ایک رسالہ دیدہ ور الیکٹرانک فارمیٹ میں شائع ہوتا ہے جو دنیا کے کسی کونے میں آن لائن پڑھا جا سکتا ہے اس رسالہ کا معیار، اس کا گیٹ اپ، کتابت اور رنگین

سرورق اعلیٰ معیار کا ہے۔ ویب سائٹ نوٹ فرمائیں: www.deedahwar.net

سوال۔ کیا آپ نئی نسل کو اردو شعروادب اور پاکستان سے متعارف کرا رہے ہیں؟

جواب ۔ میں ذاتی طور پر تو نئی نسل کو اردو شعروادب سے متعارف نہیں کرا رہا، البتہ ٹورنٹو میں کئی اسلامک سکولز اور ادارے ایسے ہیں جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ میرے دونوں بیٹے اردو سے نابلد ہیں مگر وہ اپنی اولاد کو اردو سے متعارف کرا رہے ہیں۔ بچوں کیلئے اردو کی کتابیں، قاعدے وغیرہ انہوں نے پاکستان سے منگوائے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ اپنے بچوں کو اردو سکھائیں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب ۔ یہ سوال مبہم ہے، آپ کا روئے سخن کینیڈا میں مقیم تخلیق کاروں سے ہے؟ یا پاکستانی تخلیق کاروں سے ہے؟ اگر تو آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کینیڈا میں مقیم تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے تو میں گزارش کروں گا کہ میں ٹورنٹو کی متعدد مختلف تنظیموں کے اجلاسوں، مشاعروں میں گیا ہوں۔ وہاں اکثر ادھیڑ عمر کے سامعین ہی ہوتے ہیں۔ کینیڈا میں پیدا ہونے والا کوئی بچہ وہاں نہیں ہوتا کیونکہ ان کے نزدیک پاکستان کا کلچر ان کا کلچر نہیں ہے۔ کینیڈا میں رہنے والے یا بڑے ہونے والے بچوں کے اپنے مسائل ہیں جن کو ہم پرانی نسل کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ تو نئی نسل میں اردو کا شوق پیدا کرنے کیلئے ہمارے تخلیق کاروں کو ان کے مسائل اور حل کے بارے میں لکھنا چاہیے۔ اپنی غزلوں اور نظموں میں ہمارے شاعروں کو کینیڈین معاشرے کے مسائل پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ نوجوان بچوں کو ہمیں اپنے ساتھ اجلاسوں میں لانا چاہیے۔ جو افسانہ نگار ہیں ان کو اپنے افسانے یہاں کے منظر میں لکھنے چاہئیں۔ اردو میں شائع ہونے والے تمام اخبارات پاکستانی اخبارات کا چربہ ہوتے ہیں۔ پاکستان کے مسائل سے قارئین کو آگاہ کیا جاتا ہے مگر کینیڈا کے مسائل پر لکھنا یا سوچنا انہوں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔

سوال۔ آپ پاکستانی ادیبوں، شاعروں اور قارئین کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب ۔ میرا پیغام تو سیدھا سادہ سا ہے۔ ہم نے پاکستان کو ساٹھ سال تک ایک اسلامی جمہوریہ کے رنگ میں دیکھ لیا ہے۔ سوائے قتل و غارت، نفرت، اقتصادی بدحالی، ناکام ریاست کے ہمیں کیا ملا ہے؟ آیئے اگلے ساٹھ سال تک پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ کے رنگ میں کام کرتا دیکھیں۔ جہاں کسی کو کسی اور شخص کے مذہب، رنگ، لباس، زبان، علاقہ، جائے پیدائش سے کوئی سروکار نہ ہو۔ جہاں انسانیت راج کرے، انسان انسان کو پیار کرے، نفرت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ محبت اور آشتی کا نعرہ ہر ایک کی زبان پر ہو۔ اس کیلئے ہمیں پاکستان کے آئین پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ ہمیں رشوت ستانی، اقربا پروری، علاقائی تعصب کو ختم کرنا ہوگا۔ نیا قانون بنایا جائے جس کے مطابق تمام سیاسی پارٹیاں ختم کر دی جائیں اور صرف دو پارٹیاں ملک میں کام کریں جس طرح امریکہ میں ہوتا ہے، یا تین جس طرح کینیڈا میں ہے۔ اسلام کا نعرہ کم لگایا جائے اور انسانیت کا نعرہ زیادہ لگایا جائے۔ اسلام ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہونا چاہئے اس میں ریاست کو دخل اندازی نہیں ہونی چاہئے۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

میں پاکستان کے اخبارات انٹرنیٹ پر پڑھتا ہوں، کسی صحافی، لکھاری، نقاد میں اتنی جرأت نہیں کہ حکومت پر تنقید کرے۔ کوئی ایسا خادم قوم نہیں جو حکومت پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل بھی پیش کرے۔ بجائے دوسروں کو اپنی ناکامیوں کا مورد الزام ٹھہرانے کے کتنا اچھا ہو اگر ہم اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں کہ من حیث القوم ہم میں کیا کوتاہیاں ہیں جو ہم اتنی ترقی نہیں کر سکے۔ آئے روز ہم بجلی اور پانی کے بحران سے دوچار ہیں۔ ہم آج تک بجلی میں خود کفیل نہیں ہو سکے۔ قوم کو پے در پے بحرانوں (جیسے چینی کا بحران) سے دوچار کیا جاتا ہے۔ غریب مفلوک الحالی کی چکی میں اور بھی پسے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارے مسائل ہیں ان کا حل ہم نے تلاش کرنا ہے۔ امریکہ یا ہندوستان پر الزام لگانے

سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہماری قوم میں ذہین ترین افراد، سائنس دان، ٹیکنالوجسٹ، زراعت کے ماہرین، گرین انرجی کے ماہرین موجود ہیں۔ان سے حکومت کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ حکومت کو چاہئے کہ ملک کے نامور صحافیوں کو غیر ممالک کے دوروں پر بھیجے ہر صحافی کسی کام میں تخصیص پیدا کرے اور دو تین سال بعد وطن واپس آ کر قوم کو مشورے دے کہ دوسری قومیں کس طرح ترقی کر رہی ہیں۔ غزلوں، افسانوں کا زمانہ گیا یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ہماری غربت ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے سے دور ہو گی۔

عرفانہ عزیز (کینیڈا)

کینیڈا ایک کثیر الثقافتی معاشرہ ہے اور تارکین وطن کو اپنی اپنی ثقافت کو فروغ دینے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں اور ضروری وسائل مہیا کیے جاتے ہیں جہاں تک پاکستانی تارکین کا تعلق ہے اردو زبان کے ارتقا کے لئے وہاں فضا بہت سازگار ہے ٹورنٹو، اوٹاوہ، کیلگری، مانٹریال ایڈمنسٹن میں اردو انجمنیں قائم ہیں جو ہر سال اردو کانفرنس اور مشاعروں کا اہتمام کرتی ہیں۔ اچھے اہل قلم کی وہاں کمی نہیں۔ ٹورنٹو میں تقی عابدی صاحب کا اردو زبان کے لئے کونٹری بیوشن نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ نہ صرف اچھے شاعر ادیب اور دانشور ہیں ان کی اردو زبان سے متعلق لائبریری ایک معتبر ادارہ ہے ان کی اپنی تصانیف بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

اطہر رضوی صاحب غالبؔ کے حوالے سے ایک ادارے کو سنبھالے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ادبی نشستیں ہوتی ہیں۔ وہ ماضی میں بہت اچھے مشاعرے اور اردو کانفرنسیں کروا چکے ہیں اور اب بھی ایک فعال شخصیت ہیں۔ آج کل وہ اشفاق حسین کے تعاون سے بڑی ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں اشفاق حسین نئی نسل کے بہت اچھے شاعر ہیں اور کینیڈا میں بھی اردو کانفرنس اور مشاعرہ تقریباً ہر سال ان کی کاوشوں کا مرہون

منت ہے۔ مانٹریال میں ن۔م۔ راشد کے داماد فاروق حسن اردو زبان کے فروغ کے لئے گاہے گاہے اہتمام کرتے ہیں وہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ کیل گری میں اقبال حیدر جوشؔ کے حوالے سے تقریبات منعقد کرتے رہتے ہیں۔ ٹمی نوبہ میں عرفانہ عزیز اردو سوسائٹی کی صدر رہ چکی ہیں اور برصغیر کے ممتاز دانشور ادیب اور شاعران کی میزبانی کے معترف ہیں۔ ونی پیگ میں اردو مشاعروں اور کانفرنسوں کا انعقاد ان کے تعاون سے ہوتا رہا ہے۔ وہ اب بھی گاہے گاہے کینیڈا جا کر اردو زبان کے فروغ کے لئے اہم اقدامات کر کے آتی ہیں ایڈمنٹن میں خلیل صاحب اردو زبان کی توسیع کے لئے بہت کام کر چکے ہیں۔ اوٹاوہ میں بھی شاہین صاحب ایک ممتاز شخصیت کا مقام رکھتے ہیں بہت بلند پایہ شاعر اور دانشور ہیں۔

ممتاز موسیقار محترمہ ریگولا قریشی اٹاوہ آتی رہتی ہیں ان کا تعلق سوئٹزرلینڈ سے ہے مگر اردو بہت شستہ لہجے میں بولتی ہیں اندازِ گفتگو اہل لکھنو جیسا ہے۔

ٹورنٹو میں مرحوم حفیظ اکبر قریشی بھی اردو کے سلسلے میں بہت کام کر چکے ہیں۔ ادھر امریکہ میں حمیرا رحمان، صبیحہ صبا، ریحانہ قمراپنی شعرو شاعری سے انجمن ساز ہستیاں ہیں۔ فرحت پروین بہت اچھی افسانہ نگار ہیں۔ وہاں سخنوروں کی کمی نہیں مگر تمام ناموں کا تذکرہ ممکن نہیں۔

بیشتر تارکین وطن ٹرانسٹو میں ہیں اہم شعراء میں تقی عابدی صاحب، اشفاق حسین، افتخار حیدر، نزہت صدیقی تسلیم الٰہی زلفی، نسیم سید اور بہت سے محترم نام ہیں۔ جب تک شان الحق حقی صاحب حیات تھے اردو انجمنوں میں چراغ جلتے رہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر، دانشور، محقق اور نقاد تھے کینیڈا اور امریکہ میں بھی انہیں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

بعض اہل قلم واپس وطن لوٹ آئے، حفیظ اکبر قریشی، عقیلہ شاہی پروفیسر عبدالقوی ضیا، ڈاکٹر خلیل، شاہد فاروقی صاحب اور اسی پائے کے ممتاز دانشور جو اردو زبان

کی ترویج کے لئے کام کرتے رہے اب حیات نہیں جو عظیم سخنور ادیب شاعر برصغیر سے کینیڈا اور امریکہ آیا کرتے تھے وہ بھی اب ہمارے درمیان نہیں۔ فیض احمد فیض، احمد فراز ،احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، منیر نیازی، ڈاکٹر قمر رئیس، علی سردار جعفری، حکیم محمد سعید جن کے وجود سے کائنات ادب میں رونق تھی اب بزم سخن کے چراغ بجھا کر خلاؤں میں کھو گئے ہیں یہ خلا پُر نہیں ہو سکتے۔

وصی الحسن نقاش ہاشمی (امریکہ)

یقین جانیے امریکہ میں اردو کے لکھاری چوتھی جنگ لڑ رہے ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ معروف ادبی مراکز کے تخلیق کار انہیں رعایتی نمبر (Grace Marko) دینے پر بھی تیار نہیں ہیں۔ امریکہ میں روزگار کی تلاش اور چکی کی مشقت بذات خود ایک تخلیقی عمل بن چکا ہے اور ایک تخلیقی عمل کی موجودگی میں دوسرے کی گنجائش جزوی (Parttime) تو ہو سکتی ہے مکمل ہرگز نہیں۔

امریکہ میں اردو کا مستقبل ہجرت سے جڑا ہوا ہے یعنی وہ احباب گرامی جو ہندوپاک سے ہجرت کر کے آتے ہیں امریکہ میں اردو شعروادب کے چراغ کو روشن کیے ہوئے ہیں، لیکن ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ تخلیقی عمل نوجوان نسل کو منتقل نہیں ہو پا رہا ہے اور یہاں کے نوجوان اردو کو اپنے تخلیقی عمل کے لیے ضروری اور موزوں نہیں سمجھتے۔

امریکہ میں مقیم ادیبوں اور شاعروں کو یہ مسئلہ بھی درپیش ہے کہ یہاں شعرو ادب پر فنی مہارت رکھنے والے ناپید ہیں انڈیا اور پاکستان سے آنے والے شعراور ادبا یہاں کے تخلیق کاروں کے فنی عیوب کی نشاندہی تو کر دیتے ہیں لیکن اپنی فنی مہارتوں سے یہاں کے تخلیق کاروں کو فائدہ نہیں اٹھانے دیتے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تخلیقی عمل کے لیے جس گرومنگ کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں ناپید ہے۔

درج بالا پیش کردہ مشکلات کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ میں اچھا اور معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں کے تخلیق کاروں کو بھی ہندوستان اور پاکستان کے اہم اور معتبر جریدوں میں جگہ دی جائے تاکہ یہ لوگ بھی بڑے تخلیقی سفر کا حصہ بن سکیں۔

ساجد گل (ڈبلن۔آئر لینڈ)

سوال ۔ کیا بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کے لیے مثبت کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب ۔ آپ کے اس سوال کا سادہ سا جواب تو بالکل یہی ہے کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کار شعر و ادب کی ترویج کیلئے اپنے تئیں بے حد احسن کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ عالمی معیار کا کام کر رہے ہیں اور کچھ معیار کے حوالے سے معتبر تو نہیں ہیں لیکن شعر و ادب کی خدمت میں بہر حال اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔

سوال ۔ کیا ان کی تخلیقات میں وطن کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے؟

جواب ۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ انسان اپنے گھر سے دور ہو تو گھر زیادہ یاد آتا ہے اور اس کی قدر محسوس ہوتی ہے۔ یہی صورتحال بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو بھی پیش آتی ہے۔ وہاں جا کر اپنے وطن سے محبت کا احساس زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک مقیم شاعر و ادیب کی تخلیقات میں وطن کی محبت کے کئی رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ شفیق سلیمی، محمد ممتاز راشد، جمشید مسرور اور بذات خود راقم شعر و ادب کے میدان میں وطن سے دوری اور اس کی محبت کے گلزار کھلا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں فیض احمد فیض کی شاعری جو کہ (ماضی میں) بیرون ملک قیام کے

دوران کی گئی وہ آپ کے سوال کے جواب میں مجسم ثبوت ہے۔

سوال ۔ ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟

جواب ۔ لاہور، کراچی کے بڑے ادبی مراکز سے دور ہونے کے باعث کچھ تخلیق کاروں کے ہاں معیار کے حوالے سے کہیں کہیں کچھ کمی تو بہرحال رہ جاتی ہے۔ افتخار عارف، ساقی فاروقی وغیرہ نے جو شعر و ادب کی خدمت بیرون ملک قیام کے دوران کی، چونکہ یہ قدآور تخلیق کار ہیں اس لیے ان کی تخلیقات کا معیار بھی اعلیٰ ہی رہا۔ خلیجی ریاستوں سے ع۔س۔ مسلم اور سعید قیس وغیرہ کے ہاں بھی اعلیٰ معیار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کسی حد تک ماضی قریب میں باقی احمد پوری بھی اسی قطار میں کھڑے دکھائی دیئے۔ دیگر ان میں (نام ظاہر کیے بغیر) بہت سے ایسے ہیں کہ جو بہرحال اچھا کام کر رہے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تخلیقی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب ۔ ایک خاص حد سے آگے انہیں مزید اپنے تخلیقی کاموں کی بہتری کے لیے کوشش تو کرنی چاہیے۔ بہرحال جو جہاں بیٹھا ہے اور جس کی جتنی لگن ہے وہ اپنے تئیں بہتر کام کرنے کی کوشش میں مگن ہے۔

سوال ۔ آپ کے خیال میں ان تخلیق کاروں کو مزید کیا کرنا چاہیے؟

جواب ۔ عالمی سطح پر شعر و زبان و ادب میں ہونیوالی نئی نئی تبدیلیوں سے آگاہی ضروری ہے۔ پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادب سے واقفیت ہونی چاہیے۔ عصری حالات سے بھی شناسائی ضروری ہے اور بیرون ملک دیگر زبانوں میں ہونے والی ادبی تخلیقات سے بھی استفادے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں مطالعہ اور رابطہ دونوں ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید دنیا تو استوار ہی رابطے کے زور پر ہے۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کو بھی شعر و ادب کے میدان میں اپنا حق ادا کرنے

کیلئے انہی دو ذرائع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی (آئرلینڈ)

۱۔ جی ہاں۔ پاکستانی رائٹر غیر ممالک خاص طور پر مغربی دنیا میں پاکستانی قوم کو دبالیا۔ دہشت گرد قوم کا تاثر زائل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری قوم اردو زبان اور ادب کیلئے بہت اہم وقت ہے۔ بہت سے رائٹر جو مغربی تہذیب میں مختلف میدانوں میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں وہ رول ماڈل کے طور پر ادبی سرگرمیوں کو فروغ دے کر قوم کا تاثر بہتر بنا سکتے ہیں۔

۲۔ جی ہاں! بہت سے رائٹر کی پرورش پاکستان میں ہوئی ہے اور بعد میں وہ غیر ممالک میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اس حوالے سے اُن کی تحریریں اُن کی اپنی فضا اور تمدن کی عکاسی کرتی ہیں۔

۳۔ جہاں تک تحریروں کے معیار کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ یہ بدلتا رہتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ اردو بولنے اور سمجھنے والے ملک کے معیار کے برابر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی ممتاز رائٹرز کا تعلق اردو تمدنی تہذیب سے ہی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسا ہوتا ہے کیونکہ ہر رائٹر اپنا شاہکار تخلیق کرنے کیلئے اپنے ہی تمدن اور تہذیب سے محرکات حاصل کرتا ہے۔

۴۔ کسی حد تک میرا خیال ہے کہ میں مطمئن ہوں اور ان چیزوں کی Communication Technology خاص طور پر انٹرنیٹ اور ویب سروس کا استعمال کر کے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ ان کی مدد سے ہم اردو ادب کے معیار میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

۵۔ میں نے خود اپنی Website بنائی ہوئی ہے اور اسے باقاعدگی سے

Update کرتا رہتا ہوں اور سال میں کبھی کبھار ایک یا دو مرتبہ بین الاقوامی ملاقاتوں کا اہتمام کرتا ہوں۔

۲۔ رائٹرز کیلئے ہر ملک میں ایک فورم ہونا چاہیے اور انہیں مشترکہ web pages اور chat room بنانے چاہئیں اور روزانہ کی بنیاد پر communication کرنی چاہیے۔ اس مقصد کیلئے internet technology میں خواندگی کا ہونا بہت اہم ہے۔ ہمارے بہت سے ممتاز رائٹرز اور شعرا کمپیوٹر کی الف ب بھی نہیں جانتے۔ اس لیے اب وقت کی ضرورت ہے کہ انہیں اس میدان میں آگے آنا چاہیے اور انہیں اس نئے ہزاروی سال میں خود کو تبدیل کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر عامر عباس (ایران)

ایران میں اسلامی انقلاب سے پیشتر اردو بولنے والوں کی ایک قلیل تعداد رہتی تھی۔ جس میں زیادہ تر تاجر اور کچھ دوسرے پیشہ ور لوگ شامل تھے۔ ۱۹۷۹ء میں امام خمینی کی زیر قیادت اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد یہاں اردو بولنے اور جاننے والوں کی تعداد بوجوہ بہت تیزی سے بڑھی ہے۔

اول: انقلاب کی کامیابی کے بعد دنیائے تشیع کی مرجعیت نجف اشرف سے قم المقدسہ منتقل ہوگئی جس کے نتیجے میں نہ صرف برصغیر پاک و ہند سے بلکہ دنیائے کے اقصائے نکات سے بھی وہ اردو دان جو حوزہائے علمیہ سے فیضیاب ہونے کے لیے پہلے عراق جاتے تھے اب ایران کا رخ کرنے لگے۔

دوم: ہر انقلابی حکومت کی طرح یہاں بھی انقلاب کے بعد اس کے اثرات کو دیگر خطوں تک پہنچانے اور اسلام و انقلاب دشمن قوتوں کے منفی پراپیگنڈے کے سدباب کے لیے ایرانی حکومت نے بعض اہم اقدامات کیے جن میں تہران یونیورسٹی میں اردو زبان

کے شعبہ کا قیام اور اردو زبان میں ریڈیو، ٹیلی وژن نشریات کا آغاز قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا تناظر میں یہ بات قابل فہم ہے کہ ایران کو آنے والے اردو زبان اور دیگر ممالک خصوصاً شرق وسطیٰ میں قیام پذیر پاکستانی تارکین وطن میں ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں رہائش پذیر وہ لوگ ہیں جن کا یا تو تعلق ہی تعلیم و تعلم اور تحقیق سے ہے، یا وہ لوگ ہیں جو ذرائع ابلاغ سے وابستہ ہیں اور اپنے پیشے کے لحاظ سے قلم وکتاب سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جب فردوسی، رومی، حافظ اور سعدی کے دیس میں ادب دوست ماحول میسر ہو تو پھر شعر و ادب کی تخلیق تو ہوگی۔

جی ہاں، ایران کے شہروں تہران، مشہد مقدس، قم المقدسہ، زاہدان، اصفہان اور شیراز میں پاکستانی طلباء اور فضلاء موجود ہیں جو اپنی بساط کے مطابق اردو ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ یہاں ادبی سرگرمیوں کا بڑا مرکز قم اور پھر بالترتیب تہران اور مشہد مقدس ہیں۔ البتہ قم اور مشہد میں ظہور پذیر ہونے والے ادبی فن پارے اپنے مخصوص ثقافتی پس منظر کی وجہ سے روحانی اور عقیدتی رنگ رکھتے ہیں جبکہ تہران میں نشوونما پانے والے ادب کو کسی حد تک اس قید سے مستثنیٰ سمجھا جا سکتا ہے۔

وطن کی محبت دیار غیر میں یقیناً زیادہ ہو جایا کرتی ہے لیکن اس حوالے سے بھی ایران اور دیگر ممالک میں قیام پذیر پاکستانیوں کے جذبہ حب الوطنی میں بھی ایک لطیف اور انوکھا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے یہاں رہنے والے پاکستانیوں کی وطن پرستی کی حدت میں ایک مخصوص قسم کی شدت پائی جاتی ہے جو دراصل ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے! ردعمل، ایرانی عوام اور مذہبی و سیاسی رہنماؤں کے اس متضاد رویے کا جس کے تحت شعار تو عالم اسلام اور ملت اسلامیہ کا دیا جاتا ہے لیکن عملاً نسل پرستی جسے فارسی میں نژاد پرستی کہتے ہیں، دیکھنے کو ملتی ہے۔ مزید برآں، ایران میں رہائش پذیر ہندوستانیوں کے پاکستان اور پاکستانیوں کے بارے میں خیالات بھی اس ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والے شدید جذبہ

حب الوطنی کو شدید تر کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اور پھر کبھی کبھار یہ شدید جذبہ دیگر عوامل کے ساتھ مل کر یہاں پاکستانی ادباء کی تخلیقات میں وطن پرستی کی صورت میں بھی متجلی ہوتا رہتا ہے۔

ایران میں مقیم پاکستانی تخلیق کاروں کی تخلیقات کے معیار کا تعین تو متعلقہ شعبے میں گہری نظر رکھنے والا کوئی صاحب نظر ہی کر سکتا ہے۔ میں نے یہاں (ایران) میں اس ضمن میں بعض ذی وقار اور صاحب نظر شخصیات کو جو کچھ کہتے ہوئے سنا ہے اسے مختصراً یوں کہوں گا کہ یہ تخلیقات عمدہ لیکن غیر منظم ہیں۔ ان میں بہتری پیدا کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ جس کے لیے ایران میں مقیم پاکستانی ادباء، شعراء اور اہل قلم کو وطن عزیز میں موجود معتبر علمی و ادبی حلقوں سے تعلق استوار اور محکم کرنا ہوگا۔

سید عرفی ہاشمی (آسٹریلیا)

کسی ادبی دستاویز کا تشخص اُجاگر کرنے کے لیے اس کے زمانی و مکانی سیاق و سباق کی دریافت اہم ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں کی تحقیق و تنقید اب کسی ادبی دستاویز کو ادیب کے عہد میں رونما ہونے والے واقعات اور جائے وقوعہ کی خصوصیات کے تناظر میں دیکھتی ہے، یہ ایک مثبت پیش رفت ہے۔ ایک تحریر کو فقط اچھی تحریر قرار دینا اور فنی مباحث کی نذر کر دینا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ اسی طرح فقط تحریر کے اپنے وجود کا پوسٹ مارٹم از حد خود کوئی کنٹری بیوشن نہیں۔ اہم چیز یہ ہے کہ ادبی دستاویز کی سیرت و صورت گری کا تعین ان عناصر کی دریافت کے ساتھ کیا جائے جو اس دستاویز کی سیرت و صورت گری کا موجب ہے۔

کسی ایک خطے میں تخلیق ہونے والی ادبی دستاویز کا تعارف اور تاثر کسی دوسرے خطے میں رہنے والوں پر کس قدر ہے اور کیا کسی ادبی دستاویز کی تخلیق کے لیے ادیب کی داخلی

اور خارجی واردات، اس کے عہد کے واقعات اور رجحانات اور ان واقعات کا مکانی جائزہ کسی دوسرے معاشرے، کلچر یا کسی دوسری تہذیب میں لیا جاسکتا ہے؟ یہ دو سادہ مگر اہم سوالات کسی ادبی دستاویز کی Validity اور Reliability کی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک ادبی دستاویز کا جائزہ دو مختلف جغرافیائی خطوں میں پروان چڑھتے کلچر اور تہذیبوں میں لیا جاسکتا ہے۔ اس کی قبولیت اور اہمیت کی پسندیدگی کا دارومدار اس ادبی دستاویز کی گلوبل ویلیو پر ہے۔ گلوبل ویلیو سے مراد وہ امکانات، رجحانات اور تجربات ہیں جو کم و بیش ہر خطے کے انسان پر منکشف ہونے اور ہر کلچر، ثقافت اور تہذیب کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر انحصار پذیری کے رویے کو لے لیجیے یہ ایک ایسا Construct ہے جسے ہر خطے کا انسان بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر عہد میں کسی بھی خطے کا انسان بعض چیزوں اور عوامل پر انحصار کیے بغیر اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یہ انحصار خواہ سماجی روایات پر ہوں، مذہب، مال و دولت، خاندان حشمت یا وقت کے بعض انتہائی خاص لمحات پر ہو۔ یہ بات بہر حال طے ہے کہ انحصار پذیری کے امکانات، واقعات اور تجربات ہر عہد کے انسان پر منکشف ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ادیب بھی اپنی زندگی میں خارجی اور داخلی عوامل پر انحصار کرتا ہے۔ ایسی تحقیق و تنقید جو ادیب کی انحصار پذیری کا سراغ لگائے، نشاندہی کرے اور ادیب کی تحریروں میں اس انحصار پذیری کے رویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے خاص زاویوں سے اس ادیب کی قدر و قیمت کا تعین کرے، یقیناً گلوبل ویلیو کی حامل ہوگی۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ ہم ایسے بے شمار رجحانات، اعلانات اور تجربات پر مبنی Constructs کو اپنے ادب کا حصہ بنا سکتے ہیں جو گلوبل ویلیو کے حامل ہیں۔ یہ تمام Constructs ہماری ادبی دستاویزات کی ویلیڈٹی کو بڑھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری جانب، محبوب کی آنکھوں کے کاجل پر کوئی ادبی دستاویز کسی ایک خطے کے لوگوں کے لیے متاثر کن ہوسکتی ہے مگر دوسرے خطوں کے لوگ

اس ادبی دستاویز کے Construct کے سباق و سیاق سے آگاہ نہ ہونے کے سبب اس کو یکسر مسترد کر دیں گے اور اس میں دلچسپی نہیں لیں گے۔ ہم اس رویے سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ محبوب کی آنکھوں کے کاجل پر تخلیق ہونے والی ادبی دستاویز Validity کے بہت کم درجے پر ہے۔ اب گفتگو کو سوال کے دوسرے حصے سے متعلق کرنے سے پہلے اس بات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے کہ کسی ادبی دستاویز کے تشخص اور زمانی و مکانی سیاق و سباق کا جائزہ کسی دوسرے خطے کے معاشرے یا تہذیب کے تناظر میں لیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں......؟؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی حد تک ممکن ہے اور یہی امکان ادبی دستاویز کی Reliability کی جانب ہماری توجہ مبذول کرواتا ہے۔ ایک مثال سے اس کی وضاحت آسان ہو جائے گی۔ اقبال کی خودی ایک ایسا موضوع ہے جس کے زمانی و مکانی کردار بظاہر مختلف ناموں سے سامنے آ سکتے ہیں۔ اس کے زمانی و مکانی پس منظر کی Epistemology بھی مختلف ہو سکتی ہے مگر اس کی خارجی یا داخلی واردات کا سیاق و سباق ہر عہد اور ہر خطے میں کم و بیش ایک سا ملے گا۔ ہر مسافر عروج و زوال سے پوچھ لیجیے وہ خودی کا تعارف انہی الفاظ و کیفیات میں کرائے گا جو اقبال نے اپنے عہد میں خودی کے لیے مستعار لیے تھے۔ کسی خطے، معاشرے یا تہذیب کا فرق جو زوال کی شاہراہ سے گزرتے ہوئے خودی کے تجربے سے جب بھی آشنا ہوگا تو انہیں کیفیات سے آشنا ہو رہا ہوگا جن سے اقبال اپنے عہد کے انسان کو روشناس کرانا چاہتا تھا۔ خودی کے تجربے سے گزرتے ہوئے آپ اپنے اور اقبال کے زمانی و مکانی سیاق و سباق میں بھی خاص فرق محسوس نہیں کریں گے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی دوسرے خطے کے کلچر یا تہذیب میں قبولیت پانے والی ادبی دستاویزات عمومی طور پر ایک جیسا زمانی و مکانی سیاق و سباق رکھتی ہیں۔ آپ مظلومیت کے Construct کی مثال لے لیجیے دنیا کی کسی زبان کے مزاحمتی ادب کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ اسے اردو ادب کے مزاحمتی ادب سے مختلف نہیں

پائیں گے۔ اس کے علاوہ ظلم کے خلاف مزاحمت یا مظلومیت کا زمانی و مکانی سیاق و سباق بھی زیادہ مختلف نظر نہیں آئے گا۔ ایسی تمام ادبی دستاویزات جن کے سیاق و سباق کا زمانی و مکانی جائزہ ہمیں مختلف کلچر اور تہذیبوں کے باوجود کسی خاص فرق کا احساس نہ ہونے دے زیادہ Reliable ہوں گی۔ اس کے برعکس دوسری جانب محبوب کے زُلف دراز کی تحسین و تعریف پر تخلیق ہونے والی ادبی دستاویز ایک خاص واردات قلبی کی عکاس ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ Expression معاشرتی رویے سے ہم آہنگ ہو۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معاشرتی رویہ کسی ایک خطے کی تہذیب کا آئینہ دار بھی ہو۔ اس پر مستزاد اس کی وقتی قبولیت کی سند بھی ہو سکتی ہے مگر اس کے باوجود ایسی ادبی دستاویز کی Reliability بے حد کم تصور کی جائے گی کیونکہ اس قلبی واردات کا تشخص اور اس کا زمانی و مکانی سیاق و سباق ایک خاص عہد کے معاشرے اور تہذیب سے متعلق ہے۔ کسی دوسرے خطے کا معاشرہ یا تہذیب یا اس تہذیب کی انفرادی اکثریت اس قلبی واردات سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زُلف دراز متعدد معاشروں میں قابلِ توجہ نہیں۔ دیگر معاشرے اس سے کہیں زیادہ اہم اور قابلِ قدر معاملوں اور رویوں کے حوالے سے سنجیدہ ہیں۔ کئی میں زلف دراز نایاب ہیں یا وہ جذبہ مفقود ہو چکا ہے جو زلف دراز کی تعریف و تحسین کے لیے ہمہ وقت محبت کرنے والے کو مجبور کرتا تھا۔ سو اس جذبے کی اثر پذیری جدید معاشرے میں نہ ہونے کے برابر ہے یہ صرف ایک مثال ہے۔ مشرق و مغرب کا ادب ایسی دستاویزات سے بھرا ہے جنہیں Reliable نہ ہونے کے باعث انہیں نابود ہونے سے کوئی نہ بچا سکا۔ ہمیں اپنے ادب کے موضوعات کی ویلیو اے ڈی اور Reliability کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ ہماری منزل مغرب کے موضوعات کا اعادہ نہیں۔ یہ رویہ ادب پر اجارہ داری کے مترادف ہے۔ مغرب خود اپنے بیشتر Invalid اور unreliable تنقیدی اور تحقیقی کاموں کا از سرِ نو جائزہ لے رہا ہے یا

انہیں دفن کر کے اگلی منزل کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ دبستانوں کا روایتی تصور ختم ہوتا جا رہا ہے اور ادبی دستاویزات کو Reliability اور Validity کے عدسوں سے دیکھنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ جن دبستانوں سے منسلک ادیب زیادہ Reliable اور valid تحریریں دیں گے وہ دبستان بھی زندہ رہیں گے اور وہ ادیب بھی جوان دبستانوں سے وابستہ ہیں۔ اس صورت حال میں ہمیں Reliable اور Valid ادبی دستاویزات تخلیق کرنے کے لیے Interdisciplinary Constructs پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دوسری جانب ہمیں اپنے موضوعات تلاش کرنے ہوں گے جنہیں ہر عہد میں تمام معاشروں میں قبولیت عام کی سند حاصل ہو اور Reliability اور Validity اونچے درجے پر محسوس کی جا سکتی ہو۔

مجھے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی نئی کتاب مضافاتی شعروادب سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے اور اب ان کی نئی کتاب شعروادب کے سفیر نئے موضوعات کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ادب برائے ادب یا ادب برائے ادیب کے بجائے ادب برائے زندگی بلکہ عالمی ادب برائے زندگی کی جانب ہماری توجہ مبذول کروا رہی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ کی تحریریں عمومی طور پر ان موضوعات پر ہوتی ہیں جنہیں مختلف خطوں کے مختلف معاشروں میں بیک وقت پڑھا، سمجھا اور سوچا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب قطرے کے پرزم (Prism) سے سمندر کے حدود کا تعین کرنا جانتے ہیں اور اسی طرح سمندر سے قطرہ لے کر اسے بحر ذخار بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ آفاقی سوچ رکھتے ہیں اور ان کا موقف بھی یہی ہے کہ ادبی دستاویز کو آفاقی قدروں کی حامل ہونا چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ پاکستانی ادب کو عالمی تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی Effort کی ہے۔ پاکستان سے باہر تخلیق ہونے والا ادب وہاں کی تہذیب وثقافت کا یقیناً اظہار یہ ہوگا لیکن اس ادب میں وطن اور زبان کی خوشبو یکساں ہونے کا احتمال ہے۔

پاکستان کے باہر کے تخلیق کار کیا سوچتے ہیں اور اب انہیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ یہ دونوں سوالات اس کتاب میں یکجا کردیے گئے ہیں۔ جسمانی رابطوں کے ساتھ ساتھ فکری روابط بھی بڑے خاصے کی چیز ہے اور اس لحاظ سے ڈاکٹر شبیہ صاحب کی یہ علمی، ادبی اور تہذیبی کتاب ایک آفاقی فکر کو جنم دینے کا باعث بنے گی۔ میرے نزدیک یہ کام بے حد ضروری تھا اور ڈاکٹر شبیہ صاحب کے ذہن رسا نے اس کام کا بیڑا اٹھا کر ہمارے عہد کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کردیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب مشرق و مغرب کے تخلیق کاروں کے درمیان ایک مثبت وسیلے کا کردار ادا کرے گی۔

آصفہ نشاط (کیلی فورنیا۔ امریکہ)

سب سے پہلے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ آپ نے ادبی بستیوں جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نہ تو یہاں وقت ہے، نہ رسائل نہ وسائل نہ ادبی تنظیمیں اور نہ ماحول۔ غرضیکہ منظم کچھ بھی نہیں۔ اپنے طور پر لکھا یا پڑھا جا رہا ہے۔ ستائش کی بھی صورت نہیں اور نہ ہی ادب کو روزگار کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے۔ اُردو کتابوں کی شپنگ بھی ایک مسئلہ ہے اور پبلشنگ بھی۔ اس صورتِ حال میں جو لوگ شعر و ادب کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں اُن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

◆◆◆

اردو کے معروف نقاد، محقق، شاعر، کالم نگار اور دانشور

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

کی شخصیت اور فن کے حوالے سے

معروف ناقدین، محققین اور دانشوروں کے مقالات سے مزیّن

شبیہ شناسی

تکمیل کے آخری مراحل میں ہے

maablib.org

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعروادب کے سفیر

(تحقیق وتنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اردو شعر و ادب کے سفیر

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ شبیہ الحسن کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کیا ہیں تو میں یہ فارمولا بناؤں گا:

سعیِ مسلسل + محنتِ شاق = ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

یہی بات قرین قیاس ہے کہ شبیہ الحسن کی جستجو ہمہ وقت ادب و فکر کے بارے میں نت نئے پہلو اجاگر کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالات ہوں، تنقیدی مضامین ہوں یا چٹکیلے اسلوب میں تحریر کردہ کالم، ان سب میں مشترک عنصر یہ ہے کہ شبیہ الحسن تحقیق طرازی کرتے ہوئے نئے نکات کی کھوج میں رہتے ہیں اور پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک خوبصورت کڑی ہے۔

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

"اردو شعر و ادب کے سفیر" ان تخلیق کاروں کے فن اور شخصیت سے متعارف کراتی ہے جو اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں اردو کی بستیاں آباد کیے ہوئے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ، امریکہ، یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں رہائش پذیر یہ لوگ تخلیقی طور پر وہ پاکستان ہی میں زیست کرتے ہیں۔ میرے خیال میں شبیہ الحسن صاحب کا یہ کارنامہ بے حد اہم ہے کہ انہوں نے ایک سو سے زیادہ ملکی اور بین الاقوامی دانشوروں سے غیر ممالک میں مقیم اردو اہل قلم کی مساعی جمیلہ کے بارے میں فکر انگیز آراء جمع کی ہیں۔ اپنے موضوع اور ترتیب و تشکیل کے لحاظ سے یہ کتاب ایک ایسی تحقیقی دستاویز ہے جس پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

آخری روز ۲۰۱۰ء

۵۲۹ جہانزیب بلاک

گلی نمبر ۷، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور پاکستان